

سلسلہ صلاح و فلاح 3

# دین کے تین بنیادی اصول اور ان کی شرح



تالیف

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہب رحمہ اللہ

مترجم

عبد القوی لقمان کیانی

خطیب جامع مسجد پاکستان ایجوکیشن اکیڈمی - دہلی

شارح

محلہ صالح العثیمین

فضیلۃ الشیخ

550 بلاک 5 - سیکٹر 1-D ٹاؤن شپ - لاہور

برائے رابطہ: 042-5116118 0322-4468539

ناشر مرکز ”الکتاب“

## فہرست مضامین

- ۱۱ ..... کلمہ مترجم
- ۱۳ ..... شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی مختصر سوانح حیات
- ۱۷ ..... شارح کتاب شیخ صالح العثیمین رحمہ اللہ کی سوانح عمری (ایک جھلک)
- ۲۱ ..... بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تشریح
- ۲۳ ..... علم اور (کسی چیز کی کنہہ کو) پانے کے مراتب
- ۲۵ ..... 'رحمت اور مغفرت' کے درمیان فرق

### چار مسائل

- ۲۶ ..... پہلا مسئلہ: 'علم' اور اس سے مراد، بندے کا اپنے رب، اپنے نبی اور دین کی معرفت حاصل کرنا ہے۔
- ۳۱ ..... دوسرا مسئلہ: 'علم' کے مطابق عمل کرنا ہے۔
- ۳۱ ..... تیسرا مسئلہ: علم و عمل کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے۔
- ۳۲ ..... چوتھا مسئلہ: دوران 'دعوت' آنے والی مشکلات و مصائب پر صبر کرنا ہے۔
- ۳۷ ..... صبر کی قسمیں
- ۳۷ ..... سورۃ العصر کی تفسیر
- ۴۰ ..... امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول (لَوْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ الْخ) کا مطلب ..... وہ تین مسائل جن کو جاننا ہر مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے
- ۴۲ ..... پہلا مسئلہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے ہم کو پیدا کیا
- ۴۶ ..... اور اُس نے ہم کو بے کار (اور شتر بے مہار) چھوڑ نہیں دیا
- ۴۷ ..... بلکہ اس نے ہماری طرف (ہدایت کے لئے) اپنا پیغمبر بھیجا

□ دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ اس بات سے قطعاً راضی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کسی کو بھی اُس کی

عبادت میں شریک کیا جائے..... ۵۱

□ تیسرا مسئلہ: جس شخص نے اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کی، اور اللہ تعالیٰ کو یکتا تسلیم کر لیا تو

اس لئے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے دشمنوں (کفار) وغیرہ سے دوستی کرنا قطعاً جائز نہیں .. ۵۴

○ 'حنیف' ہونے کا مطلب ..... ۵۷

○ سب سے بڑی چیز، جسے اپنانے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا، وہ 'توحید' ہے..... ۶۲

○ سب سے بڑی چیز، جسے اپنانے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا، وہ 'شرک' ہے..... ۶۶

وہ تین اصول جن کی پہچان ہر انسان پر فرض ہے

□ پہلی اصل: 'بندے کو اپنے رب کی پہچان'..... ۶۹

○ 'رب' کا مطلب اور اس کی دلیل ..... ۷۵

○ 'رب' ہی حقیقی معبود ہے، اس کی دلیل اور وضاحت ..... ۷۶

○ اختصار کے ساتھ عبادت کی قسمیں: ..... ۸۸

□ پہلی قسم: دُعاء اور اس کی اقسام ..... ۹۲

□ دوسری قسم: 'خوف' اور وہ تین اقسام پر مشتمل ہے۔..... ۹۵

□ تیسری قسم: رجاء (امید) ..... ۹۷

□ چوتھی قسم: 'توکل' اور یہ چار اقسام پر مشتمل ہے ..... ۹۸

□ پانچویں قسم: 'رغبت' ..... ۱۰۱

□ چھٹی قسم: 'رہبت' (ڈر) ..... ۱۰۱

□ ساتویں قسم: 'خشوع' ..... ۱۰۱

□ آٹھویں قسم: 'نخشت' اور اس کی پانچ قسمیں: ..... ۱۰۲

□ نویں قسم: 'انابت' (توجہ) ..... ۱۰۳

- ۱۰۴ ..... □ دسویں قسم: 'استعانت' (مدد طلب کرنا) اور اس کی تین قسمیں:
- ۱۰۷ ..... □ گیارہویں قسم: 'استعاذہ' (پناہ طلب کرنا) اور اس کی چار قسمیں
- ۱۱۱ ..... □ بارہویں قسم: 'استغاثہ' (مدد طلب کرنا) اور اس کی چار قسمیں
- ۱۱۴ ..... □ تیرہویں قسم: 'ذبح' (قربانی وغیرہ) اور اس کی تین قسمیں
- ۱۱۶ ..... □ چودھویں قسم: 'نذر'
- ۱۱۹ ..... □ دوسری اصل: "بندے کو اپنے دین کی پہچان"
- ۱۲۱ ..... ◎ 'اسلام' کی تعریف
- ۱۲۱ ..... ◎ 'دین' کے مراتب
- ۱۲۱ ..... □ پہلا مرتبہ: 'اسلام'
- ۱۲۲ ..... ◎ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی گواہی کا مطلب
- ۱۲۹ ..... ◎ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کی گواہی کا مطلب
- ۱۳۳ ..... ◎ نماز و زکوٰۃ کی دلیل اور توحید کی وضاحت
- ۱۳۵ ..... ◎ روزے اور حج کی دلیل
- ۱۳۷ ..... □ دوسرا مرتبہ: 'ایمان'
- ۱۳۷ ..... ◎ 'ایمان' کو ستر سے کچھ اوپر شاخوں میں اکٹھا کرنے کا فائدہ اور اس (ایمان) کے چھ ارکان
- ۱۳۹ ..... □ پہلا رکن: 'اللہ تعالیٰ پر ایمان' اور یہ چار امور کو شامل ہے
- ۱۳۹ ..... پہلا: اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانا
- ۱۴۴ ..... دوسرا: اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان لانا
- ۱۴۷ ..... تیسرا: اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر ایمان لانا
- ۱۵۱ ..... چوتھا: اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات پر ایمان لانا
- ۱۵۵ ..... اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے شرائط
- ۱۵۶ ..... □ دوسرا رکن: فرشتوں پر ایمان، اور یہ چار امور کو شامل ہے:



- پہلا: فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا۔ ..... ۱۵۶
- دوسرا: اُن کے معلوم شدہ ناموں پر ایمان لانا ..... ۱۵۶
- تیسرا: اُن کی معلوم شدہ صفات پر ایمان لانا ..... ۱۵۶
- چوتھا: اُن کی معلوم شدہ ذمہ داریوں اور کاموں پر ایمان لانا ..... ۱۵۷
- فرشتوں پر ایمان کے ثمرات ..... ۱۵۸
- فرشتوں کے جسمانی ہونے کا انکار کرنے والوں کی تردید ..... ۱۵۹
- ﴿ تیسرا رُکن: آسمانی کتابوں پر ایمان اور یہ بھی چار اُمور کو شامل ہے: ..... ۱۶۱
- پہلا: ان کے مخائب اللہ ہونے پر ایمان لانا ..... ۱۶۱
- دوسرا: اُن کے معلوم شدہ ناموں پر ایمان لانا ..... ۱۶۱
- تیسرا: اُن کی صحیح ثابت شدہ خبروں کو سچ ماننا ..... ۱۶۱
- چوتھا: اُن کے غیر منسوخ احکام پر عمل پیرا ہونا ..... ۱۶۱
- آسمانی کتابوں پر ایمان کے ثمرات ..... ۱۶۲
- ﴿ چوتھا رُکن: رسولوں پر ایمان اور یہ بھی چار اُمور کو شامل ہے: ..... ۱۶۲
- رسول سے مراد ..... ۱۶۲
- پہلا: اُن کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے برحق رسول ہونے پر ایمان لانا۔ ..... ۱۶۶
- دوسرا: اُن کے معلوم شدہ اسمائے گرامی پر ایمان لانا۔ ..... ۱۶۷
- تیسرا: اُن کی صحیح ثابت شدہ خبروں کو سچ ماننا ..... ۱۶۸
- چوتھا: ہماری طرف بھیجے گئے رسول کی شریعت ظاہرہ پر عمل کرنا۔ ..... ۱۶۸
- رسولوں پر ایمان کے ثمرات ..... ۱۶۸
- ﴿ پانچواں رُکن: آخرت کے دن پر ایمان اور یہ تین اُمور کو شامل ہے: ..... ۱۷۰
- پہلا: دوبارہ اٹھنے پر ایمان لانا اور اس کی دلیل ..... ۱۷۰
- دوسرا: حساب و جزاء (بدلہ) پر ایمان لانا اور اس کی دلیل ..... ۱۷۱

- تیسرا: جنت اور دوزخ پر ایمان لانا ..... ۱۷۴
- آخرت کے دن پر ایمان کے ثمرات ..... ۱۷۸
- دوبارہ اٹھنے کا انکار کرنے والوں کی شرعی، حسی اور عقلی اعتبار سے تردید ..... ۱۷۹
- چھٹا: کن: اچھی اور بُری 'تقدیر' پر ایمان اور یہ بھی چار امور کو شامل ہے: ..... ۱۸۹
- پہلا: 'علم' (کامل علم) ..... ۱۸۹
- دوسرا: 'کتابت' (لکھنا) ..... ۱۸۹
- تیسرا: 'مشیت' (مرضی) ..... ۱۹۰
- چوتھا: خلق (پیدائش) ..... ۱۹۱
- کیا بندے کو اپنے اختیاری کاموں میں، مرضی اور قدرت حاصل ہے؟ ..... ۱۹۱
- سات اعتبارات سے اُن لوگوں کی تردید، جو فرائض کو چھوڑ دینے اور گناہ کے کام کرنے پر 'تقدیر' کا سہارا لیتے ہیں ..... ۱۹۳
- 'تقدیر' پر ایمان کے ثمرات ..... ۱۹۷
- 'تقدیر' کے بارے میں دو گروہوں کی گمراہی اور اُن کا رد ..... ۱۹۹
- تیسرا مرتبہ: 'احسان اور اس کی تعریف' ..... ۲۰۱
- اللہ تعالیٰ کی عبادت میں 'احسان' سے مراد اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر احسان سے مراد .. ۲۰۲
- ◎ عبادت، اللہ تعالیٰ سے انتہاء درجے کی محبت اور اُس کے حضور انتہاء درجے کی عاجزی پر مشتمل ہے ..... ۲۰۶
- ◎ ایک نہایت نفیس فائدہ: 'کہ عبادت کا اظہار کب افضل ہوتا ہے؟' ..... ۲۰۷
- ◎ تیسری اصل: 'بندے کو اپنے نبی ﷺ کی پہچان' ..... ۲۱۱
- ◎ نبی مکرم ﷺ کی حیات طیبہ ..... ۲۱۲
- ◎ معراج نبوی ..... ۲۱۲
- ◎ نبی مکرم ﷺ کی ہجرت ..... ۲۱۲

- ۲۲۵ ..... ﴿ ہجرت کی تعریف، اس کا حکم اور دلیل ﴾
- ۲۲۹ ..... ﴿ کافروں کے ممالک کی طرف سفر کرنے اور ان میں ٹھہرنے کا حکم (مکمل بحث) ﴾
- ۲۳۸ ..... ﴿ نبی مکرم ﷺ کی وفات، حسرت آیات ﴾
- ۲۳۸ ..... ﴿ یوم بعث (دوبارہ اٹھنے پر) ایمان اور اس کی دلیل ﴾
- ۲۵۰ ..... ﴿ حساب و کتاب پر ایمان اور اس کی دلیل ﴾
- ۲۵۲ ..... ﴿ یوم بعث (قبروں سے زندہ اٹھنے) کی تکذیب کا حکم ﴾
- ۲۵۹ ..... ﴿ رسولوں (ﷺ) کو بھیجنے کی حکمت ﴾
- ۲۶۱ ..... ﴿ سب سے پہلا اور سب سے آخری رسول ﴾
- ۲۶۲ ..... ﴿ تمام رسولوں (ﷺ) کا اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دینا اور شرک سے روکنا ﴾
- ۲۶۷ ..... ﴿ طاغوت کا (کفر) انکار ﴾
- ۲۶۴ ..... ﴿ طاغوت کی سب سے عمدہ تعریف ﴾
- ۲۶۶ ..... ﴿ لوگوں کے اپنے حکام کے ساتھ (مختلف) احوال ﴾
- ۲۶۷ ..... ﴿ چند بڑے (اور چوٹی کے) طاغوت ﴾
- ۲۶۸ ..... ﴿ پہلا: ابلیس (شیطان لعین) ﴾
- ۲۶۸ ..... ﴿ دوسرا: جس کی پوجا کی جائے اور وہ اس پر راضی بھی ہو ﴾
- ۲۶۸ ..... ﴿ تیسرا: جو لوگوں کو اپنی پوجا پاٹ کی طرف بلائے ﴾
- ۲۶۹ ..... ﴿ چوتھا: جو غیبی امور میں سے کسی بھی چیز کو جاننے کا دعویٰ کرے ﴾
- ۲۷۰ ..... ﴿ پانچواں: جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم سے ہٹ کر فیصلہ کرے ﴾

#### ﴿ خاتمہ ﴾

- ہر قسم کے علم کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کی طرف پھیرنے اور اُس کے نبی برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر درود و سلام کے بارے میں ہے ..... ۲۸۲
- حوالہ جات ..... ۲۸۳

## کلمہ مترجم

الحمد لله وحده والصلاة والسلام على من لا نبی بعده أما بعد:

زیر نظر کتاب 'تین بنیادی اصول اور ان کی شرح' کا اردو ترجمہ ہدیہ قارئین ہے۔

کتاب ہذا کی اہمیت و افادیت اپنے موضوع سے واضح ہے۔ بنیادی طور پر اس کتاب کی 'شرح' دینی مدارس میں زیر تعلیم تشنگان علم دین کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی، مگر اب اردو ترجمے کے ساتھ یہ کتاب اپنے علمی وقار اور منطقی وجاہت کو برقرار رکھتے ہوئے طلباء اور عامۃ الناس سب کے لیے یکساں مفید ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ عقیدے کی اصلاح اور درستگی کے بغیر کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہ ہی قابل قبول ہے اور نہ ہی باعث اجر و ثواب، خواہ وہ عمل ظاہری طور پر کتنا خوشنما کیوں نہ ہو، اور پھر درست اعمال کے بغیر کسی بھی انسان کی اخروی نجات ممکن نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس نے مجھے اس کتاب کے ترجمے پر انگیزت دلائی۔

'کتاب ہذا' کے مصنف اور شارح رحمہما اللہ! دونوں ہی کا انداز تحریر علمی و منطقی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مبتدی طالب علم اور عام آدمی کے مبلغ علم اور ذہنی سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے دقیق عبارات و الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے توسین ( ) میں مزید وضاحت بھی کر دی ہے، اگرچہ یہ انداز ترجمہ نگاری کے اصول کے شاید منافی ہو اور صاحب فن آدمی کی نگاہ میں ایک عیب بھی، مگر اس جیسے محتاط موضوع کی کتاب کے ترجمے کے لیے یہ اسلوب ضروری بھی ہے اور مفید بھی، لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ صرف کتاب کا ترجمہ ہی نہیں بلکہ ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کی توضیح بھی ہے۔

اس کتاب کی تدریس کا شرف مجھے شارحہ میں قائم ایک دینی مرکز عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ میں

ہوا، اس وقت مجھے طلباء کی آسانی کے لیے اس کے سلسلہ وار اسباق کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی، جسے بعد ازاں میں مدیر مرکز شیخ احمد کی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے پر ایک مستقل ترجمے کی شکل دینے پر (بتوفیق اللہ) تیار ہوا، دین کے سلسلے میں یہ معمولی کاوش قارئین کرام کے پیش خدمت ہے، ہر طرح کا کمال اور ہر قسم کی تعریف و ستائش اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جب کہ علمی کمی، نقص اور کوتاہی ضعیف البیان انسان کی جانب سے ہے۔ برادران اسلام سے اور خاص طور پر اہل علم و فضل سے استدعا ہے کہ وہ جہاں میرے علم و عمل میں برکت کے لیے دعا کریں وہاں کتاب کے مطالعہ کے دوران ترجمے یا وضاحت کے ضمن میں کسی لغزش یا بھولی چوک پر مطلع ہوتے ہی اس کی نشاندہی کر کے عند اللہ تعالیٰ ماجرہ ہوں۔

إِن أُرِيدُ إِلَّا اللَّهَ صَالِحٌ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

المعبود المفتقر إلى الله العزيز المقتدر

عبد القوی القمان کیلانی

## شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کی مختصر سوانح حیات

### ۱ نام و نسب

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان بن علی بن محمد بن احمد بن راشد بن برید بن محمد بن مشرف بن عمر، جو کہ بنو تمیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

### ۲ جائے پیدائش

یہ نابغہ عصر، عالم اجل اور فاضل اکمل، ۱۱۱۵ھ کو، العینۃ بستی کے ایک نہایت علمی، دیندار اور شریف گھرانے میں پیدا ہوئے آپ کے باپ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور آپ کے دادا بھی اپنے دور میں نجد کے کبار علماء کرام میں سے تھے۔

### ۳ سوانح حیات کے بعض گوشے

آپ نے دس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے قرآن حکیم حفظ کر لیا تھا، بعد ازاں 'فقہ' پڑھی، جس میں خاصا رسوخ حاصل کر لیا، آپ کی قوت حافظہ پر آپ کے والد محترم بھی انگشت بندناں تھے، بہت زیادہ مطالعہ اور مذاکرہ آپ کا دن، رات مشغلہ تھا، خاص طور پر حدیث و تفسیر کی کتب کثرت سے زیر مطالعہ رکھتے تھے۔ علمی و فنی کتابوں کے اصل متون حفظ کر لینا آپ کا طرہ امتیاز تھا، آپ نے طلب علم کے لئے، نجد اور مکہ مکرمہ کے قرب و جوار کے علاقوں میں سفر کئے، اور وہاں کے علمائے دین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر مدینہ منورہ کا رخ کیا اور وہاں کے اہل علم حضرات سے علمی استفادہ کیا، جن میں سرفہرست علامہ الشیخ عبد اللہ بن ابراہیم اشعری ہیں، جیسا کہ آپ نے موصوف شیخ کے فرضی اور معروف بیٹے اور مشہور کتاب (العذب الفاضل فی شرح ألفیة الفرائض) کے مؤلف الشیخ ابراہیم اشعری سے بھی علمی اکتساب کیا، ان دونوں علمی شخصیات نے آپ کو وقت کے مشہور محدث محمد حیات

سندھی رحمہ اللہ کا تعارف کرایا، تو آپ رحمہ اللہ نے محدث موصوف رحمہ اللہ سے علم حدیث اور اسماء الرجال میں علمی مہارت حاصل کی، تو آپ کے استاد محترم نے آپ کو حدیث کی بڑی اور معتبر کتابوں کو پڑھانے کی اجازت دے دی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی فہم و فراست اور ذہانت و فطانت سے نوازا تھا، آپ ہمہ وقت دینی اور علمی کتابوں کی تحقیق و تالیف میں مصروف رہتے، اور دوران مطالعہ و تحقیق، جب کوئی دقیق علمی نکتہ سامنے آتا، فوراً اسے ازبر کر لیتے، اور کتابوں کی تدریس و تالیف سے آپ بھی نہیں اکتائے، اس طرح آپ نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن القیم رحمہ اللہ کی بہت سی کتابوں کو نئے سرے سے رقم کیا، آپ کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے انتہائی قیمتی نسخے بہت سی تعداد میں آثار قدیمہ کے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

۱۱۵۳ھ کو جب آپ کے والد ماجد نے داعی اجل کو لبیک کہا تو آپ رحمہ اللہ نے سلف صالحین رحمہم اللہ کے طریق پر اللہ کی مخلوق کو اللہ کی توحید کی طرف دعوت کا، برائی کے خوگر لوگوں کو شر سے روکنے کا اور بدعتی اور بت پرست مشرکین سے نبرد آزما ہونے کا بھرپور انداز سے اور اعلانیہ طور پر بیڑا اٹھایا، اور آپ رحمہم اللہ کی روشن کردہ شمع توحید نے سرزمین حجاز سے باہر کی دنیا کو بھی اس وقت اپنی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا شروع کر دیا جب آل سعود کی حکومت کے نیک سرشت اور توحید پرست والیوں اور حکمرانوں نے، دعوت توحید کے میدان میں شیخ الاسلام رحمہم اللہ کا ہاتھ مضبوط کیا، اور یہی وجہ ہے کہ شیخ رحمہم اللہ کی اس پُر آشوب دور میں دعوت توحید کی برکات و ثمرات سے آج بھی مسلمانان عالم مستفید ہو رہے ہیں اور تاقیام قیامت ان شاء اللہ تعالیٰ ہوتے رہیں گے۔ (جَزَاهُ اللَّهُ شَعْلَىٰ حَبِيرَ الْجَزَاءِ)

## ❶ تالیفات

شیخ الاسلام حضرت محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی تالیف کردہ بڑی مفید کتابیں اور رسائل ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا تذکرہ ہم یہاں کرتے ہیں:

- ① کتاب التوحید
- ② کتاب (کشف الشبهات)
- ③ کتاب (الکبائر)
- ④ کتاب (ثلاثة الأصول)
- ⑤ کتاب (مختصر الإنصاف والشرح الكبير)
- ⑥ کتاب (مختصر زاد المعاد)
- ⑦ علاوہ ازیں آپ کے جاری کردہ فتوے اور رسائل بھی ہیں، جو جلعہ الامام محمد بن سعود الریاض، کے زیرِ نگرانی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر 'مجموعۃ مولفات محمد بن عبدالوہاب' کے نام سے کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔

## ۵ رحلت

آپ ﷺ ۱۲۰۶ھ کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں ہوں آپ پر اور اللہ تعالیٰ آپ کو، اسلام اور اہل اسلام کی خدمت کے بدلے میں بہتر اجر و ثواب سے نوازے، بے شک وہ دعاؤں کو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے اور تمام تر تعریفات سارے جہانوں کے پروردگار کو سزاوار ہیں۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

از قلم

الفقیہ الی اللہ

فہد بن ناصر بن ابراہیم سلیمان



## اہل اسلام کے لیے عظیم خوشخبری

’مرکز الکتاب کا قیام‘ سیکولرزم، کمیونزم اور الحاد کی آندھیوں اور بدعات و خرافات کی تاریکیوں میں شمع رشد و ہدایت، علم و عرفان کی شمع اور قرآن و سنت کا حسین امتزاج۔  
اغراض و مقاصد

- ① اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول
- ② پیغام رسالت ﷺ سے ’امت مسلمہ‘ کو روشناس کرانا
- ③ قرآن و سنت کی تعلیمات عصری تقاضوں کے مطابق جدید وسائل کو استعمال میں لا کر پھیلانا۔

● مرکز کے تحت جاری پروگرامز کی آبیاری کے لیے ہر طبقہ اور فکر کے لوگوں کو انگلیخت دلانا، تاکہ عصری اور دینی علوم و فنون کے امتزاج سے ایک مثالی اور با کردار معاشرہ وجود میں آ سکے۔ مثلاً دینی علما و سکالرز، ڈاکٹرز، پروفیسرز، صحافی، قانون دان، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے سٹوڈنٹس، سیاست دان، بیوروکریٹس، کاروباری حضرات و جملہ سرکاری آفیسرز شامل ہیں۔

● علمانی و الحادی، منتشر باطل نظریات کا قطع قع کرنا، اور دین و دنیا میں پیدا شدہ وسیع خلیج کو پات کر مومن کی پوری زندگی کو عبادت و باعث اجر بنانا کہ

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

① غریبوں، محتاجوں، بیواؤں، بیماروں، یتیموں، معذروں اور دیگر نادار اور بے سہارا بچوں، بچیوں، طلباء و طالبات کے لیے امدادی ’ولیفیر ٹرسٹ‘ قائم کرنا کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا بَالُ الْمَرْءِ أَنْ يُلْفِئَ نَفْسَهُ فِي الْأَرْضِ﴾

## شارح کتاب محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ

سوانح عمری..... ایک جھلک

### نام و نسب

آپ کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن صالح بن محمد بن العثیمین الوہیبی التمیمی رحمہ اللہ ہے۔

### جائے پیدائش

آپ ۱۳۳۷ھ اور رمضان المبارک کی ستائیسویں تاریخ کو عنیزہ شہر میں پیدا ہوئے۔

### حالات زندگی

آپ نے قرآن حکیم کی تعلیم اپنے نانا بزرگ، عبدالرحمن بن سلیمان آل دافع رحمہ اللہ سے حاصل کی اور کتاب اللہ کو حفظ کر لیا۔ پھر آپ رحمہ اللہ! حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے، اور خوشنویسی، حساب اور بعض دیگر فنون آداب میں دسترس حاصل کی۔

معروف عالم دین الشیخ عبدالرحمن السعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاں زیر تعلیم چھوٹی عمر کے طلباء کی تعلیم و تربیت کے لئے دو طالب علموں کو اپنے پاس بٹھرا لیا، جن میں ایک الشیخ علی الصالحی رحمہ اللہ اور دوسرے الشیخ محمد بن عبدالعزیز المطوع رحمہ اللہ تھے۔

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ نے مؤخر الذکر استاذ سے، اپنے بڑے استاذ الشیخ عبدالرحمن السعدی رحمہ اللہ کی تالیف کردہ دو کتابیں مختصر العقیدۃ الواسطیۃ اور منهاج السالکین فی الفقہ اور اسی طرح کتاب الأجرومیۃ والألفیۃ یکے دیگرے پڑھیں۔ نیز آپ رحمہ اللہ نے الشیخ عبدالرحمن بن علی بن عودان سے علم فرائض وفقہ پڑھی۔

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ! نے اکتساب علم کے لئے اپنے پہلے اور بڑے استاذ محترم الشیخ عبدالرحمن بن ناصر السعدی کا دامن تھامے رکھا اور زیادہ تر شرعی علوم و فنون مثلاً توحید، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم فرائض (وراثت کا علم) مصطلح الحدیث اور نحو و صرف

میں رسوخ حاصل کر لیا۔

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے استاذ محترم الشیخ عبدالرحمن السعدی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک بڑا مقام تھا، یہی وجہ تھی کہ جب شیخ محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم اپنے خاندان سمیت ریاض شہر میں منتقل ہوئے تو اپنے فرزند ارجمند کی اوائل عمری کی بناء پر یہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ ہی چلا آئے، اس پر الشیخ عبدالرحمن السعدی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم کی خدمت میں یہ لکھا، یہ ناممکن ہے ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کا فرزند محمد، علمی استفادے کے لئے یہاں ہمارے پاس ٹھہرا رہے۔

شیخ محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ خود فرمایا کرتے تھے کہ

”میں اپنے جلیل القدر استاذ کے طریقہ تدریس، علمی انداز بیان اور ان کی وضاحت کے لئے، مختلف مثالوں اور معانی و مطالب کے ذریعے طلبہ کو اپنے ذہنی معیار کے قریب تر کر لینے کی صلاحیت پر بہت متاثر تھا اور دوسری صفت، جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کی اعلیٰ اور پاکیزہ اخلاقی اقدار تھیں، شیخ عبدالرحمن السعدی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً بڑے بلند کردار و گفتار کے مالک تھے، اور پھر علم کی وسعت اور عبادت کی کثرت نے ان کی وجاہت اور شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ آپ رحمہ اللہ چھوٹے بچوں سے مزاح اور بڑوں سے مؤدبانہ دل گلی بھی کر لیا کرتے تھے، اور میں نے آپ کی شخصیت کو، حسن کردار میں فائق لوگوں میں پایا ہے۔“

شیخ محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ نے، فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی علمی استفادہ کیا، جو آپ رحمہ اللہ کے دوسرے بڑے استاد مانے جاتے ہیں، آپ نے اپنے اس عظیم المرتبت استاذ سے ’صحیح بخاری‘، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رسائل اور بعض فقہ کی کتابیں پڑھیں۔

شیخ محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”کہ میں اپنے استاذ مکرم الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے ایک تو ان کے ’علم حدیث شریف‘ کے بارے میں انتہا درجے کے اہتمام و انصرام کی بنا پر اور دوسرے ان کے اخلاق و کردار کی بلندی اور پھر تمام قسم کے لوگوں کے لئے

وسعت ظرفی جیسی صفات کی وجہ سے از حد متاثر ہوا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ)

شیخ محمد بن صالح رحمہ اللہ ۱۳۷۱ھ کو پہلی بار مستقل طور پر (جامع مسجد میں) مسند تدریس پر متمکن ہوئے، پھر جب ریاض شہر میں جامعہ علمی ادارے کھل گئے تو ۱۳۷۲ھ کو آپؒ ان علمی آماجگاہوں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔

شیخ موصوف رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں:

”کہ میں نے علمی دانش گاہ میں، علمی رسوخ کے لئے دوسرے سال میں داخلہ لیا، اور یہ قدم میں نے استاد محترم شیخ علی الصالحی سے مشورے کے بعد اٹھایا، اور بعد ازاں اس سلسلے میں، الشیخ عبدالرحمن السعدی رحمہ اللہ سے بھی اجازت لے لی، اس وقت اس علمی ادارے میں دو مختلف شعبے تھے، ایک عام اور دوسرا خاص۔ میں دوسرے خاص شعبے میں زیر تعلیم تھا، اور اس دور میں یہ سہولت میسر تھی کہ اگر کوئی طالب علم چاہتا تو (اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر) اپنا عرصہ تعلیم کم کر سکتا تھا، مطلب یہ کہ وہ آئندہ سال کے امتحان کی تیاری چھٹیوں میں (یا دیگر فرصت کے درمیانی اوقات میں) کر کے، دوسرے سال کی پہلی سہ ماہی کا اگر امتحان پاس کر لیتا تو اسے اس کے بعد کے تعلیمی سال میں بیٹھنے کی اجازت ہوتی اور اس طرح سے اس کی مدت تعلیم کم سے کم ہو سکتی تھی۔

دو سال بعد ہی شیخ موصوف رحمہ اللہ فارغ التحصیل ہو گئے اور عنیزۃ بستی کے ایک علمی ادارے میں بطور مدرس متعین ہوئے، وہاں شریعت کالج میں تدریسی خدمات سر انجام دینے کے ساتھ ساتھ آپ رحمہ اللہ نے علمی استفادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور مزید علمی وسعت اور پختگی کے لئے اپنے مشفق اور مربی استاذ شیخ عبدالرحمن السعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شاگردی اختیار کئے رکھی۔“

پھر جب شیخ عبدالرحمن السعدی رحمہ اللہ اس دنیا کو داغ مفارقت دے گئے، تو شیخ محمد بن الصالحؒ نے بیک وقت عنیزہ کی مقامی لائبریری اور وہاں کی بڑی جامع مسجد میں امامت و خطابت کی ذمہ داری سنبھال لی، اور المعهد العلمی (علمی دانش گاہ) میں تدریس اس کے علاوہ کام تھا، اور پھر اس وقت سے لے کر اپنی حیات مبارکہ کے آخری لمحات تک ایک تو

شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے 'تقسیم' شہر میں قائم 'جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کی ذیلی شاخ میں کلیۃ الشریعہ اور کلیۃ اصول الدین میں ایک ساتھ پڑھایا اور دوسرے سعودی عرب کے نامور اور کبار علمائے کرام پر مشتمل مجلس (کمیٹی) کے مستقل رکن رہے۔ نیز علم و عمل کے اس درخشاں ستارے کی اللہ عزوجل کی طرف دعوت کے میدان میں اور اس مقصد کے لئے ہر جگہ داعیان حق کی تعیین و راہنمائی وغیرہ میں بہت بڑا کردار اور بڑی قربانیاں ہیں۔

جَزَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰی غَنًا وَعَنْ جَمِيعِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَاءِ

شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ شیخ محمد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی خدمت میں عہدہ قضاء پیش کیا، بلکہ اس پر اصرار جاری رکھتے ہوئے شیخ محمد بن ابراہیم نے شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کی إحساء کی شرعی عدالت کے چیف جسٹس کی حیثیت سے نامزدگی کا باقاعدہ آرڈر (حکم نامہ) بھی جاری کر دیا، جس پر شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے معذرت پیش کر دی اور اس کے بعد شیخ محمد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ملاقاتوں اور ذاتی رابطوں کے نتیجے میں اس عہدہ قضاء کی عدم قبولیت کے بارے میں شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کی معذرت قبول کر لی گئی۔

## تالیفات

شیخ محمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کی علمی میدان میں محنتوں اور کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ان کی تالیف کردہ کتابیں اور رسائل ہیں جن کی مجموعی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے اور یہ آپ کی ساری علمی کاوش عنقریب آپ کے نام پر 'فتاویٰ و رسائل کے مجموعے' میں، جمع کر کے ایک ساتھ شائع کی جائے گی۔ ..... إن شاء اللہ تعالیٰ

## إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامَ

بِسْمِ ① اللَّهِ ② الرَّحْمَنِ ③ الرَّحِيمِ  
 ”اللہ کے نام کے ساتھ میں (اس کتاب کی قراءت، یا تدریس یا تصنیف کی)  
 ابتداء کرتا ہوں، جو بہت زیادہ مہربان، نہایت رحم والا ہے۔“

□ ① بِسْمِ: مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کی ابتداء اللہ عزوجل کی کتاب قرآن حکیم کی پیروی کرتے ہوئے بسملة (بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ) کے ساتھ کی ہے، اس لئے کہ کتاب اللہ کا آغاز بھی اسی بسملة کے ساتھ ہوا ہے، نیز اس حدیث کی اتباع کرتے ہوئے ”ہر اہم اور مہتم بالشان کام، جس کی ابتداء بِسْمِ اللہ کے ساتھ نہ کی جائے تو وہ دم کٹا، نامراد (اور برکت سے خالی) ہوتا ہے۔“<sup>(۱)</sup> اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں بھی، اس لئے کہ آپؐ اپنے رسائل و پیغامات کی ابتداء اسی بسملة سے فرمایا کرتے تھے۔

بِسْمِ میں (ب) حرف جار اور (اسم) مجرور ہے جو کہ اپنے سے مؤخر (فعل) اور پھر جو اپنے مقام کے اعتبار سے بھی مناسب (جگہ) پر ہے، سے متعلق ہیں، اس طرح اصل: (مقدر) عبارت یوں ہوگی: بِسْمِ اللَّهِ أَكْتُبُ أَوْ أَصْنِفُ ”کہ اللہ کے نام کے ساتھ میں لکھتا ہوں یا تصنیف کرتا ہوں۔“

(أَكْتُبُ اور أَصْنِفُ) فعل مضارع معلوم صیغہ واحد متکلم۔

اور ہم نے یہاں اس عبارت میں (اسم کی جگہ) فعل کو ہی مقدر مانا ہے اس لئے کہ عمل کے اعتبار سے اصل تو افعال ہی ہوا کرتے ہیں۔ (مطلب یہ کہ انسان سے مطلوب و مقصود اعمال ہیں جن کی ایک صورت افعال ہیں)..... اسی طرح ہم نے اس ’فعل‘ کو

آخر میں بھی اس لئے مقدر مانا ہے تاکہ دو فائدے حاصل ہوں:

① اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے بابرکت نام سے ابتداء ہو (نہ کہ فعل سے)

② عبارت میں حصر (کسی خاص مفہوم میں مقید کرنا) کا فائدہ ہو، اس لئے کہ متعلق کی

تقدیم حصر کا فائدہ دیتی ہے، جیسے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں دونوں

جگہ مفعول کی تقدیم، حصر و خصوصیت کا فائدہ دیتی ہے اور ہم نے فعل کو یہاں مناسب

سمجھتے ہوئے آخر میں مقدر کیا ہے اس لیے کہ..... آخر میں مقدر ہونے کی وجہ سے اور

اپنے الفاظ کی بناء پر وہ معنی و مراد پر زیادہ (بہتر طور پر) دلالت کرتا ہے۔ مثال کے طور

پر اگر ہم کوئی کتاب پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہتے ہیں: بِسْمِ اللّٰهِ نَبْتَدِئُ

کہ اللہ کے نام سے ہم ابتداء کرتے ہیں تو اس عبارت سے یہ نہیں جانا جاسکتا کہ اللہ

کے نام کے ساتھ کس چیز کی ابتداء ہو رہی ہے؟ مگر جب ہم یہ الفاظ ادا کریں گے

(بسم اللہ اُقرأ یا بسم اللہ اُصْنَفُ) تو اپنے اصل معنی و مفہوم پر زیادہ بہتر طور

پر دلالت کر رہے ہوں گے کہ کس چیز کی ابتداء کی جا رہی ہے؟ (لہذا آخر میں ان الفاظ

کے ساتھ (فعل) کو مقدر ماننا اپنے مقام اور الفاظ دونوں کے اعتبار سے زیادہ مناسب

اور دلالت کرنے والا ہے)

□ ② اللہ: لفظ جلالہ باری تعالیٰ کا علم اور (أَعْرِفُ المعارف) ہے، یہ وہ (متبوع)

اسم ہے، جس کے بقیہ تمام اسماء تابع ہوتے ہیں (مطلب یہ کہ وہ تمام اسماء پر مقدم اور سب کا

موصوف ہوتا ہے) جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس فرمان میں ہے:

﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى

صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ اللَّهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ مِنْ

عَذَابٍ شَدِيدٍ﴾ (ابراہیم: ۲۴)

”یہ ایک کتاب ہے، کہ ہم نے اسے آپ کی طرف اتارا ہے، تاکہ آپ لوگوں کو

اندھیروں سے اجالے کی طرف نکال لائیں، ان کے پروردگار کے حکم سے، اس زبردست

خوبیوں والے 'اللہ' کے رستہ پر، جس کی ملکیت ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے، اور بتائی (وہلاکت) ہے کافروں کے لئے ایک سخت عذاب (کے ذریعے) سے۔"

مذکورہ آیت کریمہ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لفظ 'جلالہ' (اللہ) یہاں نعت یعنی صفت ہے بلکہ ہم کہیں گے: کہ 'عطف بیان' ہے تاکہ لفظ 'جلالہ' کی حیثیت یہاں تابع و متبوع یعنی نعت و معنوت والی نہ بن جائے (کہ وہ اپنے سے مقدم کسی موصوف کی صفت کی سی حیثیت اختیار کر جائے بلکہ اس کی حیثیت مستقل عطف بیان کی ہے)

□ ﴿الرَّحْمَنُ﴾: یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ان اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم ہے جس کا اطلاق اس کی ذات کے علاوہ کسی اور پر نہیں ہو سکتا (اور نہ یہ کسی اور کا نام رکھا جاسکتا ہے) اور 'الرَّحْمَنُ' کا معنی ہے ایسی رحمت سے متصف ذات جو وسیع ہو (یعنی جس کی رحمت کی وسعت کی کوئی انتہاء نہ ہو)

□ ﴿الرَّحِيمُ﴾: وہ اسم جس کا اطلاق اللہ عزوجل کی ذات پر اور دیگر (مخلوقات) پر بھی ہو سکتا ہے جس کا مطلب ہے ایسی رحمت والا، جس کی رحمت (مرحومین کو) پہنچ جائے۔ اس طرح الرَّحْمَنُ بمعنی 'وسیع رحمت والا' اور الرَّحِيمُ بمعنی 'رحمت کرنے والا' اپنی رحمت سے (مرحومین) کو ڈھانپ لینے والا اور جب یہ دونوں ایک ساتھ اکٹھے ذکر ہوں، تو 'الرَّحِيمُ' سے مراد یہ ہوگا کہ وہ اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، رحمت سے بہرہ ور فرماتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ﴾ (العنکبوت: ۲۱)

"وہ عذاب دیتا ہے، جسے چاہتا ہے اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اسی کی جانب تم (سب) پھیرے جاؤ گے۔"

إِعْلَمَ: ⑤ "یہ بات جان لیجئے۔"

□ ﴿۵﴾ عِلْم سے مراد کسی چیز کی حقیقت اور کنہہ کو وثوق اور جزم کے ساتھ پالینا (اور اس



کی اصل پر پوری طرح مطلع ہو جانا) ہے اور اس ادراک، (پالینے اور جان لینے) کے چھ (۶) درجات ہیں:

- ① علم: کسی چیز کی حقیقت کو ٹھوس اور پختہ انداز سے پالینا اور سمجھ لینا۔
- ② جہل بسیط: (کلی جہالت) کلی طور پر فہم و ادراک کے فقدان کا نام ہے۔
- ③ جہل مرکب: کسی چیز کو اس کی اصل (حقیقت) کے برعکس سمجھ لینا، (یہ علم محض کی تقریباً ضد ہے)
- ④ وہم: کسی چیز (کی حقیقت) کو اس احتمال کے ہوتے ہوئے پانا کہ اس کے برعکس معنی رائج ہو، (بالفاظ دیگر، کسی چیز کے بارے میں ادراک جہاں زیادہ احتمال ہو کہ حقیقت اس کے برعکس ہے)

⑤ شک: کسی چیز کی بابت علم (پانا) جہاں دونوں طرف کا احتمال برابر ہو۔ (مطلب یہ کہ دونوں طرح کے مفہوم برابر کی سطح پر درست ہو سکتے ہیں۔) جبکہ وہم میں جو کچھ سمجھا گیا ہے اس کے برعکس حقیقت کا احتمال زیادہ رائج ہے اور سمجھے گئے مفہوم کے برعکس مفہوم کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔)

⑥ ظن: (گمان) (یہ تقریباً 'وہم' کی ضد ہے) اور یہ کسی چیز کا ادراک جہاں ضد مرجوح کا احتمال ہو، (مطلب یہ کہ جو چیز سمجھی گئی ہو اسی کا احتمال زیادہ ہو، بنسبت اس کے برعکس چیز کے جبکہ 'وہم' میں جو چیز سمجھی گئی ہے اس کے برعکس چیز کا احتمال زیادہ ہوتا ہے) خوب سمجھ لیجئے۔

اور اصولیوں کے ہاں 'علم' دو قسموں میں منقسم ہے: ① ضروری ② نظری۔

(۱) علم ضروری: یہ ہے کہ جس میں 'معلوم چیز' کی بابت اطلاع پانا لامحالہ اور ضروری ہو کہ انسان اس معلوم فیہ (جس چیز کے بارے میں اطلاع پائی جائے) کی معرفت، بغیر اس میں غور و فکر کئے اور بغیر کسی دلیل کے، حاصل کرنے میں مضطر ہو (کہ اسے اس کی معرفت پائے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو) جیسے آگ کے بارے میں اس حقیقت کا علم

کہ وہ گرم ہوتی ہے اور جلاتی ہے (اور زہر کے بارے میں یہ علم کہ وہ ہلاک کرتا ہے)  
(ب) علم نظری: یہ علم ضروری کے برعکس وہ علم ہے کہ جس میں انسان غور و فکر کرنے اور دلائل کا محتاج ہو، جیسے، یہ جاننا کہ وضوء میں نیت (دل کا ارادہ) واجب ہے۔

رَحِمَكَ اللَّهُ ۞ ”اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے!“

□ ۶ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمت بہا دے، جس کے ذریعے آپ اپنے مقصود و مطلوب کو پالیں اور اپنے محذورات (خطرات و گناہوں وغیرہ) سے نجات پا جائیں۔  
تو جب اکیلی رحمت مذکور ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) آپ کے سابقہ گناہ معاف فرمائے، آپ کو نیکی کی توفیق مرحمت فرمائے اور آئندہ مستقبل میں پیش آمدہ خطرات اور گناہوں سے بھی آپ کو بچائے رکھے، مگر جب رحمت اور مغفرت دونوں ایک ساتھ ذکر ہوں تو مغفرت سے مراد سابقہ گناہوں کی معافی ہوگی اور رحمت آئندہ مستقبل میں ہونے والے گناہوں سے بچاؤ اور بھلائی کی توفیق کا موجب اور سبب ہوگی۔ (إِنْ شَاءَ اللَّهُ)

اور یہاں مؤلف (رحمہ اللہ تعالیٰ) کا یہ انداز اور طرز عمل اپنے مخاطب (اور قارئین کرام) کے حق میں واضح شفقت و رحمت اور ان کی بہتری و بھلائی کے ارادے پر دلالت کرتا ہے (جیسا کہ انہوں نے پُر خلوص دعائیہ کلمات سے نوازا) جزاءہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

أَنَّهُ يَجِبُ عَلَيْنَا تَعَلُّمُ أَرْبَعِ مَسَائِلَ ۞

”کہ ہم (سب مسلمانوں) پر، چار مسائل کا جاننا واجب ہے۔“

□ ۷ یعنی یہ چار مسائل جن کا تذکرہ مؤلف رحمہ اللہ نے یہاں کیا ہے، پورے دین (کی اصل) کو شامل ہیں لہذا انکے بہت زیادہ اہم اور منفعت بخش ہونے کی بناء پر انکی معرفت حاصل کرنا اور انکی بابت علم حاصل کرنے کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ (اور وہ چار مسائل یہ ہیں)

الْأُولَى: الْعِلْمُ وَهُوَ مَعْرِفَةُ اللَّهِ تَعَالَى ①

پہلا: 'علم' اور وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان حاصل کرنا ہے۔

□① یعنی اللہ عزوجل کی دل میں معرفت، جو اس بات کو لازم ٹھہرائے کہ جملہ امور شرعیہ کو نہ صرف انسان دل و دماغ سے قبول کرے، بلکہ عملاً ان کے لئے سر تسلیم خم کر دے، اور اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بن کر رہے، اسی طرح جو شریعت طاہرہ اللہ کے رسول ﷺ لے کر آئے ہیں اس کو اپنے پر اور پھر (اللہ کی زمین پر) نافذ کرے (اور ہر بات میں اسی کو حکم مانے)

اور مزید یہ کہ بندہ اپنے رب کی معرفت کے لئے اللہ عزوجل کی کتاب میں وارد اور اسی طرح اس کے رسول ﷺ کی سنت طاہرہ میں مذکور شرعی نظام پر دلالت کرنے والی آیات و احادیث میں غور و خوض کرے، اور ساتھ ہی اس کائنات کے کوئی نظام پر مشتمل آیات (جو کہ مظاہر قدرت اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے ثبوت پر واضح دلالت کرتی ہیں) کا بھی گہری اور عمیق نظر سے مطالعہ کرے۔ اس لئے کہ انسان.....

جس قدر ان آیات (اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں) میں غور و خوض اور تدبر و فکر کرے گا، اسی قدر اپنے حقیقی خالق و معبود کی زیادہ معرفت حاصل کر کے اپنے ایمان کو جلاء بخشنے گا، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾ ”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے (واضح) نشانیاں ہیں اور تمہاری (اپنی) جانوں میں (بھی) کیا پس تم نہیں (بصیرت کی آنکھوں سے) دیکھتے۔“

وَمَعْرِفَةُ نَبِيِّهِ ② (جَلَّ وَ عَلَا)

”اور اس اللہ جل شانہ کے نبیؐ کی معرفت اور حقیقی پہچان۔“

□② یعنی اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی حقیقی معرفت، جو کہ انسان کو اس بات کا پابند

بنادے کہ جو بھی اللہ کے رسولؐ، اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت اور دین حق لے کر آئے ہیں اس کو وہ دل و جان سے قبول کرے، جس چیز کے بارے (خاص طور پر غیبی امور کے متعلق) وہ خبر دیں، اس کو دل سے سچ مانے، جس چیز سے آپؐ روکیں اور خبردار کریں، اس سے کلی اور فوری اجتناب کرے، اور جس چیز کے کرنے کا حکم دیں اس کو من و عن اور فوری طور پر بجا لائے، اسی طرح آپؐ کی شریعت ظاہرہ کو عملاً نافذ کرے اور آپؐ کے ہر حکم اور فیصلے کو برضا و رغبت قبول کرے۔“

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجْعَلُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (اے محمد!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تنازعات میں آپؐ کو حکم (فیصلہ کرنے والا) تسلیم نہ کر لیں۔ پھر آپؐ جو فیصلہ کریں اس کے متعلق اپنے دلوں میں گھٹن بھی محسوس نہ کریں اور اس فیصلہ پر پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔ (النساء: ۶۵) ..... اور

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (النور: ۵۱) ”اہل ایمان کی بات اس کے سوا نہیں کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ یہ کہتے ہیں: کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور وہی (دو جہاں کی) فلاح پانے والے ہیں“ ..... اور

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (النساء: ۵۹) ”پھر اگر کسی بات پر تمہارے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے، تو اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف پھیر دو، یہی طریق کار بہتر اور انجام کے اعتبار سے اچھا ہے۔“

اور عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (النور: ۲۳)

”تو جو لوگ اس (رسولؐ) کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، چاہئے کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ ان پر کوئی (ناگہانی) آفت آئے یا ان کو دردناک عذاب پڑ لے۔“

اس آیت کے لفظ ’فِتْنَةٌ‘ کی تفسیر میں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”کیا آپ جانتے ہیں کہ ’فِتْنَةٌ‘ کیا ہے؟ (پھر خود ہی وضاحت فرمائی) کہ فتنہ سے مراد ’شُرک‘ ہے اور شاید کہ وہ جب آپؐ کے بعض فرامین رد کر دے، اس وجہ سے کہ اس کے دل میں آپؐ کے فرمان کے بارے میں کوئی میل، کھوٹ، یا یٹزہا پین پیدا ہو، تو وہ ہلاک اور تباہ ہو جائے۔ (الْمِیَازُ بِاللّٰهِ)

وَمَعْرِفَةُ دِينِ الْإِسْلَامِ ⑤ ”اور دین اسلام کی حقیقی پہچان۔“

⑤ ⑤ ’اسلام‘ کا عام مفہوم یہ ہے کہ انسان (عبد مؤمن) کا اللہ کے حضور جھک جانا، اس کی شریعت کے جملہ احکام کو مانتے ہوئے جو اس (اللہ وحدہ لا شریک) نے، جب سے اپنے پیغمبروں کو (منصب رسالت دے کر اس دنیا میں) بھیجنا شروع کیا ہے اپنے بندوں کے لیے مشروع فرمائے ہیں، یہاں تک کہ قیامت پہنچا ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے اپنی کتاب میں بہت سی آیات کا ذکر فرمایا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سابقہ ساری کی ساری شریعتیں بھی ’اسلام‘ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے جھک جانا اور اس کی اطاعت کے لئے سر تسلیم خم کرنا ہے۔“ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں: (کہ جب وہ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہما السلام اپنے رب کے حضور یہ دعا کر رہے تھے) ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ (البقرہ: ۱۲۸)

”اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمان بردار بنا لے اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت پیدا کر جو تیری فرمان بردار ہو۔“..... الخ

اور 'اسلام' کا خاص معنی، اللہ کے نبی ﷺ کی بعثت کے بعد، آپؐ پر ایمان لانے اور جس شریعت کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے ہیں، اسے برضا و رغبت تسلیم کرنے کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ جو دین دے کر آپؐ بھیجے گئے ہیں، اس نے سابقہ تمام 'ادیان' کو منسوخ کر دیا ہے، تو اس طرح اب جو شخص بھی آپؐ کی اتباع کرے گا وہ مسلمان ہوگا اور جو مخالفت کرے گا وہ مسلمان نہیں ہوگا، اسی طرح سے پیغمبروں کے متبعین (پیروی کرنے والے) اپنے اپنے پیغمبروں کے زمانے کے اعتبار سے مسلمان ہیں، (نہ کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں) لہذا یہود مسلمان تھے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں (جو لوگ آپؐ پر صحیح ایمان لائے تھے) اور عیسائی بھی مسلمان تھے، مگر وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور نبوت میں آپؐ پر صحیح ایمان لائے تھے، لیکن جس وقت آپ ﷺ نبی بنا کر بھیجے گئے، تو جنہوں نے آپؐ کی نبوت و رسالت کا انکار کیا، تو وہ مسلمان نہیں رہے (بلکہ کافر ہیں)

اور یہ 'دین اسلام' وہ دین ہے، جو اللہ جل شانہ کے ہاں محبوب و مقبول اور قبول کرنے والے شخص کے لئے مفید (اور دونوں جہانوں کے لئے کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہے)۔

اللہ عز وجل کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹)

”بے شک اللہ کے ہاں (پسندیدہ) دین 'اسلام' ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ

فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (آل عمران: ۸۵)

”اور جو شخص 'اسلام' کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا (یا اس کی جستجو کرے گا) تو اس سے وہ

ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں انتہائی نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

اور یہ 'اسلام' وہ 'دین اسلام' ہے جسے عطاء فرما کر اللہ جل جلالہ نے حضرت محمد ﷺ اور آپؐ

کی امت پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ

دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدة: ۳)

”آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور (ساتھ ہی) میں نے تم پر اپنی (اس عظیم) نعمت کو بھی پورا کر دیا ہے (اور وہ اس طرح کہ) میں نے تمہارے لئے ’اسلام‘ کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔“

بِالْأَدِلَّةِ ⑩ ”(دلائل کی روشنی میں) دلائل کے ساتھ۔“

□ ⑩ لفظ أدلة دلیل کی جمع ہے اور دلیل وہ ہے جو کہ مطلوب و مقصود کی طرف راہنمائی کرے اور ان مذکورہ امور کی معرفت کے سمعی دلائل بھی ہیں اور عقلی دلائل بھی، سمعی دلائل تو وہ ہیں جو وحی الہی (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) سے ثابت شدہ ہوں اور جہاں تک عقلی دلائل کا تعلق ہے تو یہ وہ ہیں، جو تامل اور غور و فکر سے حاصل ہوتے ہوں، اللہ عز و جل نے اپنی ’محکم‘ کتاب میں اس قسم کے (دلائل عقلیہ) کا بھی کثرت سے تذکرہ فرمایا ہے، تو کتنی ہی تعداد میں ایسی آیات کریمہ موجود ہیں، جن کے آغاز میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ﴾ ”اور اس کے مظاہر قدرت میں سے یہ بھی ہے اور یہ بھی چیز ہے۔۔۔ الخ“

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے مظاہر قدرت پر دلالت کرنے والی آیات کریمہ کو (جابجا) ذکر کیا ہے اور جہاں تک اللہ کے نبی ﷺ کی معرفت کے حصول کے لئے سمعی دلائل کا تعلق ہے تو اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ (الف: ۲۹)

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (آل عمران: ۱۴۴)

”اور محمد نہیں ہیں، مگر اللہ کے رسول، آپ سے پہلے بھی رسول ہو گزرے ہیں۔“

اور عقلی دلائل کے ساتھ اللہ کے نبی ﷺ کی معرفت اور آپ تک رسائی ان آیات بینات میں غور و فکر اور تامل و تدبر کرنے سے حاصل ہوگی، جنہیں آپ ’مجانب اللہ تعالیٰ لائے ہیں، جو

اللہ تعالیٰ کی کتاب، قرآن حکیم میں عظمت والی گردانی گئیں اور جو حقیقت پر مبنی، منفعت بخش خبروں اور سیدھے انصاف پر قائم، خیر خواہی کے احکامات پر مشتمل ہیں۔ نیز ان خوارقِ عادات (معجزات و علاماتِ نبوت) اور جملہ غیبی امور کے ذریعے بھی، جو خود آنحضور ﷺ نے بیان فرمائے اور وحی الہی کے بغیر ان کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے، اور ان دیگر امور کے ذریعے جو آپ ﷺ کی ہستی سے صادر ہوئے اور زبانِ نبوت نے ان کی تصدیق کی۔

الثَّانِيَّةُ: الْعَمَلُ بِهِ ⑤ ”دوسرا مسئلہ اس ’علم‘ کے مطابق ’عمل‘ کرنا۔“

□⑤ یعنی وہ ’عمل‘ جس کا یہ (حاصل کی گئی) ’معرفت‘ تقاضا کرتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ایمان لا کر اور ہر قسم کی عبادات خواہ متعدیہ ہوں یا خاصہ، ان میں اللہ تعالیٰ کے جملہ اوامر کو بجالاتے ہوئے اور نواہی (منکرات) سے باز آ کر اس کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کو قائم و دائم رکھنا۔

① عباداتِ خاصہ: جیسے، نماز، روزہ، حج وغیرہ۔

② عباداتِ متعدیہ: جیسے اُمر بالمعروف ونہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا)، اللہ کی راہ میں جہاد یا جو اس کے مشابہ اعمال ہیں۔

□..... اور ’عمل‘ حقیقت میں ’علم‘ کا پھل ہے، تو جو شخص بغیر علم و معرفت کے ’عمل‘ کرے وہ عیسائیوں کے مشابہ ہوگا اور اس کے برعکس جو شخص (کسی چیز کی بابت) علم و معرفت پالے مگر اس کے مطابق ’عمل‘ نہ کرے تو وہ یہودیوں کے مشابہ ہے۔

الثَّالِثَةُ: الدَّعْوَةُ إِلَيْهِ

تیسرا مسئلہ اس دینِ اسلام کی طرف دعوت دینا۔

□③ یعنی اللہ تعالیٰ کی اس شریعتِ طاہرہ کی طرف دعوت جسے رسول اللہ ﷺ لے کر



آئے ہیں، ان تین یا چار مراتب (اور اصول) کی روشنی میں، جن کا ذکر اللہ عزوجل نے اس آیت کریمہ میں کیا ہے: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (النحل: ۱۲۵)

”اپنے پروردگار کے رستے کی طرف (کامل) حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ (لوگوں کو) دعوت دو اور (ضرورت کے وقت) ان سے بحث مباحثہ کرو، اس انداز سے جو نہایت اچھا اور عمدہ ہو“..... اور

چوتھا اصول اپنے اس فرمان میں ذکر فرمایا:

﴿وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ﴾  
 ”اور اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے نہایت اچھے انداز سے بحث و مباحثہ کیا کرو، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کا ارتکاب کیا۔“ (العنکبوت: ۴۶)

اور اس دعوت کے کا ز کے لئے اللہ کی شریعت طاہرہ سے آگاہی بہت ضروری ہے، تاکہ دعوت و تبلیغ کا یہ کام علم و بصیرت کی روشنی میں سرانجام پائے، اللہ جل شانہ کے اس فرمان کی بناء پر ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعْنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (یوسف: ۱۰۸)

”(اے نبی!) کہہ دو! یہ میری راہ ہے میں اللہ کی (راہ کی) طرف سمجھ بوجھ کر بلاتا ہوں، میں (خود) اور وہ بھی جو میرا پیروکار (امتی) ہے، اور اللہ (کی ذات) پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

آیت کریمہ میں مذکور یہ بصیرت ایک تو اس بات میں ہو، جس کی طرف وہ (داعی) دعوت دے رہا ہے، مطلب یہ کہ داعی شرعی حکم سے خوب واقف ہو اور دوسرے یہ کہ وہ دعوت دینے کی کیفیت اور اس کے طرق سے واقفیت رکھتا ہو، اور تیسرے یہ کہ وہ مدعو (جس کو دعوت دے رہا ہے) کی نفسیات خوب جانتا ہو (یعنی اس کے مزاج اور ’مبلغ علم‘ وغیرہ سے آگاہی رکھتا ہو اور اس کے روحانی مرض سے بھی جس کی وہ تشخیص کرنا چاہتا ہے)

دعوت و تبلیغ کے بہت سے میادین (اور وسائل و ذرائع) ہیں جن میں سے (چند) یہ ہیں:

- ① خطابت کے ذریعے
  - ② محاضرات (لیکچرز) کے ذریعے
  - ③ مقالات (اور مضامین) وغیرہ لکھ کر
  - ④ علمی مجالس اور حلقوں کا انعقاد کر کے
  - ⑤ اور ان ہی میں تصانیف و تالیفات کے ذریعے سے دین کی نشر و اشاعت کرنا بھی شامل ہیں۔
- ان وسائل و ذرائع میں سے خاص طور پر ایسی مجالس کا انعقاد بھی ہے، جن کی غرض و غایت اللہ کے دین کی طرف دعوت دینا ہوتا ہے، لہذا جب انسان کسی ایسی مجلس میں بیٹھتا ہے، تو اس وقت وہ اللہ جل شانہ کے دین کی طرف دعوت کے کاز میں شریک ہوتا ہے، تو اسے چاہئے کہ وہ اس (وظیفہ رسل) کی ادائیگی کے وقت (مدعوین کے ساتھ) ایسا رویہ اور انداز رکھے جس میں نہ کوئی اکتاہٹ ہو اور نہ (دوسروں کے لئے) بوجھ۔

اور ایک داعیہ (دعوت دینے والا) اس ہدف (اور طریق کار) کو اس طرح سے حاصل کر سکتا ہے کہ وہ مجلس کے شرکاء پر ایک علمی مسئلہ پیش کرے، پھر اس پر مناقشہ (علمی مباحثہ) شروع ہو جائے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ علمی مناقشہ اور علمی سوالات و جوابات، (اور آپس میں علمی تبادلہ) اس شریعت طاہرہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ پر نازل فرمائی ہے۔ ایک بڑا (موثر ذریعہ اور) طریقہ ہے..... اور بسا اوقات یہ طریق کار خطبہ دینے یا براہ راست تقریر وغیرہ کرنے سے بہتر اور فوری مثبت نتائج سامنے لاتا ہے جیسا کہ یہ بات (شواہد و تجربات سے) واضح ہے۔

..... اللہ عز و جل کے دین کی طرف دعوت یہ انبیاء و رسل علیہم السلام کا وظیفہ اور ان کے نیکو کار، پیروکار اہل ایمان کا طریقہ رہا ہے، تو جب انسان اپنے حقیقی معبود کو، اپنے نبی کو، اور اپنے سچے دین کو پہچان لے اور اللہ جل شانہ اس پر، ان کی کامل معرفت کی توفیق آرزائیں عطا فرمانے کا احسان فرمادے تو (اس پر اس عظیم نعمت کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ) وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دے کر ان کو (گمراہی اور اللہ کے عذاب سے) بچانے کی

پوری کوشش کرے، اور ان کو خیر اور بھلائی کی خوشخبری دے..... جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خیر (کی جنگ) کے دن کہا تھا:

”کہ زنی اور باوقار انداز سے چلتے رہئے، یہاں تک کہ تم ان (یہودیوں) کے پاس میدان میں پہنچ جاؤ، پھر تم ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور (خاص طور پر) ان کو اللہ تعالیٰ کے اس ’حق‘ کی بابت خبر دو، جس کی ادائیگی ان پر واجب ہے (اور یاد رکھو!) اللہ کی قسم! کہ اللہ تعالیٰ تیرے ذریعے کسی ایک آدمی کو ہدایت سے سرفراز فرمادے تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے۔“ (۲) [اس حدیث کی صحت پر محدثین رحمہم اللہ کا اتفاق ہے]

اور صحیح مسلم کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جس شخص نے (کسی کی) سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی تو اس کو وہ ہدایت (راہنمائی) قبول کرنے والے شخص کے برابر اجر و ثواب ملے گا اور ان (سب) کے اجر و ثواب میں سے کچھ کمی نہیں کی جائے گی (اسی طرح) جس شخص نے گمراہی کی طرف (کسی کو) بلایا، تو اس پر اس گمراہی کی پیروی کرنے والے پر جتنا گناہ کا بوجھ ہوگا، اور ان (سب) کے گناہوں میں سے کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی۔“ (۳)

اور صحیح مسلم کی ہی روایت میں آنحضور ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ، مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ» (۴)

”جس شخص نے (کسی کی) بھلائی (اور نیکی) کی طرف راہنمائی کی تو اس کو اس نیکی کا کام کرنے والے کی مثل اجر ملے گا۔“

#### الرابعة: الصَّبْرُ عَلَى الْآذَى ⑤

”چوتھا مسئلہ: تکالیف و مصائب پر صبر و استقامت۔“

□ ⑤ صَبْرٌ يَعْنِي نَفْسُ (اپنے آپ) کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر روک لینا، اور اللہ کی نافرمانی سے اس (نفس) کو بند کر لینا، (یعنی بچا لینا) اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر، ناراضگی سے بھی اس (نفس) کو روک رکھنا تو (اس طرح) ایک ’صابر‘ شخص اپنے نفس (جی) کو ناراض

ہونے سے، تنگی واکتاہٹ، (اور غصے اور مایوسی وغیرہ) سے بچائے رکھتا ہے خواہ اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت کے دوران اسے تکالیف و مصائب پہنچائی جائیں، تب بھی وہ (انتہائی مطمئن اور) ہمیشہ ہوشیار اور چاک و چوبندرہتا ہے، اس لئے کہ دعاۃ الخیر (بھلائی اور دین کی طرف بلانے والوں) کو ستانا اور تکلیف دینا، آدمی کی طبیعت اور مزاج میں سے ہے، سوائے اس خوش نصیب کے، جسے اللہ (شروع سے) ہدایت سے سرفراز فرمادے۔ اللہ تعالیٰ (اپنے کلام میں) اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأَوْدُوْا وَحَتَّىٰ آتَاهُم نَصْرُنَا﴾ (الانعام: ۳۳)۔

”اور تحقیق تجھ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا، تو انہوں نے اس پر صبر کیا جو وہ جھٹلائے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی۔“

اور یہ ستانا اور تکلیف دیا جانا جس قدر زیادہ سخت ہوگا اسی قدر اللہ کی نصرت قریب ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مدد، اس چیز کے ساتھ خاص نہیں کہ انسان لامحالہ اپنی زندگی میں مدد دیا جائے اور اپنی اس دعوت کے آثار و نتائج وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ واقعی اس کی دعوت بار آور ہوئی ہے، بلکہ یہ مدد آتی ہے، خواہ اس کے مرنے کے بعد آئے (اور اس کی صورت یہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ اس داعیہ کی تاثیر اپنی مخلوق کے دل میں ڈال دے اور وہ اسے قبول کر لیں، اس پر ثابت قدم رہیں اور مضبوطی سے قائم رہیں، تو یہ بھی اس داعی کی مدد ہی سمجھی جائے گی، اگرچہ وہ اب اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ لہذا.....

ایک داعی پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہتے ہوئے اسے جاری و ساری رکھے۔ اللہ کے دین کی طرف جو وہ دعوت دے رہا ہو اس پر صابر رہے اور اس دعوت کے دوران اسے خود یا اس کے اس مشن (دعوت) کو بھی جن کٹھن حالات کا سامنا ہو انہیں برداشت کرتے ہوئے صبر کا دامن کسی حال میں بھی نہ چھوڑے..... اور دیکھئے! یہ ہیں وہ اللہ کے پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام جنہیں (اللہ کے رستے میں قولاً اور فعلاً ہر دو اعتبار سے) ایذا میں اور تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿كَذٰلِكَ مَا آتٰی الْاٰیٰتِیْنَ مِنْ

قَبِيلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴿الذاریات: ۵۲﴾

”یوں ہی ہوتا رہا ہے، ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا، جسے

انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر (جادوگر) ہے یا مجنون (دیوانہ)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ﴾

”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے، مجرموں (گناہ گاروں) میں سے دشمن (اور مخالف)

بنائے“..... ﴿الفرقان: ۳۱﴾

مگر داعیہ (دعوت دینے والے) پر یہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کا صبر و استقامت

سے سامنا کرے اور اللہ عز و جل کا اپنے رسول سے یہ فرمانا (ہمہ وقت) اپنے پیش نظر رکھے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا﴾ (الدھر: ۲۳) ”بے شک ہم نے (ہی) اس قرآن

کو آپؐ پر (تھوڑا تھوڑا کر کے حسب ضرورت و مصلحت) نازل کیا ہے۔“ (اس آیت کریمہ

کے بعد ظاہری طور پر) اس بات کا انتظار تھا کہ یوں کہا جاتا: «فَأَشْكُرْ نِعْمَةَ رَبِّكَ» ”لہذا

تم اپنے پروردگار کی اس نعمت کے بدلے شکر بجالاؤ“، لیکن اللہ عز و جل نے اس کے بجائے یہ

فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (سورۃ الدھر: ۲۳)

”پس تم اپنے پروردگار کے (اس) حکم کی خاطر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرو۔“

اس آیت کریمہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اس قرآن کی دعوت کو

لے کر اٹھے گا تو لامحالہ اسے اس راہ عزیمت میں مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا خواہ

وہ کیسی ہوں اور ان پر قابو پانے کے لئے وہ صبر کی قوت کا محتاج بھی ہوگا، آپ اس سلسلے میں

اللہ کے نبی ﷺ کے حالات کی طرف نظر اٹھائیں جب آپؐ کی قوم نے آپ کو مارا اور مار مار

کر آپؐ کا خون بہا دیا، آپؐ اس حال میں تھے کہ اپنے چہرہ انور سے خون صاف کر رہے تھے

اور فرما رہے تھے: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ» (۵) ”الہی! میری قوم کو

معاف فرما دے اس لئے کہ وہ جانتے نہیں ہیں (کہ میں ان کا سچا خیر خواہ ہوں)۔ لہذا ایک

داعیہ پر یہ لازم ہے کہ وہ صبر کرنے والا (اور ان مصائب و آفات پر اپنے اللہ سے) اجر و

ثواب کی امید رکھنے والا ہو..... اور آگے

صبر کی تین قسمیں ہیں:

① اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری پر صبر (کہ وہ اپنے آپ کو اللہ جل شانہ کی اطاعت پر ثابت قدم رکھے)

② اللہ تعالیٰ کے محارم (یعنی حرام کردہ چیزوں) سے اپنے آپ کو باز رکھے اور پھر اس پر پوری طرح کاربند رہے۔

③ اللہ تعالیٰ کی تقدیر (اور فیصلوں) پر اپنے آپ کو راضی رکھے، خواہ یہ اس کے بندوں میں سے کسی کی براہ راست دخل اندازی یا 'کسب' (کمائی) کے بغیر ہو، یا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کے ذریعے کوئی ایذا (تکلیف) یا زیادتی کو جاری کر دے۔ (اور اس طرح اپنے صابر بندے کو اجر و ثواب سے نواز دے)

وَالدَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَالْعَصْرُ، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالنَّحَقِّ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ﴾ ⑤

”اور ان مسائل کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ”زمانے کی قسم، کہ انسان

خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے، جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے

رہے، اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔“

□ ⑤ مطلب یہ کہ ان مذکورہ چاروں مسائل کے ثبوت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان

(سورۃ العصر) ہے۔

وَالْعَصْرُ: اللہ عزوجل نے اس سورۃ میں 'العصر' کی قسم کھائی ہے اور 'العصر' سے مراد زمانہ

(اور وقت ہے) جو کہ خیر و شر کے حوادث کا محل (جگہ) ہے۔ تو اللہ جل شانہ نے اس زمانے

(اور وقت) کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا ہے، کہ ہر انسان واضح گھائے اور نقصان میں جا رہا ہے

سوائے اس کے جو ان چار صفات سے متصف ہو اور وہ چار صفات یہ ہیں: ایمان، عمل صالح،

حق بات کی ایک دوسرے کو نصیحت اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: 'نفس سے جہاد کے چار (۴) درجات ہیں:

۱۔ پہلا: کہ انسان اس نفس کو ہدایت اور دین الہی سیکھنے پر تیار کرے، وہ سچا دین کہ اس کے بغیر انسان کے لئے نہ دنیا و آخرت میں کامیابی ہے، نہ اس کی معاش و معیشت میں کوئی سعادت مندی ہے اور نہ آخرت میں کوئی سرخروئی ہے۔

۲۔ دوسرا: دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے 'دین حق' کی بابت سیکھا ہے اس پر عمل کے لئے اپنے 'نفس' سے جہاد کرے، (یعنی علم کے مطابق ٹھوس انداز سے عمل ہو اور کوئی مداخلت نہ ہونے پائے)

۳۔ تیسرا: کہ وہ اس 'دین حق' کی طرف دعوت کے لئے اور جسے علم نہیں، اس کو 'تعلیم' سے آراستہ کرنے کے لئے اپنے نفس (یعنی خود) کو تیار کرے، (اور اس بارے میں کوئی سستی اور غفلت نہ برتے)

۴۔ چوتھا: کہ اس 'نفس' کو صبر و استقامت کا خوگر بنائے، نیز اللہ کی طرف دعوت دینے پر آنے والی مشکلات اور مخلوق کی ایذا اور مخالفتوں کو 'صبر' کی قوت سے برداشت کرے، اور یہ سب کچھ صرف اور صرف اللہ جل شانہ کی رضا کے لئے سہمے، تو جب اس نے (جہاد نفس کے) ان چار مراتب کو مکمل کر لیا، تو وہ ربانین (رب کے حقیقی اور مقرب بندوں) میں سے ہو جائے گا۔

پس اللہ عز و جل نے اس سورہ مبارکہ میں 'العصر' (زمانے) کی قسم اس بات پر کھائی ہے، کہ کائنات کا ہر انسان (اور ہر درود کا انسان) خواہ اس کا مال و اولاد اور قدر و منزلت کتنی زیادہ بڑھ جائے، وہ بہر حال مسلسل نقصان اور گھٹائے میں ہے، ہاں جو شخص اپنے اندر ان چار صفات کو جمع کر لے (تو وہ اس نقصان سے مستثنیٰ ہے)

۵۔ پہلی صفت: (اللہ جل شانہ پر ایمان) اور یہ ایمان ہر اس صحیح عقیدے اور منفعت بخش 'علم' کو شامل ہے جو مومن کو اللہ کی بارگاہ میں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے۔

﴿ دوسری صفت: (عمل صالح) اور یہ ہر وہ 'قول' یا 'فعل' ہے، جو بندہ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے قریب کر دے (اس شرط کے ساتھ) کہ کہنے والا یا ادا کرنے والا شخص ایک تو اللہ جل شانہ کے لئے مخلص ہو اور دوسرے وہ حضرت محمد ﷺ کی (اس قول و فعل میں پوری طرح) اتباع کرنے والا ہو۔

﴿ تیسری صفت: (آپس میں حق بات کی نصیحت) اور یہ نصیحت بھلائی اور نیکی کے کام پر اکسانے اور اس میں رغبت دلانے کے لئے ہو۔

﴿ چوتھی صفت: (آپس میں صبر و استقامت کی نصیحت) کہ ہر کوئی اپنے دوسرے بھائی کو اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات کی پیروی پر قائم رہنے اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری فیصلوں پر راضی رہنے کی تلقین کرے۔

﴿ ..... حق بات کی نصیحت اور صبر و استقامت کی ایک دوسرے کو تلقین، یہ دونوں اوصاف اَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ اور نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ کے ضمن (ذیل) میں آتے ہیں، اور یہی وہ دونوں (دعوت و تبلیغ کے) اصول ہیں جن کی بناء پر اس امت مرحومہ کا ثبات، اس کی بقاء اس کی فتح و نصرت اور شرف و عزت کا حصول ممکن ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی خاطر اٹھائی گئی ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

قَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى ①

”امام شافعیؒ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے کہتے ہیں۔“

□ ② امام شافعیؒ کا پورا نام و نسب یہ ہے: ابو عبد اللہ محمد بن ادريس بن الغباس بن عثمان بن شافع۔ آپ اصلاً ہاشمی اور قریشی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپؒ کی کنیت ابو عبد اللہ ہے،



آپ غزہ کے علاقے میں ۱۵۰ ہجری کو پیدا ہوئے اور ’مصر‘ میں ۲۰۴ ہجری کو وفات پا گئے آپ چار (مشہور) ائمہ کرام میں سے ایک ہیں۔ (سب پر اللہ رحم فرمائے!)

لَوْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ حُجَّةً عَلَى خَلْقِهِ إِلَّا هَذِهِ السُّورَةُ لَكَفَتْهُمْ<sup>⑤</sup>

”اگر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر بطور حجت (دلیل) کے صرف اسی

ایک سورت کو نازل فرماتے تو یہ (ان کی ہدایت کے لئے) کافی ہوتی۔“

□ ⑤ امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ سورت، مخلوق کو اللہ کے دین کے ساتھ تعلق مضبوط رکھنے پر ابھارنے کے لئے، نیز ایمان رکھتے ہوئے عمل صالح اور اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت و ارشاد، اور ان امور پر ثابت قدمی جیسے اعمال میں رغبت دلانے کے لئے کافی ہے، نہ کہ اس کا مفہوم یہ سمجھ لیا جائے کہ ”یہ سورت مخلوق کے لئے پوری شریعت طاہرہ پر عمل کرنے کے لئے کافی ہے۔“

اور امام شافعی کا یہ کہنا: ”لَوْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ حُجَّةً عَلَى خَلْقِهِ إِلَّا هَذِهِ السُّورَةُ لَكَفَتْهُمْ“ حقیقت کے قریب اسلئے ہے کہ جب ایک صاحب عقل و بصیرت اس سورہ مبارکہ کو سن یا پڑھ لے گا تو وہ لازماً اپنے آپ کو اس نقصان اور گھائے سے رہائی دلانے کی کوشش کرے گا، اور یہ کوشش ان چار صفات کو اپنا کر ہو سکے گی، ایک ایمان، دوسرے، ’عمل صالح‘، تیسرے ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت اور چوتھی ایک دوسرے کو صبر و ثبات کی تلقین۔

وَقَالَ الْبُخَارِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى<sup>⑥</sup>

”اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔“

□ ⑥ امام بخاریؒ کی کنیت ابو عبد اللہ اور نام و نسب یہ ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرۃ البخاری آپ شہر بخارا میں شوال ۱۹۴ھ کو پیدا ہوئے اور اپنی والدہ کی گود میں، یتیم پرورش پائی اور ۲۵۶ھ کو عمید الفطر کی رات، ’خرنک‘ قصبہ میں جو سمرقند کے علاقہ سے دو فرسخ

کے فاصلے پر واقع ہے وفات پائی۔ (رحمہ اللہ)

بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالِدَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾ (محمد: ۱۹) فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ<sup>①</sup>  
 ”کہ قول و عمل سے پہلے حصول علم کا بیان اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”پس جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا معبود برحق کوئی نہیں اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں قول و عمل سے پہلے علم (جان لینے) کا ذکر فرمایا ہے۔“

□ ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کے ساتھ یہ دلیل پکڑی ہے کہ قول و عمل سے پہلے علم سے ابتداء واجب ہے اور یہ دلیل اثری (یعنی نقلی) ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان پہلے ایک چیز کی حقیقت کے بارے میں جانتا ہے پھر بعد میں اس پر عمل پیرا ہوتا ہے اور یہاں عقلی و نظری دلیل بھی موجود ہے جو اس بات پر ہی دال ہے کہ بہر حال قول و عمل سے پہلے علم کا ہی نمبر ہے۔

اور اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ چونکہ قول یا عمل اس وقت تک درست اور اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتا جب تک وہ شریعت کے موافق نہ ہو اور یہ بات ناممکن ہے کہ انسان بغیر علم حاصل کئے یہ جان لے کہ اس کا عمل شریعت طاہرہ کے مطابق ہے... اور یہاں کچھ ایسی اشیاء ضرور موجود ہیں جن کو انسان فطری طور پر (پہلے سے ہی) جانتا ہوتا ہے، جیسے اس کا یہ جاننا کہ بے شک اللہ اکیلا معبود برحق ہے اسلئے کہ بندہ کو اس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے وہ اس بارے میں کچھ جاننے کیلئے بہت بڑی محنت اور اہتمام کا محتاج نہیں ہے... مگر جہاں تک جزوی و فروعی مسائل کا تعلق ہے، تو یہ انتہائی محنت شاقہ اور جہد مسلسل کے محتاج ہیں۔

إِغْلَمَ رَحِمَكَ اللَّهُ: أَنَّهُ، يَجِبُ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ تَعَلُّمُ  
ثَلَاثَ هَذِهِ الْمَسَائِلِ وَالْعَمَلُ بِهِنَّ، الْأُولَى: أَنَّ اللَّهَ خَلَقَنَا ﴿۱﴾

”یہ بات جان لیجئے، کہ ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر درج ذیل تین مسائل کو جاننا اور  
ان پر عمل کرنا واجب ہے۔“ پہلا مسئلہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے۔“

□ ﴿۲﴾ اور اس کی دلیل کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہم کو پیدا کیا ہے، سمعی و عقلی ہر دو طرح کی

موجود ہے ”سمعی“ دلائل تو بہت زیادہ ہیں: جن میں اللہ جل شانہ کے چند فرامین حسب ذیل ہیں:

(۱) ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ ثُمَّ أَنْتُمْ  
تَمُوتُونَ﴾ (الانعام: ۲)

”وہی ذات ہے جس نے تم کو (ابتداء میں) مٹی سے بنایا پھر (ہر ایک کی موت کا) وقت  
مقرر کیا، اور ایک وقت مقرر اس کے پاس ہے، پھر بھی تم شک کرتے ہو۔“

(ب) ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ﴾ (الاعراف: ۱۱)

”اور تحقیق ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم ہی نے تمہاری صورتیں بنائیں۔“

(ج) ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَءٍ مَسْنُونٍ﴾ (الحجر: ۲۶)

”اور تحقیق ہم نے ہی انسان (یعنی آدم) کو مڑی (جلی) کیچڑ کی کھکھنائی سیاہ مٹی سے پیدا کیا۔“

(د) ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ﴾ (الروم: ۲۰)

”اور اس (کی قدرت) کے نشانات میں سے یہ بھی ہیں کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا  
ہے، اس کے بعد تم اب انسان ہو کر ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہو۔“

(هـ) ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (الرحمن: ۱۴)

”اس (اللہ) نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے۔“

(و) ﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الزمر: ۶۲) ”اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔“

(ز) ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الصافات: ۹۶)

”اللہ نے تم کو اور جو تم عمل کرتے ہو (سب کو) پیدا کیا ہے۔“

(ح) ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۵۶)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے، کہ وہ میری عبادت کریں۔“..... اور ان کے علاوہ اس موضوع کی دیگر آیات کریمہ۔

اور جہاں تک اس موضوع پر عقلی دلیل کا تعلق ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہم سب کو پیدا کیا ہے، تو اللہ جل جلالہ کے اس فرمان میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے:

﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ﴾ (طور: ۳۵)

”یا کیا وہ بغیر کسی چیز کے خود ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود (ہی اپنے) خالق ہیں۔“

تو بلا شک و شبہ انسان نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا، اس لئے کہ وہ اپنے وجود سے پہلے عدم (نہ ہونے کے برابر) تھا، اور عدم سے مراد کوئی چیز نہیں ہے اور جو سرے سے کوئی چیز ہی نہ ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں نہیں لاسکتا، نہ تو اس کو، اس کے باپ نے پیدا کیا ہے، نہ اس کی ماں نے اور نہ مخلوق میں سے کسی اور نے (اسے وجود بخشا ہے) اور نہ یہ کہ وہ بغیر کسی موجد (وجود بخشنے والے) کے اتفاقی طور پر (اس صفحہ ہستی) پر آ گیا ہے، اس لئے کہ ہر حادث (دفعہ پذیر ہونے والے) کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی محدث بھی ہو اور اس لئے بھی کہ انتہائی انوکھے (پر رونق)، مربوط و مرتب، اور ایک دوسرے سے مانوس، نظام کائنات پر موجود (رنگا رنگ) مخلوقات اس بات سے کلی انکار کرتی ہے کہ (یہ سب کچھ محض) اتفاقیہ وجود میں آ گیا ہے، تو جب اتفاقیہ وجود میں آنے والی چیز اپنی ذات کے وجود کے اعتبار سے کسی صحیح نظام پر (قائم ہی) نہیں تو ایسی (بے اصل چیز) اپنی بقاء اور ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے آگے کی طرف کیسے چل سکتی ہے۔

لہذا اس مذکورہ کلام سے یہ بات متعین (یعنی ثابت) ہو گئی کہ اس کائنات کا خالق وہ ایک (یکتا) ذات اللہ ہی ہے، لہذا سوائے اللہ معبود برحق کے نہ کوئی اور خالق ہے اور نہ آمر (حکم

دینے والا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ ”خبردار رہو، اسی (ذات کے لئے) خلق ہے اور اسی کے لئے امر ہے۔“

اور یہ بات کسی کے علم میں نہیں کہ (آج تک) کسی نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ربوبیت (رب ہونے کی صفت) کا انکار کیا ہو۔ سوائے از روئے کبر و نخوت کے، جیسے فرعون کا معاملہ تھا اور جب حضرت جبر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو سورہ طور کی تلاوت فرماتے ہوئے سنا اور آپ (جب) اللہ جل شانہ کے اس فرمان پر پہنچے: ﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ، أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يَوقِنُونَ، أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصِيطِرُونَ﴾ (الطور: ۳۵ تا ۳۷)

”یا کیا وہ بغیر کسی چیز کے خود ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود (اپنے) خالق ہیں، یا آسمانوں اور زمینوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ (اللہ کی قدرتوں پر) یقین ہی نہیں رکھتے، کیا ان کے پاس آپ کی رب کی رحمت کے خزانے ہیں؟ یا یہ ان خزانوں پر حکم چلانے والے ہیں؟“

اور جبر بن مطعم ان دنوں مشرک تھے (جب انہوں نے یہ سنا) تو کہا: بہت قریب تھا کہ میرا دل اڑ جائے (یعنی اچھل کر حلق کو آ جائے) اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایمان نے میرے دل میں قرار پکڑا۔<sup>(۶)</sup>

وَرَزَقْنَا ۞ ..... اور ہم کو رزق (بہم) عطا فرمایا۔

□ ⑦ اس مسئلہ (کہ اللہ ہی ہم سب کا رازق ہے) کے اثبات پر کتاب و سنت (سے) سمعی و نقلیٰ اور عقلی بہت سے دلائل موجود ہیں: کتاب اللہ سے درج ذیل (چند) دلائل (پیش خدمت) ہیں:

(۱) ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ (الذاریات: ۵۸)

”بے شک اللہ خود ہی رزق دینے والا، بڑی قوت والا زبردست ہے۔“

(ب) ﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ﴾ (سبا: ۲۳)

”اے نبی! ان سے پوچھو، کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کہہ دو، کہ اللہ“

(ج) ﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ

الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾

(یونس: ۳۱)

”اے نبی! ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی

کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے

جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے، تو وہ (ضرور) کہیں گے کہ اللہ۔“

اور سنت رسول اللہ ﷺ سے دلیل، آپ ﷺ کا جنین (شکم مادر میں بچے) کے بارے میں

یہ فرمانا کہ اس کی جانب (اللہ کا) فرشتہ بھیجا جاتا ہے، جو چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے:

① اس کے رزق کے بارے

② اس کی مدتِ عمر کے بارے میں

③ اس کے (اچھے اور برے) عمل کے بارے میں

④ اس بارے میں کہ وہ بد بخت ہوگا یا کہ سعادت مند۔“ (۷)

اور جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے کہ اللہ ہی ہم کو رزق دیتا ہے، تو یہ اس لئے

کہ ہم بغیر کھائے اور پئے زندہ نہیں رہ سکتے اور کھانے اور پینے کی جملہ اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے

پیدا کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحَرَّوْنَ ۖ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ

نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۚ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۚ إِنَّا لَمَغْرُمُونَ ۚ بَلْ نَحْنُ

مَعْرُومُونَ ۚ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۚ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ

الْمُنزِلُونَ ۚ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ﴾ (الواقہ: ۶۳-۷۰)

”بھلا دیکھو! جو پیتے ہو، تو اس سے تم کھیتی اگاتے ہو یا (پھر اسے) اگاتے والے

ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھس بنا دیں، پھر تم باتیں ہی بناتے رہ جاؤ۔ کہ ہم پر تو ایسی چٹی

پڑ گئی، بلکہ ہمارے نصیب ہی پھوٹ گئے، بھلا دیکھو تو سہی، جو پانی تم پیتے ہو، کیا اسے بادل سے تم نے اتارا ہے یا اسے ہم اتارنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری بنا ڈالیں، پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟“

ان مذکورہ بالا آیات کریمہ میں اس بات کا بیان ہے کہ ہمارے کھانے اور پینے کے رزق کا انتظام واہتمام (صرف اور صرف) اللہ عزوجل کی جانب سے ہے۔

وَلَمْ يَتْرُكْنَا هَمَلًا ۝

”اور (اس اللہ نے) ہم کو شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا۔“

﴿ ۳۶ ﴾ یہ وہ حقیقت ہے جس پر سمعی و عقلی دلائل موجود ہیں:

قرآن حکیم سے سمعی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ، فَتَعَلَى اللَّهُ الْمَلِئُكُ

الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ﴾ (المؤمنون: ۱۱۵، ۱۱۶)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے ہاں لوٹ کر نہ آؤ گے، تو اللہ تعالیٰ بہت بلند شان والا ہے، وہی حقیقی بادشاہ ہے اس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ أَيْحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُنْ

نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ

وَالْأُنثَى ۝ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقْدِيرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ﴾ (القیامۃ: ۳۶-۳۷)

”کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ مٹی کی

ایک بوند نہ تھا جو ٹپکائی گئی تھی؟ پھر وہ تو ٹھٹھا ہو گیا، پھر اللہ نے اسے ٹھیک انسان بنا دیا، پھر اس

سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنا دیں، کیا وہ (ذات) اس بات پر قادر نہیں کہ پھر سے مردوں

کو زندہ کر دے۔“

☆ (اور اس مسئلہ کے اثبات میں ہم عقلی دلیل مندرجہ بالا آیات کریمہ کی روشنی میں یوں سمجھ سکتے ہیں) کہ اس دنیا میں انسانیت کے وجود کا زندہ ہونا پھر دیگر جانداروں کی طرح دنیوی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اور بعد ازاں جانوروں ہی کی طرح بغیر حساب و کتاب اور دوبارہ اٹھنے کے، ہمیشہ کے لیے مرجانا ایسا معاملہ ہے جو اللہ عزوجل کی ذات اور اس کی حکمت کے شایان شان نہیں، بلکہ یہ صرف ایک بے فائدہ اور بے کار کام ہوگا، لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کرہ ارضی پر اس مخلوق کو پیدا فرمائے اور ان کی ہدایت کے لیے ان کی طرف پیغمبر علیہم الصلاۃ والسلام بھیجے اور ہمارے لیے ان پیغمبروں کے منکرین اور مخالفین کا خون بہانا بھی مباح اور جائز قرار دے، پھر آخر میں اس سارے سلسلہ کار کا نتیجہ کچھ نہ ہو، تو ایسا ہونا اللہ عزوجل کی حکمت (کے خلاف ہی نہیں بلکہ) ناممکن ہے۔

بَلْ أَرْسَلْنَا رَسُولًا ﴿۱﴾  
 ”بلکہ اس نے ہماری طرف ایک پیغمبر بھیجا۔“

□ ﴿۱﴾ مطلب یہ کہ عزوجل نے ہم اس امت کے گروہ جو کہ امت محمدیہ ﷺ کہلاتی ہے کی طرف ایک پیغمبر مبعوث فرمایا، جو ہم پر ہمارے رب کی آیات تلاوت کرتے، ہمارا تزکیہ نفس کرتے اور کتاب و حکمت کی ہمیں تعلیم دیتے ہیں، جس طرح اس (اللہ تبارک و تعالیٰ) نے ہم سے پہلی امتوں کی طرف پیامبر بھیجے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَأَنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۳)

”اور کوئی امت ایسی ہی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہ آیا ہو۔“

اور یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرف سے اپنے پیغمبر بھیجتا تاکہ ایک تو ان پر اتمام حجت ہو اور دوسرے یہ کہ وہ اللہ (وحدہ لا شریک لہ) کی بندگی اس طریقے کے مطابق کریں (جس طرح اللہ کے پیغمبر ان کی راہنمائی کریں) اور جس طریقہ عبادت کو اللہ



تعالیٰ خود پسند کرتا اور اس سے راضی ہوتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا ۚ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِنَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾  
 ”اے محمد! بے شک ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف (بھی) وحی بھیجی اور ہم نے داود کو زبور دی اور ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے بول کر کلام کیا۔ یہ سب رسول (ﷺ) (لوگوں کو) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تھے، تاکہ ان رسولوں (ﷺ) کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت (عذر وغیرہ) باقی نہ رہے اور اللہ بڑا زبردست اور حکمت والا ہے۔“

اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم پیغمبروں (ﷺ) کا طریقہ اپنائے بغیر، اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت (بندگی) کر سکیں جس سے وہ راضی ہوتا ہے، اس لئے کہ یہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جنہوں نے یہ (کھول کھول کر) بیان کیا ہے کہ اللہ جل شانہ کس بات کو پسند کرتا ہے اور کس عمل سے وہ راضی ہوتا ہے اور کون سا عمل ہمیں اللہ عز وجل کی بارگاہ میں مقرب بنا دیتا ہے، پس اسی بناء پر یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ میں سے ہے کہ وہ مخلوق کی طرف (اپنی تیار کردہ نعمتوں کی) خوشخبری دینے والے اور (جہنم کی ہولناکیوں سے) ڈرانے والے پیغمبر مبعوث فرماتا اور اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ

أَخَذًا وَبَيِّنًا ﴿﴾ (المزمل: ۱۵، ۱۶)

”بلاشبہ ہم نے تمہارے پاس ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جیسے ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا۔ پھر فرعون نے رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اسے بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔“

فَمَنْ أَطَاعَهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ ﴿﴾

”تو جس شخص نے (اس رسول کی) پیروی کی وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

﴿﴾ ۳۱ ﴿﴾ یہ بات سچائی پر مبنی (فائدے کے اعتبار سے) اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرامین سے لی گئی ہے:

(۱) ﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (آل عمران: ۱۳۲، ۱۳۳)

”اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑ کر چلو، جس کا عرض (چوڑائی) آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ ان پر ہمیز گار لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔“

(ب) ﴿وَمَن يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَدْخُلْهُ جَنَّتِ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (النساء: ۱۳)

”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان (باغات) میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔“

(ج) ﴿وَمَن يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾  
”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اللہ سے ڈرے، اور اس کی نافرمانی سے بچتا رہے، تو ایسے ہی لوگ مراد کو پانے والے ہیں۔“ (النور: ۵۳)

(د) ﴿وَمَن يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾

”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے، تو ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ اور رفاقت کے اعتبار سے یہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔“ (النساء: ۶۹)

(ھ) ﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (الاحزاب: ۷۱)

”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے، تو حقیقت میں اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔“

اور اس موضوع پر (اور بھی) بہت سی آیات موجود ہیں۔

نیز اس ضمن میں حدیث رسولؐ یہ ہے: «كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى» فَقِيلَ وَمَنْ يَا أَبَى يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي دَخَلَ النَّارَ» اسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔<sup>(۸)</sup>

”میری ساری امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا“ تو آپؐ سے کہا گیا اور (اس سے) کون شخص انکار کرے گا، اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے جواب میں فرمایا: ”جس شخص نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی (اس نے انکار کیا اور) وہ اصل جہنم ہوگا۔“

وَمَنْ عَصَاهُ دَخَلَ النَّارَ ﴿۱﴾

”اور جس شخص نے (اس رسولؐ کی) نافرمانی کی وہ آتش (جہنم) میں داخل ہوگا۔“

اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا﴾ (الزمر: ۱۵، ۱۶)

”بلاشبہ ہم نے تمہارے پاس ایک رسولؐ تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جیسے ہم نے فرعون کے پاس ایک رسولؐ بھیجا تھا، پھر فرعون نے رسولؐ کی بات نہ مانی، تو ہم نے اسے بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔“

□۵۱ اور یہ بھی سچائی پر مبنی فائدے کی بات اللہ تعالیٰ کے ان فرامین سے لی گئی ہے:

(۱) ﴿وَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ (النساء: ۱۳)

”اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے اور اللہ کی حدود سے آگے نکل جائے اللہ اسے دوزخ میں داخل کرے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کرنے والا عذاب تیار ہوگا۔“

(ب) ﴿وَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ (الاحزاب: ۳۶)

”اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا، تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔“

(ج) ﴿وَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ قَاتٍ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا﴾ (الجن: ۲۳)

”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لیے جہنم کی آگ تیار ہے (اور) ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اور آنحضور ﷺ کی ماقبل میں مذکور حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے جس کے آخری یہ الفاظ ہیں: ﴿وَمَنْ عَصَانِي دَخَلَ النَّارَ﴾

”اور جس نے میری نافرمانی کی وہ آگ میں داخل ہوگا۔“

الثَّانِيَةُ: أَنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَى أَنْ يُشْرَكَ مَعَهُ أَحَدٌ فِي عِبَادَتِهِ

لَا مِلْكَ مُقَرَّبٌ، وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ، وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى:

﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (الجن: ۱۸)

”دوسرا مسئلہ: بے شک اللہ تعالیٰ اس بات سے راضی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کسی ایک کو اس کی عبادت میں شریک کیا جائے، نہ کسی (اللہ کی بارگاہ میں) مقرب فرشتے کو، اور نہ (اللہ کی طرف سے) بھیجے گئے نبی کو“ اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ”اور بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔“

□۵۲ یعنی ان مسائل میں سے جن کی بابت علم حاصل کرنا ہم پر واجب ہے، دوسرا مسئلہ

یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس بات سے (قطعاً) راضی نہیں ہوتا کہ اس کی عبادت میں کسی ایک کو شریک کیا جائے، بلکہ وہ یکتا (ایک ہی) ذات ہے، جو عبادت کی مستحق ہے، اور اس کی دلیل میں مؤلف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا ہے: ﴿وَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (الحج: ۱۸) ”اور بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔“..... تو اللہ نے اس بات سے روکا ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کسی کو پکارے، اور اللہ جل شانہ کسی ایسی چیز سے ہی منع کرتا ہے جس کے کرنے سے وہ راضی نہ ہو۔ اللہ عز وجل ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾ (الزمر: ۷)

”اگر تم کفر کرو، تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا، اور اگر تم (اس کی بارگاہ میں) شکر کرو، تو اسے وہ تمہارے لئے پسند کرتا ہے۔“

اور ارشاد باری ہے:

﴿فَإِنْ تَرَضُوا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ (التوبہ: ۹۶)  
 ”پس اگر تم ان (کفار و مشرکین) سے راضی ہو جاؤ گے تو اللہ ایسی فاسق قوم سے (کبھی) راضی نہ ہوگا۔“

لہذا کفر و شرک دونوں کے ارتکاب سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ راضی نہیں ہوتا، بلکہ اس نے رسولوں اور کتابوں کو (اہل دنیا کی طرف) اتارا ہی کفر و شرک کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کا (مکمل طور پر) خاتمہ کرنے کے لئے ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال: ۳۹)  
 ”اور ان (کفار و مشرکین) سے لڑو، یہاں تک کہ (زمین پر) فتنہ (شرک) نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔“

اور جب اللہ رب العزت کفر و شرک سے راضی نہیں، تو مؤمن پر یہ واجب ہے کہ وہ بھی ان

دونوں سے راضی نہ ہو، اس لئے کہ مومن کی رضا (خوشی) و غضب (نفرت) اللہ جل شانہ کی رضا اور نفرت کے تابع ہے، تو ایک مومن بھی اس چیز سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے اور اسی بات سے راضی ہوتا ہے، جس سے اللہ راضی ہوتا ہے تو اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کفر و شرک سے راضی نہیں ہوتا تو ایک مومن کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ ان دونوں (کفر و شرک) سے راضی ہو جائے اور 'شرک' کا تو معاملہ ہی بہت خطرناک ہے۔ اللہ عز و جل کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾

”بے شک اللہ کے ساتھ کسی کو (اگر) شریک کیا جائے تو یہ گناہ وہ کبھی معاف نہ کرے گا، اور اس کے علاوہ جو گناہ ہیں وہ جسے چاہے معاف کر دے۔“ (النساء: ۴۸)

اور فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا وَاكُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ (المائدة: ۷۲)

”تو جو شخص اللہ کے ساتھ شرک (کا ارتکاب) کرے، تو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا (ابدی) ٹھکانہ آتش جہنم ہے اور (ایسے) ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں۔“ اور نبی رحمت ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَقِيَ اللَّهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ لَقِيَ اللَّهَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ» ”جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے کہ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کرتا ہو، تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو شخص اس (اللہ) کے ساتھ کچھ بھی شرک کرتے ہوئے اسے ملے (یعنی شرک کی حالت میں اسے موت آئے) تو وہ (سیدھا) آتش جہنم میں داخل ہوگا۔“ (۹)

الثَّالِثَةُ: ③ أَنْ مَنْ أَطَاعَ الرَّسُولَ وَوَحَّدَ اللَّهَ لَا يَجُوزُ لَهُ مَوَالَاةٌ مِنْ حَادِّ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَلَوْ كَانَ أَقْرَبَ قَرِيبٍ، وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ... إِلَّا إِنْ حِزَّبَ اللَّهُ هُمْ الْمُفْلِحُونَ﴾ (البقرة: ۲۲)

تیسرا مسئلہ: ”جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے قول و عمل سے) یکتا ثابت کیا، اس کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ ایسے لوگوں سے راہ و رسم اور تعلقات رکھے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی رکھتے ہوں، خواہ وہ (شخص) دنیوی اعتبار سے کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔“

اور اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (المجادلة: ۲۲)

”تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں، جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے، اور ان (کے دلوں) کو اپنی طرف سے ایک روح (رحمت یا روح القدس) کے ذریعے سے قوت بخشی ہے، وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ وہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں، خبردار رہو، اللہ کی جماعت کے لوگ ہی کامیابی پانے والے ہیں۔“

□ ﴿۵۴﴾ یعنی ان جملہ تین مسائل میں سے، جن کے بارے میں جاننا ہم پر واجب ہے، تیسرا مسئلہ الولاء (یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقابلے میں کسی سے رشتہ ناطہ، راہ و رسم اور محبت پیار رکھنا) اور البراء (یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخالفین سے اللہ جل شانہ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر تعلقات منقطع کر لینا، خواہ وہ رجمی اور انتہائی قریب کا خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو) کا ہے۔ اور یہ ولاء و براء کا مسئلہ ہمارے دین میں ایک بنیادی اور بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کے بارے میں بہت سی نصوص (کتاب و سنت سے دلیلیں) وارد ہوئی ہیں، جن میں سے چند فرامین باری تعالیٰ درج ذیل ہیں:

① ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةِ مَنْ دُونَكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾

”اے ایمان والو! اپنے سوا کسی بھی غیر مسلم کو اپنا رازدار (دوست) نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی (دربادی) کے لئے کوئی کسر اٹھائیں رکھتے۔“ (آل عمران: ۱۱۸)

۲ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (المائدة: ۵۱)

”اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ، یہ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم میں سے کسی نے ان کو (اپنا) دوست بنایا تو وہ بھی انہیں میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔“

۳ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَافِرَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّكُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ (المائدة: ۵۷)

”اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ان میں سے اور (دیگر) کافروں میں سے ایسے لوگوں کو دوست نہ بناؤ، جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی مذاق بنا رکھا ہے، اور اگر تم مؤمن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو۔“

۴ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَأَخَوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ، قُلْ إِن كَانَ آبَاءُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَأَخَوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ (التوبة: ۲۳، ۲۴)

”اے اہل ایمان! اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دینے لگیں۔ تم میں سے جو ان کو (اس حالت میں) رفیق بنائیں گے، وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی! کہہ دو، کہ اگر تمہارے آباء (واجداد) اور تمہارے بیٹے (پوتے وغیرہ) اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور



تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

⑤ ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدَّثَا...﴾ (الممتحنة: ۴)

”تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے، جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے یہ صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے قطعی طور پر بیزار ہیں اور ان سے بھی جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو، ہم تمہارے (دین کے) منکر ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بے پریا ہو چکا، تا آنکہ تم اللہ کیلئے (اور یکتا) پر ایمان لے آؤ۔“

اور یہ اس لئے کہ جو شخص اللہ (اور اس کے رسول) کا مخالف ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ راہ و رسم اور محبت کا رشتہ قائم رکھنا، اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ اس انسان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان بہت کمزور ہے۔ اس لئے کہ یہ بات عقل کے ہی خلاف ہے کہ انسان کسی ایسی چیز سے محبت کرے جو اس کے محبوب کی دشمن اور مخالف ہو، اور (یہ بات بھی عین حقیقت ہے کہ) کافروں کے ساتھ راہ و رسم اور رشتے گانٹھنا اصل میں ان کی کفر و گمراہی پر مدد اور تعاون کے مترادف ہے، جس کفر و گمراہی میں وہ پڑے ہوئے ہوتے ہیں..... اور اسی طرح ان کے ساتھ محبت و الفت رکھنے کے اسباب وہی ہوں گے جن کو اپنانے سے محبت کا یہ رشتہ قائم ہوتا ہے (خواہ وہ اسباب کیسے ہی ہوں) لہذا آپ اس (شخص) کو ان کفار و مشرکین سے محبت و پیار رکھتے ہوئے ایسا پائیں گے کہ وہ اس تعلق کو پانے کے لئے ہر قسم کا ذریعہ اپنائے گا (اگرچہ وہ ناجائز ہی کیوں نہ ہو) اس کا ہدف صرف اور صرف اس سے محبت کے تعلق کا حصول ہے) اور یہ بات بلا شک و شبہ پورے ایمان یا کم از کم کمال ایمان کے منافی ضرور ہے، تو ہر مؤمن پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر اس شخص سے دلی نفرت اور دشمنی رکھے، جو اللہ اور اس

کے رسول ﷺ کا مخالف ہو، خواہ وہ شخص خونی رشتہ کے اعتبار سے اس کے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو، نیز اس سے وہ نفرت کرنے کے ساتھ ساتھ دوری بھی اختیار کرے (اور یہ بات بھی پیش نظر رکھے) کہ اس کی اس سے یہ نفرت اور دوری، اس کو نصیحت (خیر خواہی کی بات) اور دین حق کی طرف دعوت دینے سے نہ روکے۔“ (والله المستعان وعليه التكلان)

إِعْلَمْ ۞ أَرَشَدَكَ ۞ اللَّهُ لُطَاعَتِهِ ۞: أَنَّ الْحَنِيفِيَّةَ ۞  
 مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ ۞: أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ ۞ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۞  
 ”یہ بات بھی اچھی طرح جان لیجئے، اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی  
 طرف آپ کی راہنمائی فرمائے، کہ حنیفیت و ملت ابراہیمی یہ ہے کہ آپ  
 پورے اخلاص کے ساتھ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں.....“

□ ﴿۷۸﴾ إِعْلَمْ: (یہ بات) جان لیجئے، اور ’علم‘ کی بابت پہلے گفتگو گزر چکی ہے لہذا یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

□ ﴿۷۹﴾ الرُّشْدُ: (یعنی کسی بات کی طرف) راہ حق پر استقامت و ثابت قدمی اور راست بازی کے ذریعے راہنمائی پانا۔

□ ﴿۸۰﴾ الطَّاعَةُ: کسی چیز کی بابت جو حکم دیا گیا ہے، اس کو حکم دینے والے کی مرضی کے عین مطابق عملاً بجالانا اور اسی طرح جس چیز سے روکا گیا گیا ہو، اُسے روکنے والے کی مرضی کے مطابق ترک کر دینا۔

□ ﴿۸۱﴾ الْحَنِيفِيَّةُ: وہ ملت جو ’شُرک‘ سے تجاوز کرتے ہوئے اس سے ہٹ جائے، شرک کو کلی طور پر چھوڑ دے (شرک سے غایت درجے تک بیزار ہو جائے) اور (اس کا ہر عمل) اللہ عزوجل (کی رضا کے حصول) اور اس کے لئے اخلاص پر مبنی ہو۔

□ ﴿۸۲﴾ مِلَّةٌ: یعنی وہ دینی راستہ (طریقہ) جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چلے۔

□ ﴿۸۳﴾ إِبْرَاهِيمَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ عزوجل کے برگزیدہ پیغمبر اور خلیل (دوست)

ہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ (النساء: ۱۲۵)  
 ”اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو (اپنا) خلیل پکڑا۔“

☆..... حضرت ابراہیم علیہ السلام (کا لقب) ’ابوالانبیاء‘ ہے یعنی انبیاء علیہم السلام کے باپ (اور اسی طرح آپ جدّ الانبیاء و مجدد الانبیاء کے القابات سے بھی نوازے گئے) ہیں اور آپ علیہ السلام کی ملت، منج، راستہ اور دستور کا ذکر آپ علیہ السلام کی اقتداء اور پیروی کی غرض سے بہت سارے مقامات پر بار بار کیا گیا ہے۔

☐☐ ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ﴾: (یہ کہ تو ایک اللہ کی عبادت کرے)۔ اور ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ﴾ کے الفاظ اُن حرف مشبہ بالفعل (کی خبر بن رہے ہیں، جو کہ ترکیب میں ﴿أَنَّ الْحَنِيفِيَّةَ﴾ کی عبارت میں آیا ہے اور ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ﴾ سے پہلے کی عبارت ﴿الْحَنِيفِيَّةَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ﴾ اُن کا اسم اور مبتدا ہوئی (تو اس طرح یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہوا)۔

اور ’عبادت‘ کا عام مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے لئے غایت درجے کی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اس کی محبت اور عظمت سے سرشار ہوتے ہوئے، اس کے جملہ احکامات کو بجا لانا اور تمام منہیات و منکرات (جن امور سے اللہ نے منع فرمایا ہے) سے اجتناب کرنا، بالکل اس انداز اور طریقے کے مطابق، جو اس کی طرف سے آنے والی شریعتوں نے بیان کیا ہے۔

اور ’عبادت‘ کا خاص (یعنی مفصل) مفہوم شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے کہ: ’عبادت‘ نام ہے ان تمام ظاہری و باطنی (پوشیدہ) اقوال و اعمال کے مجموعے کا جن کی بجا آوری سے اللہ راضی ہوتا ہے اور ان کی عملاً انجام دہی کو اللہ پسند بھی کرتا ہے جیسے: خوف، خشیت (گریہ زاری اور پرہیز گاری عاجزی و انکساری کے ساتھ) توکل، نماز، زکوٰۃ، روزے اور دیگر شرائع اور انواع عبادت وغیرہ۔

☐☐ ﴿إِخْلَاصٌ﴾: سے مراد ہے تنقیہ یعنی کسی چیز کو کھرچ کر صاف ستھرا کرنا، اور یہاں مراد یہ ہے کہ انسان اپنی عبادت سے صرف اور صرف اللہ جل شانہ کی رضا کے حصول اور اس

کی معزز بارگاہ میں شرف باریابی کا متمنی (اور خواہشمند) ہو، کہ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے، اس کے ساتھ عبادت میں نہ کسی مقرب فرشتے کو شریک کرے اور نہ کسی (اللہ کی طرف سے) مبعوث نبی کو۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

① ﴿ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾  
 ”پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ کیسہ ہو کر (حضرت) ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو، اور وہ (ابراہیمؑ) مشرکوں میں سے نہ تھا۔“ (آل عمران: ۱۳۳)

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

② ﴿وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَبْنِي إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (البقرة: ۱۳۰، ۱۳۲)

”اور (حضرت) ابراہیمؑ کے دین سے تو وہی شخص نفرت کر سکتا ہے، جس نے خود اپنے آپ کو احمق (بے وقوف) بنا لیا ہو، بے شک ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں (اپنے کام کے لئے) چن لیا، اور آخرت میں بھی وہ نیکو کار لوگوں میں سے ہوں گے۔ جب ان کے پروردگار نے انہیں یہ فرمایا کہ ”فرمانبردار بن جاؤ، تو انہوں نے فوراً کہا: کہ میں جہانوں کے پروردگار کا فرمانبردار بن گیا ہوں۔ اور ابراہیمؑ نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی تھی اور یعقوبؑ نے بھی، انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: ”اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے، لہذا تم مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا۔“

وَبِذَلِكَ ③ أَمَرَ اللَّهُ جَمِيعَ النَّاسِ وَخَلَقَهُمْ لَهَا، كَمَا قَالَ تَعَالَى: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۵۶) ”کہ اسی بات کا اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو حکم دیا ہے اور اسی مقصد کے لئے اس (اللہ) نے انہیں پیدا فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری

عبادت (بندگی اور غلامی) کریں۔“

﴿ ۱۰ ﴾ وَبِذَلِكَ یعنی حنیفیت کے ساتھ (اور یہی ملت ابراہیمی کا شعار اور وصف ہے) اور حنیفیت، اللہ جل شانہ کو ایک مان کر اور صرف اسی کے لئے خالص ہو کر، صرف اسی کی عبادت کرنا ہے، اسی کام کا اللہ نے تمام لوگوں کو حکم دیا ہے اور اسی (مقصد کی تکمیل) کے لئے ان کو پیدا بھی کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ (الانبیاء: ۲۵)

”اور ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول بھیجا ہے، اس کو ہم نے یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے پس تم میری عبادت (بندگی) کرو۔“

اور ایک مقام پر اللہ جل شانہ نے اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں واضح طور پر یہ بیان فرما دیا ہے کہ ساری کی ساری مخلوقات صرف اسی غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری (ہی) عبادت کریں۔“ (پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو) (الذاریات: ۵۶)

وَمَعْنَى، يَعْبُدُونَ، يُوحِدُونَ ﴿ ۱۱ ﴾

”اور يَعْبُدُونَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ میری واحدانیت (یکانیت)

والوہیت (معبودیت) کو دل و جان سے تسلیم بھی کریں اور پھر قبول بھی۔“

﴿ ۱۲ ﴾ مطلب یہ ہے کہ ’توحید‘ عبادت ہی کے معنی و مفہوم میں ہے، وگرنہ آپ کی اطلاع

کے لئے عبادت کا مطلب پہلے بھی گزر چکا ہے اور ’عبادت‘ کا جس چیز پر بھی اطلاق ہوگا، وہ بہر صورت (معنی و مفہوم کی ادائیگی میں) توحید محض (خالی) سے عام ہوگی (یعنی جب ’عبادت‘ اور ’توحید‘ کا ذکر ایک ساتھ ہوگا تو ’عبادت‘ اپنے وسیع مفہوم میں عام اور اس کے بالمقابل ’توحید‘ اپنے خاص معنی میں مقید ہوگی)

..... اور یہ بات بھی جان لیجئے! کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں:

① ’کوئی عبادت‘ اور یہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی اُمور (جو لامحالہ پورے ہو کر رہتے ہیں نہ ان میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ ان میں انسان کو کوئی اختیار دیا گیا ہے، جیسے ہر ایک انسان کے لئے موت کا ذائقہ چکھنا خواہ وہ کافر ہو یا مومن وغیرہ) کے سامنے عاجزی و فروتنی اختیار کرنا ہے اور ’عبادت‘ کی یہ قسم تمام مخلوقات کو شامل ہے کوئی بھی اس سے نہ باہر نکل سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی مستثنیٰ ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَنِ عَبْدًا﴾ (مریم: ۹۳)  
 ”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب رحمن کے حضور بندہ (غلام) بن کر آئیں گے۔“  
 لہذا یہ ہر مومن، کافر، نیک اور بد انسان کو شامل ہے (کسی کو اس سے مفر نہیں)

② ’شرعی عبادت‘ اور یہ اللہ تعالیٰ کے امور شرعیہ کے سامنے (دل و جان سے) جھک جانا اور انہیں (اس کے حکم کے مطابق) بجالانا ہے، اور عبادت کی یہ قسم ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کرتے، اور جو کچھ انبیاء و رسل علیہم السلام ان کے پاس (اللہ کی طرف سے) لے کر آئے ہیں وہ ان کی اتباع (پیروی) کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (الفرقان: ۶۳)

”اور رحمن کے حقیقی بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں اور اگر جاہل ان سے مخاطب ہوں تو بس سلام کہہ کر (کنارہ کش رہتے ہیں)“

تو عبادت کی پہلی قسم کو بجالانے پر انسان کی تعریف نہیں کی جاتی (یعنی اجر و ثواب سے نہیں نوازا جاتا) اس لئے کہ وہ اسے کسی کام کا ارادہ و قصد کئے بغیر انجام دیتا ہے، لیکن بسا اوقات اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ثمرہ پر اسے تعریف سے نوازا اور اجر و ثواب بھی دیا جاتا ہے، جیسے خوشحالی میں اللہ کے حضور شکر کا اظہار اور تنگی اور مصیبت کے وقت صبر کرنا

وغیرہ، بخلاف عبادت کی دوسری قسم (شرعی عبادت) کے، کہ اس سے متعلقہ ہر عمل پر انسان کی مدح سرائی بھی ہوتی ہے اور اس کو اجر و ثواب بھی ملتا ہے (بشرطیکہ وہ عمل قبولیت کی شرائط کا حامل ہو) واللہ المستعان وعلیہ التکلیل

وَأَعْظَمُ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ التَّوْحِيدُ وَهُوَ: إِفْرَادُ اللَّهِ تَعَالَى بِالْعِبَادَةِ ۝  
 ”اور اللہ تعالیٰ نے جن امور کا حکم دیا ہے ان میں سب سے اہم اور ارفع و اعلیٰ  
 چیز ’توحید‘ ہے اور وہ ہر قسم کی عبادات صرف ایک اللہ کے لئے بجالانا ہے۔“

﴿۷﴾ ﴿۸﴾ توحید لغت میں وَحْدٌ یُوحَدُ (باب تفعیل) سے مصدر ہے، یعنی کسی چیز کو (عملاً) ایک بنانا اور ’توحید‘ پر بغیر نفی، (کسی چیز کے مکمل انکار) اور اثبات (کسی چیز کے مکمل اقرار) کے، پوری طرح عمل کرنا ناممکن ہے اور اس کے بغیر نہ ہی وہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یعنی اللہ ’واحد‘ کے سوا ہر ایک کے حکم کی مکمل نفی اور اسی طرح اس اللہ ’واحد‘ کے ہر حکم کا اثبات اور اقرار کرنا، مثال کے طور پر، اس کی وضاحت کے لئے ہم کہیں گے: ”کہ انسان کا عقیدہ توحید اس وقت تک مکمل اور صحیح نہیں ہو سکتا جب تک وہ (دل و جان سے) یہ گواہی نہ دے ”کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں“ تو اپنے اس اقرار سے وہ اللہ جل شانہ کے سوا سب کی الوہیت (معبودیت) کی نفی (انکار) کرنے لگا، اور ساتھ ہی عبودیت و یکتائی کے اسی وصف کو صرف اللہ جل شانہ کے لئے ثابت بھی کرے گا۔“

اور اصطلاح میں ’توحید‘ کی تعریف مؤلف (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ) نے ان الفاظ میں کی ہے: ”هُوَ إِفْرَادُ اللَّهِ تَعَالَى بِالْعِبَادَةِ“ یہ کہ تو ایک اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو کچھ بھی شریک نہ کرے، نہ کسی (مخائب اللہ) بھیجے گئے نبی کو، اور نہ کسی مقرب و برگزیدہ فرشتے کو، نہ کسی قوم کے سردار اور وڈیرے کو اور نہ کسی ملک کے بادشاہ کو اور نہ دیگر ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو، بلکہ تو اس (ذات برحق) کی محبت و عظمت سے سرشار اس کی طرف انتہا درجے کی رغبت رکھتے ہوئے اور ساتھ ہی اس کی ہیبت کو دل میں

سمائے ہوئے، اس کی عبادت و بندگی (غلامی) کے ساتھ اس کو ایک مانے اور ثابت کرے اور یہاں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے توحید کی وہ قسم مراد لی ہے، جس کی تحقیق و اثبات کے لئے رسولوں علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا، اس لئے کہ اسی ’توحید‘ کے بارے میں ان (انبیاء و رسل علیہم السلام) کی قوموں میں خلل اور نقص واقع ہوا اور اسی سے وہ برگشتہ ہوئے۔“

اور یہاں ’توحید‘ کی ایک عام تعریف بھی ہے، جو یہ ہے: (إِفْرَادُ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى بِمَا يَخْتَصُّ بِهِ) ”کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو ان چیزوں میں یکتا ماننا جو صرف اس کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔“

توحید کی مذکورہ بالا تعریفات کے تناظر میں، اس کی تین قسمیں ہوں گی۔

### توحید کی تین اقسام

#### ① توحید ربوبیت

کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو مخلوقات کی پیدائش میں، بادشاہی میں اور کائنات کی تدبیر کرنے میں یکتا ماننا (اور اپنے قول و فعل سے اسے ثابت بھی کرنا) اس پر درج ذیل فرامین باری تعالیٰ دلالت کرتے ہیں:

① ﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الزمر: ۶۲)..... ”کہ اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔“

② ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾

”کیا اللہ کے علاوہ کوئی (اور) پیدا کرنے والا ہے؟ وہ (اللہ) تو تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے (لہذا) اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ (فاطر: ۳)

③ ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (الملک: ۱)

”بابرکت ہے وہ ذات (اللہ تعالیٰ) جس کے قبضے میں (پوری کائنات کی) بادشاہی ہے اور

وہ ہر چیز پر (پوری) قدرت رکھنے والا ہے۔“

④ ﴿إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف: ۵۴)



”خبردار رہے! اسی (اللہ) کے لئے ہی مخلوق ہے اور (اسی کا) ہی حکم (چلتا) ہے، بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

## ② توحید الوہیت

کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو عبادت (کی جملہ انواع) میں ایک ماننا (اور یکتا ثابت کرنا) کہ انسان اللہ جل شانہ کے ساتھ (مخلوق میں سے) کسی ایک کو بھی اس طرح سے شریک نہ کرے کہ اس کی بندگی کرنے لگے اور اس کا قرب بھی حاصل کرنے کی جستجو کرنے لگے، بالکل اس طرح جس طرح وہ اللہ کی بندگی کرتا اور اس کا تقرب حاصل کرتا ہے۔ (المعین باللہ)

## ③ توحید اسماء و صفات

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو اس کے اسمائے حسنیٰ (ناموں) میں اور اسکی صفات علیا (ازلی صفاتوں) میں یکتا ماننا، جو نام اور صفات اس (باری تعالیٰ) نے اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں اپنی ذات کے ساتھ خاص کئے ہیں یا اپنے پیغمبر ﷺ کی زبان پر ان کا ذکر کیا ہے۔ توحید کی اس قسم کی تحقیق و اثبات کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے ان اسماء و صفات کا اثبات و اقرار، جن کو اس (ذات باری تعالیٰ) نے اپنی ذات کے لئے ثابت کیا ہے اور ہر اس چیز کی نفی و انکار کرنا جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں انکار کیا ہے، بغیر کسی قسم کی تحریف (اول بدل) کے اور بغیر تعطیل (صفات کو معطل کر دینے) کے اور اسی طرح بغیر تکلیف (اللہ کی صفات کی کنہہ اور حقیقت بیان کرنے) کے، اور بغیر تمثیل (اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کی طرف قرار دینے) کے۔“

اور (توحید کی ان اقسام میں) یہاں مولف رحمہ اللہ (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ) کی مراد ’توحید الوہیت‘ ہے اور یہی وہ توحید (کی قسم) ہے جس کے بارے میں مشرک لوگ گمراہ ہوئے، اور جن کے شرک کی بناء پر اللہ کے نبی ﷺ نے ان کا خون گرانا، ان کے اموال و اسباب لوٹنا، ان کی زمینوں کو ہتھیانا، اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنانا، مباح (اور جائز)

قرار دیا، نیز اللہ کے انبیاء و رسل علیہم السلام نے زیادہ تر، اپنی قوموں کو اسی توحید الوہیت کو ہی اپنانے اور اس پر کاربند رہنے کی سعی و جدوجہد کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (النحل: ۲۹)

”اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول (نبی) دعوت اور پیغام دے کر بھیجا، کہ (ایک) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (شیطان کی بندگی کرنے) سے بچو۔“

لہذا عبادت (کی کوئی قسم) اللہ عزوجل کے سوا کسی کے لئے بھی صحیح نہ ہوگی اور جس شخص نے توحید کی اس نوع (یعنی توحید الوہیت) کے سلسلے میں کمی و کوتاہی برتی یا اس سے تہی دامن ہوا، تو وہ مشرک کافر ہے، خواہ وہ ’توحید ربوبیت‘ اور ’توحید اسماء و صفات‘ کا اقرار کرتا ہو..... اور فرض کرو، کہ اگر کوئی آدمی توحید ربوبیت اور توحید اسماء و صفات کا مکمل اقرار کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ’قبر‘ کے پاس جا کر ’صاحب قبر‘ کی عبادت کرنے لگے یا اس کا تقرب حاصل کرنے کیلئے اس کے نام کی نذر دنیا دینے لگے تو ایسا شخص (اپنے اس عمل کی بنا پر) مشرک، کافر اور ہمیشہ کے لئے آتش جہنم میں جلا رہے گا، اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا وَاكُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ (المائدة: ۷۲)

”جو شخص اللہ سے شرک کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور ظالم لوگوں کا کوئی بھی (اس دن) مددگار نہ ہوگا۔“

جن امور کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، ان میں سب سے بڑھ کر اور اہمیت کی حامل، ’توحید‘ ہے، کیونکہ یہ وہ اصل (جڑ) ہے جس پر پورے دین کا انحصار ہے (اور اس بنیاد پر ہی پورے دین کی عمارت قائم ہے) اسی لئے اللہ کے نبی ﷺ نے، اللہ کے دین کی طرف دعوت کا آغاز اس بنیادی ’نکتہ توحید‘ سے کیا اور ہر ایک داعی و مبلغ کو بھی اپنی دعوت و تبلیغ کی ابتداء اسی دین کے بنیادی ’اصل‘ (جڑ) ’توحید‘ سے کرنے کا حکم دیا۔

وَأَعْظَمُ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ الشِّرْكَ، وَهُوَ دَعْوَةُ غَيْرِهِ مَعَهُ (جَلَّ وَعَلَا) وَالِدَلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ (النساء: ۳۶)  
 ”اور جن امور سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان میں سب سے بڑا شرک ہے، جو غیر اللہ کو اپنی پکار اور دعاء میں اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ شامل کر لینا ہے۔“ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”اور تم (سب) اللہ تعالیٰ کی عبادت (بندگی) کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔“

□ ⑤ یعنی جن امور سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان میں سب سے بڑھ کر (گناہ کے اعتبار سے) شرک ہے۔ (المعانی باللہ)

اور یہ اس لئے کہ جملہ حقوق میں سے سب سے بڑا حق اللہ عزوجل کا ہے تو جب انسان اللہ تعالیٰ کے اس حق میں کوتاہی اور کمی کا مرتکب ہوتا ہے، تو تحقیق اس نے سب سے بڑے حق کو تلف کیا اور مارا ہے اور وہ ہے اللہ عزوجل کی ’توحید‘..... اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (لقمان: ۱۳)..... ”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے“

اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا﴾  
 ”اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا اس نے بہتان باندھا، اور بہت بڑے گناہ کا کام کیا۔“ (النساء: ۴۸)

اور فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (النساء: ۱۱۲)  
 ”اور جس شخص نے کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں دور تک چلا گیا۔“  
 اور اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا وَاةَ النَّارِ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ (المائدة: ۷۲)

”جو شخص اللہ (تعالیٰ) سے شرک کرتا ہے، تو اللہ (تعالیٰ) نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور (اس دن) ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔“

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (النساء: ۴۸)  
 ”بے شک اللہ کے ساتھ اگر کسی کو شریک کیا جائے، تو یہ گناہ وہ کبھی معاف نہ کرے گا، اور اس کے علاوہ جو گناہ ہیں، وہ جس کے لئے چاہے معاف بھی کر دیتا ہے۔“

اور اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَعْظَمُ الذَّنْبِ أَنْ تَجْعَلَ لِلَّهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ» (۱۰)

”سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی شریک بنا لے، حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔“

صحیح مسلم حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَقِيَ اللَّهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ لَقِيَهِ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ» (۱۱)  
 ”جو شخص اللہ سے اس حال میں ملا کہ وہ اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کچھ بھی شرک نہیں کرتا (تو) وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جو اس (اللہ تعالیٰ) سے اس حال میں ملا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی شرک کرتا ہو (تو) وہ اصل جہنم ہوگا۔“

اور اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ نِدًّا دَخَلَ النَّارَ» (۱۲)

”جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ اللہ جل شانہ کے علاوہ (کسی اور کو) شریک (بنا کر اسے) پکارتا ہے (تو) وہ آتش جہنم میں جاگرا۔“ (العیاض باللہ)

اور مولف (امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ) نے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دینے اور شرک سے روکنے کی دلیل اللہ عزوجل کے اس فرمان سے لی ہے۔ ﴿وَأَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ ”اور تم اللہ تعالیٰ کی بندگی (عبادت) کرو، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو“.....

تو آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے (دو ٹوک انداز میں) اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور

اپنے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے سے منع کیا ہے۔ اور یہ واضح حکم اس یکتا ذات کی عبادت کے اثبات کو متضمن (اور شامل) ہے تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرے، وہ کافر اور متکبر ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے علاوہ کسی اور مخلوق کی بھی عبادت کرنے لگے تو ایسا شخص کافر مشرک ہوگا۔ (العیاذ باللہ) اور ان کے برعکس جو شخص صرف ایک اللہ کی بندگی کرتا ہے وہ خالص مسلمان ہے۔“ (الْمُسْلِمُ اِمْلَعْنَا مِنْهُمْ)

### اور شرک کی دو بڑی قسمیں ہیں

① شرک اکبر (بڑا شرک) ② شرک اصغر (چھوٹا شرک)

**پہلی قسم:** بڑا شرک ہے اور یہ وہ شرک ہے جو انسان کو اس کے دین (اسلام) سے نکال باہر کرتا ہے۔ یعنی شارع (ﷺ) نے اس کا اطلاق 'شرک اکبر' پر کیا ہو تو ایسا عمل سراسر اصل ایمان کے منافی ہے۔ (العیاذ باللہ)

**دوسری قسم:** چھوٹا شرک ہے اور یہ ہر اس قولی و فعلی عمل کو کہتے ہیں کہ شرع (شریعت طاہرہ) میں اس کو 'وصف شرک' (شرک کی صفت) کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہو اور شرک کی یہ قسم انسان کو ملت اسلامیہ (یعنی دین اسلام) سے باہر نہیں نکالتی (مگر اس اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے کہ بار بار 'شرک اصغر' کے ارتکاب سے انسان 'شرک اکبر' تک جا پہنچتا ہے اور پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بسا اوقات اپنے دین سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، جبکہ اسے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ (العیاذ باللہ) لہذا ہر انسان پر یہ لازم ہے کہ وہ چھوٹے اور بڑے ہر دو قسم کے شرک سے مکمل محتاط رہے، اس لئے کہ اللہ جل شانہ نے جو یہ فرما دیا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ﴾ (النساء: ۴۸) ”بے شک اللہ تعالیٰ کے ساتھ اگر شرک کیا جائے تو وہ یہ گناہ کبھی معاف نہ کرے گا... آیت“ (آیت ہذا میں مطلق شرک کے گناہ اور اس پر وعید کا ذکر ہوا ہے، چھوٹے اور بڑے شرک کا کہیں اشارہ تک نہیں ہے۔ مترجم) اسے خوب اور اچھی طرح سمجھ لو!

پہلی اصل

## معرفة العبد ربه

(بندے کا اپنے رب کو پہچانا)

فَإِذَا قِيلَ لَكَ: مَا الْأُصُولُ ① الثَّلَاثَةُ الَّتِي يَجِبُ عَلَى الْإِنْسَانِ مَعْرِفَتُهَا؟  
فَقُلْ مَعْرِفَةُ الْعَبْدِ رَبَّهُ ② وَدِينَهُ ③ وَنَبِيِّهِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ④  
”اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ وہ کون سے تین اصول ہیں، جن کی معرفت حاصل کرنا ہر انسان  
پر واجب (اور ضروری) ہے، تو آپ یہ کہیے: ① بندے کا اپنے رب (پروردگار) کی بابت  
معرفت حاصل کرنا، ② اپنے دین کی (حقیقت کی بابت) پہچان حاصل کرنا، ③ اپنے نبی  
حضرت محمد ﷺ کی ذات و رسالت کی معرفت حاصل کرنا۔

□ ① الْأُصُول: اصل کی جمع ہے اور اصل (جڑ) سے مراد یہ ہے کہ جس پر کسی دوسری  
چیز کی اساس (بنیاد) رکھی جائے اور اسی سے یہ جملہ ہے (أصل الجدار) یعنی دیوار کی  
بنیاد (جس پر پوری دیوار چنی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے (أصل الشجرة) یعنی درخت  
کی جڑ، جس سے باقی ساری شاخیں اور ٹہنیاں پھوٹی ہیں اور اسی پر قائم رہتی ہیں۔ اور اس  
مفہوم کی مزید وضاحت اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً  
طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ (ابراہیم: ۲۴)

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ’کلمہ طیبہ‘ کی کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال  
ایسی ہے، جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور اس کی  
شاخیں (بلندی میں) آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔“

اور یہ وہ تین اصول ہیں، جن کا ذکر کر کے مصنف (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ) نے

حقیقت میں ان تین بنیادی سوالات کی جانب اشارہ کیا ہے، جن کے بارے میں ہر انسان سے اس کی قبر میں پوچھا جائے گا، کہ مَنْ رَبُّكَ؟ تیرا رب کون ہے؟، مَا دِينُكَ؟ کہ تیرا دین کیا ہے؟ اور مَنْ نَبِيُّكَ؟ کہ تیرا نبی کون ہے؟

﴿۵﴾ پھر مؤلف (رحمہ اللہ) نے، اس اہم مسئلہ کو ’صیغہ سوال‘ (یعنی فَإِذَا قِيلَ لَكَ کے الفاظ) کے ساتھ ذکر کر کے واضح کیا ہے اور یہ اس غرض سے، تاکہ ہر انسان اس بارے میں زیادہ سے زیادہ ہوشیار اور متنبہ ہو جائے، کیونکہ یہ سوال بہت ہی گراں ہے اور دین کا بڑا اصول بھی ..... تو گویا مصنف (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ! اپنی اس تحریر سے یہ پیغام دیتے ہوئے) کہہ رہے ہیں:

”کہ یہی وہ تین اصول ہیں جن کے بارے میں معرفت حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب اور ضروری ہے، اس لئے کہ یہ ہی وہ تین بنیادی سوالات ہیں، جن کی بابت ہر آدمی اپنی قبر میں پوچھا جائے گا (تو) جب مرنے والا اپنی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے اور اس کے خاندان کے لوگ اور ساتھی اس سے پھرتے ہیں تو (ساتھ ہی) اس کے پاس دو فرشتے (منکر اور نکیر) آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھنا شروع کر دیتے ہیں: کہ تیرا رب کون ہے؟، تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟ تو مومن شخص جواب میں یہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام ہے اور میرا نبی حضرت محمد ﷺ ہے، اور اگر جواب دینے والا ان امور کے سلسلے میں شاکی یا منافق ہو (العیاذ باللہ) تو وہ آگے سے کہے گا، ہائے ہائے! میں نہیں جانتا، عام لوگوں کو جو کہتے ہوئے سنتا تھا، میں بھی وہی کچھ کہہ دیتا تھا۔“

اور اللہ تعالیٰ کی معرفت درج ذیل اسباب سے حاصل ہوتی ہے:

﴿۶﴾ اللہ عزوجل کی مخلوقات میں تامل اور غور و فکر کرنا: تو یہ ’غور و فکر‘ انسان کو اللہ عزوجل

کی حقیقی معرفت، اس کی عظیم سلطنت (اور بادشاہی) نیز اس کی پوری قدرت و حکمت اور رحمت کی انتہا کو پانے اور پہچاننے میں مدد و معاون ثابت ہوگا، دلیل اور وضاحت کے طور پر درج ذیل فرامین باری تعالیٰ کافی ہوں گے۔

① ﴿أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ﴾  
 ”کیا ان لوگوں نے زمین و آسمان کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا، اور کسی چیز کو بھی، جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟“ (الاعراف: ۱۸۵)

② ﴿إِنَّمَا أَعْظَمُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْفًى وَفَرَادًى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا﴾  
 ”(آپ ان سے کہئے) کہ: میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور تم دو دوئل کر اور اکیلے اکیلے رہ کر (اس کے بارے) خوب سوچو!“ (سبا: ۴۶)

③ ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۰)

”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات اور دن کے باری باری آنے جانے میں اہل عقل کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔“

④ ﴿إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (یونس: ۶)

”یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (غلط بنی و غلط روی سے) پہچنا چاہتے ہوں۔“

⑤ ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (البقرة: ۱۶۴)

”جو لوگ کچھ سوچتے سمجھتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات اور دن کے ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں، جو لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لئے سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، (نیز) اللہ تعالیٰ کے آسمان سے بارش نازل کرنے میں



جس سے وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے، اور اس میں ہر طرح کی جاندار مخلوق کو پھیلا دیتا ہے اور (اسی طرح) ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں، جو زمین و آسمان کے درمیان تابع فرمان ہیں، بے شمار (اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کی) نشانیاں ہیں۔“

□۳۰ اللہ جل شانہ کی شرعی آیات بینات میں غور و فکر کرنا بھی بندے کا اپنے حقیقی

پروردگار کی معرفت کے حصول کے اسباب میں سے ایک سبب ہے (کہ انسان اپنے رب کی پہچان کے لئے ان شرعی آیات میں تامل و تدبر کرے) اور یہ شرعی آیات وہ وحی الہی ہے جو انبیاء و رسل، اللہ جل شانہ کی جانب سے (بذریعہ جبریل الامین علیہ السلام) اپنی اپنی اقوام اور امتوں کے پاس) لائے ہیں، لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ ان آیات بینات (یعنی روشن دلائل) میں گھس کر پوری توجہ اور یکسوئی سے ان میں موجود بڑی بڑی مصلحتوں (اور ان لامتناہی فوائد) میں غور و خوض کرے کہ جن کے بغیر دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں مخلوق کی زندگی (معمولی وقت کے لئے بھی) قرار نہیں پکڑ سکتی (اور نہ یہ گردش زمانہ ایسے مربوط اور منظم انداز سے جاری رہ سکتا ہے) تو جب وہ ان آیات شرعیہ (وحی الہی) میں پوری طرح غور و فکر کرے گا اور جس علم و حکمت (کے موجزن سمندر) پر یہ آیات مشتمل ہیں، ان میں تامل و تدبر بھی کرے گا، اور ساتھ ہی وہ ان کو اللہ کے بندوں کے مصالح و فوائد کے عین موافق اور ان کے مطابق پائے گا، تو اس پر اس کے پروردگار کی معرفت اور حقیقت پوری طرح عیاں ہو جائے گی (اور ان آیات میں اس کا غور و خوض ہی اس کے رب کی معرفت کے لئے کافی ہوگا) جیسا کہ اللہ عز و جل نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ (النساء: ۸۲)

”کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر (اور غور و خوض) نہیں کرتے اور اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا

کسی اور کی طرف سے (نازل) ہوتا تو یہ اس میں ضرور بہت تفاوت (اختلاف) پاتے۔“

اللہ جل جلالہ کی معرفت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ عز و جل ایک مؤمن

کے دل میں اپنی معرفت کی شمع روشن کر دیتا ہے یہاں تک کہ یہ مومن کی اپنے رب کے بارے میں معرفت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ گویا وہ اسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور اسی حقیقت کی طرف راہنمائی اللہ کے نبی ﷺ کے اس فرمان میں بھی ہے، جب آپ ﷺ سے حضرت جبریل روح الامین نے پوچھا کہ: «مَا الْإِحْسَانُ؟» کہ (اے اللہ کے رسول) احسان کیا ہے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»<sup>(۱۳)</sup> ”کہ تو اللہ کی عبادت اس انداز سے کرے، جیسے تو اس کو دیکھ رہا ہو اور اگر تو اس کو نہ دیکھ رہا ہو تو (کم از کم معرفت اور قربت کا یہ درجہ ضرور ہونا چاہئے) کہ وہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“

مطلب یہ کہ معرفت کے تین اصولوں میں سے دوسرا اصول دین اسلام کی معرفت ہے، جس پر عمل کرنے کا مسلمان کو مکلف اور پابند کیا گیا ہے اور جو حکمت و رحمت اور مخلوق کی مصلحتوں اور منافع کا منبع و سرچشمہ اور مفسد و مضرت سے بچاؤ کا ضامن ہے تو جس شخص نے بھی (حقیقت پسندی کے ساتھ) اور وحی الہی (کتاب و سنت) پر مبنی خالص تعلیمات کے مطابق اس دین اسلام میں تامل و تدبر کیا، وہ بہر صورت معرفت کے اس درجے پر پہنچ کر رہے گا کہ یہ دین، برحق (یعنی سچا) ہے اور مخلوق کے مصالح و منافع اس کو اپنائے بغیر حاصل کرنا ناممکن ہیں اور ہمیں کسی طرح سے بھی اس (دین اسلام) کو آج کے مسلمانوں کے (ظاہری) کردار و اعمال پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ آج کے ان مسلمانوں نے دین حق کی بہت سی تعلیمات و شعائر میں کوتاہی (برتنے ہوئے انہیں پامال کیا) ہے اور اس بارے میں بہت بڑے جرائم (اور حدود کو توڑنے) کے مرتکب ہوئے ہیں، یہاں تک کہ بعض اسلامی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنے والا شخص اپنے آپ کو غیر مسلموں (کافروں) کے ماحول میں رہتے محسوس کرتا ہے۔

اور دین اسلام (الحمد للہ تعالیٰ) ان تمام مصلحتوں اور منافع کو بھی شامل ہے، جو پہلے ادیان

و مذاہب میں پائے جاتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ان سے اس اعتبار سے امتیازی شان رکھتا ہے کہ یہ دین ہر دور میں، ہر علاقے اور جگہ میں، ہر اُمت کے طبقہ میں درست اور قابل عمل ہے (گویا کہ یہ ایک کامل، جامع، ہمہ گیر اور عالمگیر دین ہے) اس دین کے ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر اُمت کے لئے درست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کے ساتھ وابستگی اور اس پر عمل، کسی بھی دور یا علاقے کے لوگوں کے مصالح و مقاصد سے ٹکرا نہیں سکتا۔ (بلکہ اس کے برعکس ان سے مکمل طور پر ہم آہنگی رکھتا ہے) اور یہ دین اسلام ہر اچھے عمل کا حکم دیتا اور ہر برائی سے منع کرتا ہے، ہر اچھی عادت کو اپنانے کی ترغیب دیتا اور ہر قسم کی اخلاقی پستی کی مذمت کرتا ہے۔

□۵ یہ ہے وہ تیسرا اصول اور وہ یہ کہ ”انسان کا اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں حقیقی معرفت حاصل کرنا، اور یہ معرفت، نبی رحمت ﷺ کی حیات طیبہ کو پڑھنے اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلو، خاص طور پر آپ کی عبادت و ریاضت، حسن اخلاق، اللہ جل شانہ کے دین کی طرف دعوت و تبلیغ اور اللہ کی راہ میں جہاد و قتال وغیرہ پر گہرے غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے، لہذا ہر وہ انسان جو اپنے نبی مکرم ﷺ کی ذات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معرفت اور آپ پر پختہ ایمان اور آپ سے گہری وابستگی کا متمنی ہو، تو اسے آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے جملہ روشن پہلوؤں کا مطالعہ کرنا چاہئے اور جہاں تک اس کے لئے (ممکن) ہو سکے وہ آپ کی حیات طیبہ کے تمام احوال جیسے جنگ، امن، جنگی، خوشحالی، سختی اور آسانی میں آپ کے رویوں پر بھی نظر رکھے۔ ہم اللہ عز و جل کے حضور دعاء گوئیں کہ وہ ہمیں ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے اپنے پیغمبر ﷺ کے (صحیح) پیروکاروں میں سے کر دے، اور اسی حالت پر ہی ہمیں موت دے، بے شک وہ ذات آپ کی مددگار اور اس دعاء کی قبولیت پر قادر مطلق ہے۔

فَإِذَا قِيلَ لَكَ: مَنْ رَبُّكَ؟ قُلْ: رَبِّيَ اللَّهُ الَّذِي

رَبَّنِي وَرَبِّي جَمِيعَ الْعَالَمِينَ بِنِعَمِهِ ②

”اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کا رب (پروردگار) کون ہے، تو آپ (جواب میں) کہہ دیجئے: کہ میرا رب اللہ ہے، جس نے اپنی (لامتناہی) نعمتوں کے ساتھ میری اور تمام جہانوں کی پرورش کی۔“

① یعنی سوال یہ کیا جائے کہ کون ہے تیرا وہ رب جس نے تجھ کو پیدا کیا، تیری فریادری اور مدد کی، تجھے پوری طرح اور مکمل تیار کیا اور تجھے بہم رزق عطا کیا؟

② لفظ التربية یہ الرعاية (جملہ امور میں دیکھ بھال اور نگرانی کرنا) سے عبارت ہے اور اس سے مراد، انتظامی امور کی وہ نگرانی ہے کہ جس کے ذریعے المربی (جس کی تربیت کی جا رہی ہو) کی صحیح اور درست سمت میں تربیت کی جائے، اس کے ہر نقص کو ختم اور ہر ٹیڑھے پن کو سیدھے رخ پر کر دیا جائے، (یہ تقویم المربی کا مفہوم ہے)..... اور

یہاں مولف (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ!) کا کلام یہ باور کراتا ہے کہ: لفظ (الرب) ’التربية‘ مصدر سے ماخوذ (لیا گیا) ہے، کیونکہ امام موصوف کا قول یہ ہے: (الَّذِي رَبَّنِي وَرَبِّي جَمِيعَ الْعَالَمِينَ بِنِعَمِهِ)، تو اس طرح کائنات میں جتنے جہان ہیں ان سب کی اللہ ہی نے اپنے فضل و کرم سے تربیت و پرورش فرمائی اور جس مقصد کے لئے انہیں پیدا کیا، اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہیں تیار کیا اور ان کی بقاء و سلامتی کے لئے اپنے وافر رزق سے ان کی مدد فرمائی، اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مابین ہونے والی گفتگو (کے بارے) میں ارشاد فرمایا: ﴿فَمَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾ (طہ: ۴۹، ۵۰)

”فرعون کہنے لگا: ”اچھا، تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ نے جواب دیا:

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو (سیدھا) راستہ بتایا۔“

لہذا ان تمام جہانوں میں موجود ہر ایک مخلوق کو اللہ عزوجل نے ہی اپنے فضل و کرم سے پروان چڑھایا، اور اس کی تربیت و پرورش فرمائی ہے..... نیز اللہ عزوجل کی اپنے بندوں پر بے بہا اور بے شمار نعمتیں ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ (النحل: ۱۸)

”اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی (عطا کردہ) نعمتوں کو شمار کرو، تو تم ان کو شمار نہ کر سکو گے۔“

اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے (اے انسان) تجھ کو پیدا کیا، تجھے (حقیقی مقاصد کی تکمیل کے لئے درست اور) تیار کیا، تجھے ہر طرح کی مدد دی اور تیری فریاد رسی کی اور (پھر) تجھے رزق عطا فرمایا، لہذا وہی اکیلی ذات بندگی (اور عبادت) کی مستحق ہے۔

وَهُوَ مَعْبُودِي لَيْسَ لِي مَعْبُودٌ سِوَاهُ ۖ وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الفاتحہ: ۲)

”اور وہ اللہ ہی میرا معبود (برحق) ہے، اس کے علاوہ میرا اور کوئی معبود نہیں اور اس کی ربوبیت والوہیت (معبودیت) کی دلیل، اس کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب (پروردگار) ہے۔“

□ ۸ مطلب یہ کہ ایک اللہ ہی وہ ذات ہے جس کی میں بندگی کرتا ہوں، اور اسی ذات کی خاطر گریہ زاری کرتے ہوئے، اسی کی محبت میں سرشار اور اسی کی عظمت کے گن گاتے ہوئے، اسی کے آگے عاجزی اور فروتنی کرتے ہوئے جھکتا ہوں، میں وہی کام کروں گا، جس کا وہ مجھے حکم دے گا اور اس کام سے باز رہوں گا جس سے وہ مجھے روک دے گا، تو میرے لئے اللہ عزوجل کی ذات کے سوا اور کوئی (ایسی ذات ہے ہی) نہیں کہ جس کی بندگی (اور غلامی) کا سہرا میں اپنی جبین پر سجالوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ (الانبیاء: ۲۵)

”اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا، اس کی طرف ہم بھی وحی کرتے رہے، کہ

میرے سوا کوئی اللہ (معبود برحق) نہیں لہذا، تم صرف میری ہی عبادت کرو۔“ ..... اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ﴾ (البینۃ: ۵) ”اور انہیں تو یہی حکم دیا گیا تھا کہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی مکمل حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں پوری طرح یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی درست دین ہے۔“

□ ﴿۹﴾ مولف رحمہ اللہ نے اس بات کی دلیل کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ساری مخلوق کا پالنے والا ہے، اللہ جل شانہ کے اس فرمان سے لی ہے: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الفاتحہ: ۲) ”کہ ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب (پروردگار) ہے۔“ مطلب یہ کہ ہر طرح کے کمال، ہر طرح کی بزرگی، اعلیٰ شان، اور عظمت کا وصف اللہ واحد کے لئے سزاوار ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِينَ: یعنی لامتناہی نعمتوں (اور اپنے فضل و کرم) سے تمام جہانوں کی پرورش کرنے والا، ان کو پیدا کرنے والا ہے، ان کا مالک ہے اور ان کے جملہ امور کی اپنی مرضی اور مشیت کے مطابق تدبیر کرنے والا ہے۔

وَكُلُّ مَا سِوَى اللَّهِ عَالَمٌ وَأَنَا وَاحِدٌ مِنْ ذَلِكَ الْعَالَمِ ﴿۱۰﴾

(اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ایک عالم (جہان)

ہے، اور میں اس عالم کا ایک فرد ہوں۔“

□ ﴿۱۰﴾ اللہ جل شانہ کی ذات کے علاوہ ہر چیز ایک عالم (جہان) ہے اور انہیں عالم کا نام اس لئے دیا گیا ہے، کہ وہ اپنے حقیقی خالق، مالک اور مدبر کے وجود پر علم (بڑی علامت اور نشانی) کی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہان کی ہر چیز میں ایک ایسی نشانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی واحدانیت پر دلالت کرتی ہے اور میں بھی اس جہاں میں ایک ایسا فرد ہوں جو اللہ

رب العلمین کی ربوبیت کا قائل ہوں اور اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ جب اللہ واحد میرا رب ہے تو مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں اس یکتا ذات کی بندگی اور غلامی کروں۔

فَإِذَا قِيلَ لَكَ بِمَ عَرَفْتَ رَبَّكَ؟ فَقُلْ بِآيَاتِهِ وَمَخْلُوقَاتِهِ<sup>⑩</sup>  
 ”اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے کہ آپ نے اپنے رب کو کس چیز کے ذریعے  
 پہچانا تو کہہ دیجئے کہ اس کی آیات (نشانیوں) اور مخلوقات کے ذریعے سے پہچانا۔“

□ ⑩ یعنی جب آپ سے یہ سوال پوچھا جائے: کہ کس چیز کے ذریعے آپ نے اللہ عزوجل کو پہچانا؟ تو آپ اس سوال کے جواب میں یہ کہئے: ”کہ میں نے اس کی معرفت اسی کی آیات بینات (روشن دلائل) اور اس کی مخلوقات کے ذریعے حاصل کی۔“

□ ⑪ الآیات: ’آیۃ‘ کی جمع ہے اور یہ ہر چیز کی اس علامت (اور نشانی) کو کہتے ہیں، جو اپنی اس متعلقہ چیز پر دلالت بھی کرتی ہے اور اس کی وضاحت بھی کرتی ہے“..... اور

اللہ تعالیٰ کی آیات کی دو بڑی قسمیں ہیں: ① کوئی آیات ② شرعی آیات  
 ’کوئی آیات‘ سے مراد اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ساری مخلوقات ہیں اور ’شرعی آیات‘ وہ ’وحی‘ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر اتاری تو اس اعتبار سے مؤلف (شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ) کا یہ قول (بِآيَاتِهِ وَمَخْلُوقَاتِهِ) نحو کے اس قاعدے ”عَطْفُ الْخَاصِّ عَلَى الْعَامِّ“ (یعنی خاص چیز کا عطف عام پر) کے مطابق ہوگا، جب ہم ’آیات‘ سے مراد ایک ساتھ آیات ’کونیہ‘ اور آیات ’شرعیہ‘ لیں۔ (کیونکہ مجرد ’آیات‘ میں ’مخلوقات‘ اور ’وحی‘ دونوں شامل ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ آیات ’کونیہ‘ ’مخلوقات‘ ہیں، اور آیات ’شرعیہ‘ ’وحی‘ الہی ہیں۔ لیکن دوبارہ ’آیات‘ کے بعد ’مخلوقات‘ کا ذکر گویا کہ ’خاص‘ کا عطف عام پر ہوا اس لئے کہ عبارت ہذا میں بِآيَاتِهِ عام ہے اور بعد میں دوبارہ مَخْلُوقَاتِهِ کے الفاظ خاص ہوئے)

[یا] پھر اس عبارت میں عطف مباین و مغایر ہے۔ (یعنی جو دو مختلف النوع چیزوں

کا ایک دوسرے پر عطف ہوتا ہے تب یہاں عام اور خاص والی بات نہیں) اور یہ اس وقت ہوگا جب ہم عبارت ہذا (بِآيَاتِهِ وَمَخْلُوقَاتِهِ) میں 'آیات' سے مراد صرف 'آیات شرعیہ' یعنی 'وحی الہی' لیں اور پھر بعد میں 'مخلوقات' کے ذکر سے دونوں میں عطف تباین صاف ظاہر ہے۔ "بہر صورت اللہ عزوجل کی ذات جلیلہ اپنی پیدا کردہ کوئی آیات سے پہچانی جاتی ہے اور یہ وہ بڑی بڑی مخلوقات ہیں جو اللہ جل شانہ کی قدرتوں کے عجائبات، اس کی کارگیری اور کامل علم اور بالغ حکمت کے عظیم شاہکار ہیں۔ اور اسی طرح وہ 'ذات الہی' اپنی 'شرعی آیات' (یعنی وحی) کی تاثیر اور اس کی انوار و تجلیات سے بھی پہچانی جاتی ہے جو سراسر اور بھرپور انداز سے ایک کامل نظام عدل کے مصالح و منافع کے حصول اور مفاسد و مضرات کے سد باب پر مشتمل ہے۔ اور بقول شاعر: ج

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهُ آيَةٌ  
نَذِيرٌ عَلَىٰ أَنَّهُ وَاحِدٌ

”اور کائنات (کے ذرے ذرے سے لے کر آسمانوں کی وسعتوں تک) کی ہر چیز میں اس اللہ (واحد کی قدرتوں) کی نشانی پنہاں ہے، جو کہ اس ذات کے یکتا (اکیلا) ہونے پر (بھی) دلالت کر رہی ہے۔“

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، وَمِنْ مَخْلُوقَاتِهِ  
السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ السَّبْعُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَمَا بَيْنَهُمَا ۝

”اور اس (اللہ جل شانہ، کی معرفت) کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند کا وجود ہے اور اس کی (جملہ) مخلوقات میں سے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ہیں، اور جو کچھ ان سب کے اندر اور ان کے مابین (درمیان) ہے۔“

□ۛ تو یہ سب کی سب اللہ جل شانہ کی (پیدا کردہ مخلوقات کی) نشانیاں ہیں، جو اس کی کمال قدرت، کمال حکمت اور کمال رحمت پر دلالت کرتی ہیں تو ان بڑی آیات میں سے ایک



سورج ہے جو اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا عظیم شاہکار ہے، وہ اس طرح کہ جب سے اللہ عزوجل نے اسے پیدا کیا ہے، اس وقت سے لے کر (آج تک بلکہ اس سے بھی آگے) اس دن تک جب اللہ تعالیٰ اس کائنات کو برباد کر دے گا، ایک انتہا درجے کی حد تک منظم و مربوط اور انتہائی انوکھے اور دلکش انداز کے ساتھ اپنے اس راستے پر (اور محور کے گرد) گامزن ہے جو اس کے لئے (شروع سے) مقرر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ (یسین: ۳۸)..... ”اور سورج اپنی مقرر گزر گاہ پر چل رہا ہے، یہی زبردست (اور) علیم ہستی کا مقرر کردہ اندازہ ہے۔“..... اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت کی) یہ نشانی اپنے حجم (جسامت) اور اثر و نفوذ، ہر دو طرح سے ہے، اس کی جسامت اتنی بڑی ہے (کہ اس میں کسی کو کوئی نہ شبہ ہے نہ کلام) اور جہاں تک اس (مخلوق) کی اثر پذیری اور نفوذ کا تعلق ہے تو اس بات کا اندازہ اس سورج سے حاصل ہونے والے ان بے بہا فوائد سے لگایا جاسکتا ہے، جو براہ راست، بنی نوع انسان کے جسموں، درختوں، دریاؤں اور سمندروں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑتے ہیں، تو جب ہم سورج جیسی اس بڑی نشانی کو بغائرِ نظر دیکھیں اور جو ہمارے اور اس کے درمیان دوری کا فاصلہ ہے (جو کہ سائنسی تحقیقات کے مطابق تقریباً اس کرہ ارضی (زمین) سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے) اس کے باوجود ہم اس کو (اہل زمین کے لئے) حرارت و توانائی کا ایک بڑا منبع پاتے ہیں، پھر ذرا یہ دیکھئے کہ اس بڑی روشنی و حرارت کے سرچشمے سے لوگوں کو حاصل ہونے والے اموال کس قدر زیادہ ہیں۔ پھر اس پر متزاد یہ کہ لوگ اس روشن چراغ کے ہوتے ہوئے (روئے زمین کے ہر حصے میں) ہر قسم کی روشنی سے مستغنی (بے پرواہ) ہو جاتے ہیں، جس میں روشنی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مالی منفعت کی بھی بہت بڑی مصلحت پائی جاتی ہے، اور یہ ان آیات بینات کی ایک جھلک ہے جن میں سے ہم (عام طور پر) کم ہی کا اندازہ کر پاتے ہیں۔“

اسی طرح اللہ عزوجل کی قدرت کی بڑی نشانیوں میں سے ایک چاند ہے کہ اس نے اپنی

اس دلکش اور دلفریب مخلوق کی ہر رات کے لئے ایک منزل (حد) مقرر کر دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾ (یسین: ۳۹) ”اور چاند (تو) اس کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔“..... یہ چاند جب (پہلی رات) ظاہر ہوتا ہے تو بہت چھوٹا ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورا (جوان) ہو جاتا ہے، پھر وہ (جوانی کے بعد) زوال پذیر ہونا شروع ہو جاتا ہے، گویا کہ وہ (اپنے بڑھنے اور ڈھلنے میں) انسان کے مشابہ ہے، جیسے وہ (انسان) کمزور حالت میں پیدا ہوتا ہے، پھر وہ ہمیشہ (اس کمزوری سے) قوت و طاقت کی طرف (مرحلہ وار) رواں دواں رہتا ہے، یہاں تک کہ (وہ اپنی پوری طاقت و رعنائی کے عروج پر پہنچنے کے بعد) دوبارہ کمزوری (یعنی بڑھاپے) کی جانب ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے، لہذا بابرکت ہے وہ ذات باری تعالیٰ جو سب سے بہتر پیدا کرنے والی ہے۔

وَالذَّلِيلُ ﴿قَوْلُهُ تَعَالَى﴾ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ﴾ (فصلت: ۳۷)  
 ”اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی دلیل، اس کا یہ ارشاد ہے۔“ اور اللہ (تعالیٰ) کی (قدرت کاملہ کی) نشانیوں میں سے ہیں، یہ رات اور دن اور سورج اور چاند، سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے، اگر تم (نی الواقع) صرف اسی ذات کی عبادت (اور بندگی) کرنے والے ہو۔“

□ ﴿﴾ یعنی اس بات پر دلیل کہ رات اور دن، سورج اور چاند اللہ کی (قدرت کاملہ) کی نشانیوں میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ...﴾ (الآیۃ) ﴿﴾ مطلب یہ ہے کہ ایسی واضح نشانیاں جو اپنے مدلول (ذات باری تعالیٰ کی قدرتوں اس کی عظمت و سطوت و کبریائی اور الوہیت و ربوبیت اور دیگر تمام صفات علیا) کو کھول کھول کر بیان کر دینے والی ہیں، ان میں سے یہ رات اور دن اپنی ذات کے اعتبار سے اور ایک دوسرے سے مختلف

ہونے کے لحاظ سے بھی، اور پھر، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مخلوقات میں اپنے بندوں کی مصلحتیں اور منفعتیں (فوائد) ودیعت کر دی ہیں اور جو آئے دن ان دونوں میں حالات اپنے رخ بدلتے اور حوادث سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے۔“ اور.....

اسی طرح سورج اور چاند بھی اپنی اپنی ذات کے اعتبار سے اور اپنے اپنے مقرر کردہ راستوں اور محور کے گرد انتہائی منظم اور مربوط انداز سے چلنے کے لحاظ سے بھی اور جو کچھ، ان کے اس نظام کائنات میں وجود کے سبب بندوں کو فوائد حاصل ہوتے ہیں، اور وہ نقصانات و تکالیف سے بچتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی (کمال قدرتوں اور بالغ حکمتوں کی) بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے (اپنے) بندوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ سورج اور چاند کو سجدہ کریں، خواہ ان دونوں مخلوقات کی عظمت ان کے دلوں میں (کس حد تک) گھر کر جائے، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہونے کی بناء پر عبادت کی (قطعاً) مستحق نہیں ہو سکتیں (بلکہ وہ تو خود اپنے خالق کے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں) عبادت کا استحقاق صرف اور صرف اس حقیقی معبود برحق کا ہے، جس نے ان کو (اور بقیہ ساری کائنات کو) پیدا کیا ہے۔

وَقَوْلُهُ تَعَالَى ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف: ۵۴)

”اور اس (خالق حقیقی) کی مخلوقات کی دلیل اس کا یہ فرمان بھی ہے۔ ”بے شک تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے، پھر اپنے عرش بریں پر مستوی ہوا، جو رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے، اور پھر دن، رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، جس ذات نے سورج، چاند اور ستارے پیدا کئے (یہ سب) اسی کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی (ساری) مخلوق ہے اور اسی کا حکم (چلتا) ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔“

﴿۱۵﴾ یعنی ان جملہ دلائل میں سے، کہ زمین و آسمانوں کو اللہ واحد نے پیدا کیا ہے، اللہ جل شانہ کا یہ بھی فرمان ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ... (الآیۃ)﴾ آیت کریمہ میں اللہ جل شانہ کی ذات بابرکات کی درج ذیل نشانیوں کا ذکر ہوا ہے:

﴿پہلی﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے ان بڑی بڑی مخلوقات کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک سیکنڈ (بلکہ اس سے بھی کم مدت) میں پیدا کر دیتا، مگر اس کی کمال حکمت کا تقاضا تھا کہ اس نے ان کی پیدائش میں مسببات (وجود میں آنے والی مخلوقات) کو ان کی پیدائش کے (ظاہری) اسباب کے ساتھ مربوط رکھا۔ (جیسا کہ نظام کائنات کے دیگر امور میں اللہ جل شانہ کی سنت اور طریقہ ہے)

﴿دوسری﴾ کہ وہ عرش پر مستوی ہوا، یعنی اس خاص صفت اور شان کے ساتھ جیسے اس کی جلالت و عظمت کے لائق اور شایان شان ہے، وہ قادر مطلق، عرش پر بلند ہوا، اور یہ اس کی کمال ملوکیت اور کمال سلطنت کا عنوان (وصف) ہے۔

﴿تیسری﴾ کہ وہ دن کو رات سے ڈھانپ دیتا ہے، مطلب یہ کہ اس نے رات کو، دن کا ایک دبیز پردہ بنایا ہے، تو وہ رات گویا کہ اس موٹے کپڑے کی طرح ہے جب اسے دن کی روشنی کے سامنے (لا کر) لٹکایا جاتا ہے تو وہ اس دن کو ڈھک دیتی ہے (اور اس طرح رات چھا جاتی ہے اور دن غائب ہو جاتا ہے۔)

﴿چوتھی﴾ کہ اس نے سورج، چاند اور ستاروں جیسی بڑی بڑی مخلوقات کو (پیدا کرنے کے بعد) اپنا تابع فرمان بنایا ہے، وہ (اللہ جل جلالہ) انہیں اپنے بندوں کی مصلحت و منفعت کی خاطر جیسے چاہتا اور جس چیز کے لئے چاہتا ہے حکم کرتا ہے (جس سے وہ سر موخرا نہیں کرتے)۔

﴿پانچویں﴾ اس ذات باری تعالیٰ کی بادشاہی کی عمومیت اور اس کی قبضہ حکمرانی اور کلی اختیار کی عالمگیریت یہاں تک کہ ساری کی ساری مخلوقات اسی کی ملکیت ہے اور ہر قسم کا (امر) اختیار اور حکم اسی کے لئے ہے نہ کہ اس کے سوا کسی اور کے لئے۔

چھٹی: اس جل شانہ کی ربوبیت کی عمومیت اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام جہانوں کا خالق بھی ہے، مالک بھی، رازق بھی ہے اور معبود بھی، (وہ یکتا ذات خالق ہے اس کے سوا باقی سب مخلوق ہے)

وَالرَّبُّ هُوَ الْمَعْبُودُ ۖ وَالذَّلِيلُ ۝ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ ۖ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا ۖ وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا ۖ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾ (البقرة: ۲۲۱)

”اور کائنات کا پروردگار ہی عبادت کے لائق اور حقیقی معبود ہے، اس کی دلیل حق تعالیٰ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ”اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی بندگی اختیار کرو، جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں سب کو پیدا کیا ہے تاکہ تم (دوزخ کی عاقبت سے) بچ جاؤ، وہی ذات تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت، اور آسمان سے پانی اتارا، پھر اس (پانی) کے ذریعے سے (ہر طرح کے) پھلوں میں سے، تمہارے لئے رزق بہم نکالا، بس جب تم یہ (حقیقت) جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل (اور شریک) نہ ٹھہراؤ۔“

□ ﴿ ۸۵ ﴾ مولف (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ) نے اپنے اس قول (وَالرَّبُّ هُوَ الْمَعْبُودُ) کی وضاحت میں اللہ عزوجل کے اس فرمان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهٖ إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف: ۵۴)

”یقیناً تمہارا (حقیقی) پروردگار اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے عرش بریں پر مستوی ہوا، جو رات کو دن پر ڈھاٹک دیتا ہے، اور پھر دن، رات

کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، جس ذات نے سورج، چاند اور ستارے پیدا کئے (یہ سب) اسی کے فرمان کے تابع ہیں، خبردار رہو، اسی کی ساری مخلوق ہے اور اسی ذات کا حکم (چلتا) ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔“

تو کائنات کا رب (پروردگار) ہی عبادت کا مستحق ہے، مطلب یہ کہ وہی یکتا ذات اس بات کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کی بندگی (عبادت) کی جائے۔ یا (بالفاظ دیگر) بندگی اور غلامی کا حق رکھنے کی بناء پر اس اکیلی ذات کی عبادت کی جائے گی اور آیت ہذا کا قطعی طور پر یہ مفہوم نہیں بنتا کہ ہر وہ جس کی عبادت کی جائے گی، وہ رب (پروردگار) ہے، لہذا وہ معبودانِ (باطلہ) جن کی اللہ کے سوا پوجا کی جاتی ہے اور جنہیں ان کے پجاریوں نے اللہ کے علاوہ رب مان لیا ہے رب نہیں ہو سکتے۔

اور حقیقی (الربُّ) پروردگار وہ خالق، مالک اور کائنات کے تمام معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے۔

□ ﴿۷۸﴾ یعنی اس بات کی دلیل کہ بے شک رب کائنات ہی عبادت (بندگی) کا مستحق ہے۔  
 □ ﴿۷۹﴾ (يَا أَيُّهَا النَّاسُ) میں نداء (پکار) کے منادی (جنہیں پکارا جا رہا ہے) ساری اولاد آدمؑ ہے۔ اللہ عزوجل نے (بلا تفریق) سب کو حکم دیا ہے کہ وہ صرف اسی ایک اللہ کی عبادت کریں جس کا کوئی شریک (ساجھی) نہیں اور نہ اس کا مخلوق میں سے کوئی مد مقابل ٹھہرائیں۔ (نیز آیت ہذا میں) اللہ نے یہ واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ وہ یکتا عبادت کا اس لئے مستحق ہے، کہ وہ تنہا پوری کائنات کو پیدا کرنے والا ہے اور (اس پوری کائنات کو پیدا کرنے میں بھی) اس کا کوئی شریک (اور مددگار) نہیں۔

□ ﴿۸۰﴾ حق تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ یہ حقیقت حال کو منکشف کرنے والی اور (کھول دینے والی) وہ صفت ہے جو گذشتہ حکم کی علت (اصل وجہ) بیان کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی عبادت کرو، کیونکہ وہ تمہارا، پروردگار ہے، جس نے تم کو پیدا کیا، تو اس ذات کے

حقیقی رب (پروردگار) اور خالق (پیدا کرنے والے) ہونے کی وجہ سے، تم پر یہ لازم ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو..... اور اسی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں: کہ ہر وہ شخص جو اللہ جل شانہ کی ربوبیت کا اقرار کرتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ صرف اسی ایک معبود برحق کی بندگی کرے ورنہ اس شخص کی اپنی ذات متناقض ہوگی (یعنی اس کے قول و فعل میں واضح تضاد اور تناقض ہوگا۔)

□۵۹﴿ یعنی یہ حکم اس لیے بجلاؤ تاکہ تم متقی بن سکو، اور تقویٰ (کا ایک مفہوم) یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات کی پیروی کرتے ہوئے اور اس کے سارے منہیات (منکرات) سے بچتے ہوئے اللہ عزوجل کے تیار کردہ عذاب سے بچ جانا، (جس کا اصل مغز اللہ تعالیٰ کا خوف ہے)

□۶۰﴿ یعنی اس زمین کو فرش اور بچھونا بنا دیا، جس سے ہم بغیر مشقت اور تھکاوٹ کے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس پر ہم ایسے آرام سے لیٹ جاتے ہیں، جیسے انسان اپنے بستر پر سوتا ہے۔

□۶۱﴿ یعنی ہمارے اوپر آسمان کو چھت بنا دیا، اس لئے کہ یہ پوری عمارت آسمان سے اوپر ہے جو کہ اہل زمین کے لئے ایک قسم کی چھت ہے، اور یہ چھت انتہائی مضبوط و محفوظ ہے، جیسا کہ اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ﴾ (الانبیاء: ۳۲) ”اور ہم نے آسمان کو (اہل زمین کے لئے) ایک محفوظ چھت بنا دیا، پھر بھی یہ لوگ اس کی نشانیوں سے اعراض کرنے (یعنی منہ موڑنے) والے ہیں۔“

□۶۲﴿ یعنی بلندی (میں موجود) بادلوں میں سے پاکیزہ پانی اتارا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ﴾ (النحل: ۱۰)

”جس (پانی) سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو، اس سے درخت (یعنی کھیتیاں وغیرہ بھی) سیراب ہوتی ہیں جن میں تم (اپنے مویشی) چراتے ہو۔“

□۶۳﴿ ﴿رِزْقًا لَّكُمْ﴾ یعنی تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطاء کردہ رزق ہے، اور

ایک دوسری آیت کریمہ میں یہ الفاظ ہیں: ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَا نَعَامِكُمْ﴾ (النازعات: ۳۳) (یہ سب کچھ تمہارے لئے اور تمہارے چوپایوں کے لئے سامان زندگی ہے۔

□۳۵) مطلب یہ ہے کہ (اے لوگو!) تم اس ذات باری تعالیٰ کے لئے، جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تمہاری خاطر زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو ایک محفوظ چھت اور تمہاری خاطر ہی آسمان (کی بلندیوں) سے پاکیزہ پانی اتارا اور پھر اسی پانی کی بدولت تمہارے لئے مختلف انواع کے پھلوں میں سے رزق کا وافر انتظام فرمایا، کسی قسم کا کوئی ساجھی اور مد مقابل نہ ٹھہراؤ، کہ تم ان (بتوں) کی عبادت ایسے انداز سے کرنی شروع کر دو جس طرح تم 'اللہ واحد' کی عبادت کرتے ہو، یا تم ان سے اس طرح کی محبت کرنی شروع کر دو، جس طرح کہ تم 'اللہ واحد' سے محبت کرتے ہو، یہ کام تمہارے شایان شان نہیں اور نہ ایسا کرنا تمہارے لئے عقلی اور شرعی ہر اعتبار سے جائز ہے۔“

□۳۶) یعنی تم اس حقیقت کا پہلے سے ہی خوب علم رکھتے ہو کہ اس ذات باری تعالیٰ کا کوئی مد مقابل نہیں ہو سکتا، اور اسی کے قبضہ قدرت میں ساری مخلوق، ہر قسم کا رزق اور تمام امور کی تدبیر کرنا ہے لہذا تم (اس حقیقت سے آگاہی رکھتے ہوئے اب) اس کی عبادت میں کسی کو شریک اور ساجھی نہ ٹھہراؤ۔“

(قَالَ ابْنُ كَثِيرٍ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى ۖ: الْخَالِقُ لِهَذِهِ الْأَشْيَاءِ

هُوَ الْمُسْتَحَقُّ لِلْعِبَادَةِ) (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۷۷ طبع مصر)

”امام ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر بیان کرتے

ہوئے کہا ہے کہ ان تمام (مذکورہ) اشیاء کا خالق (حقیقی پیدا کرنے والا) ہی

ہر قسم کی عبادت کا حقدار ہے۔“

□۳۷) امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا پورا نام و نسب یہ ہے: حافظ عماد الدین، ابوالفداء، اسماعیل



بن عمر قریشی، دمشقی رحمہ اللہ تعالیٰ! آپ مشہور صاحب تفسیر و تاریخ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ ۷۷۴ ہجری میں فوت ہوئے۔“

وَأَنوَاعُ الْعِبَادَةِ الَّتِي أَمَرَ اللَّهُ بِهَا: مِثْلُ الْإِسْلَامِ، وَالْإِيمَانِ وَالْإِحْسَانِ<sup>۴۰</sup>  
 ”اور عبادت کی وہ انواع و اقسام جن کو بجالانے کا اللہ تعالیٰ نے  
 حکم دیا ہے جیسے اسلام، ایمان اور احسان ہے۔“

□۴۰ مولف (شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ!) نے جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ ہم پر یہ واجب ہے کہ ہم ایک اللہ کی بندگی کریں، جس کا کوئی شریک اور سا جھی نہیں، اب انہوں نے ذیل میں عبادت کی کچھ اقسام بھی ذکر کی ہیں اور کہا ہے کہ: عبادت کی (کچھ) اقسام ہیں مثلاً: اسلام، ایمان اور احسان اور عبادت کی یہی تین بڑی انواع اسلام، ایمان اور احسان پورے دین کے مساوی ہیں (بلکہ دین ہی کا مجموعہ ہیں) جیسے اس بات کی وضاحت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی ایک مشہور حدیث میں آئی ہے: (حدیث کے راوی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں:

”اس حال میں کہ ہم ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ اچانک ہم پر، انتہائی سفید کپڑوں میں ملبوس اور بہت ہی زیادہ سیاہ بالوں والے ایک صاحب آوارہ ہوئے، جن کے جسم پر سفر کے کوئی آثار تک نہ دکھائی دیتے تھے، اور نہ ہی ہم میں سے کوئی ان کا شناسا تھا، یہاں تک کہ وہ (صاحب) اللہ کے نبی ﷺ کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئے اور اپنے گھٹنوں کو آپ ﷺ کے گھٹنوں کی طرف موڑ کر دو زانو ہو کر بیٹھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اپنی (یا پھر رسول اللہ ﷺ کی) رانوں پر رکھ لیا اور کہا: اے محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اور محمد (ﷺ) اللہ کے (سچے) رسول ہیں اور تو (ایک دن میں پانچ وقت فرض نماز قائم کرے اور تو (اگر صاحب نصاب ہے) سال میں ایک بار اپنے مال سے فرض) زکوٰۃ ادا کرے اور تو (سال میں ایک بار) رمضان کے فرضی روزے رکھے اور تو (کم

از کم زندگی میں ایک مرتبہ (اللہ تعالیٰ کے گھر کا حج ادا کرے اگر تو اس کی استطاعت رکھتا ہو۔ اس (نوادرخش) نے یہ سن کر کہا: آپؐ نے سچ فرمایا ہے: حضرت عمرؓ کہتے ہیں: ہمیں اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ یہ (اجنبی شخص) آپؐ سے پوچھتا بھی ہے اور پھر تصدیق (بھی خود ہی) کرتا ہے!..... پھر اس شخص نے کہا: (اے اللہ کے رسول!) مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے کہ ایمان کیا چیز ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: یہ کہ تو ایک اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے پیغمبروں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نیز اس بات پر بھی تو ایمان لائے (یعنی زبان سے اقرار کے ساتھ ساتھ دل سے بھی تصدیق کرے) کہ ہر اچھی اور بُری تقدیر (یعنی ہر اچھے اور بُرے امر کا فیصلہ) مغائب اللہ ہے (یہ سن کر) اس اجنبی شخص نے پھر یہ کہا: آپؐ نے سچ فرمایا ہے۔ پھر اس نے آپؐ سے پوچھا، (اے محمد!) مجھے کچھ احسان کے بارے میں بتائیے کہ احسان کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کہ تو اللہ جل شانہ کی اس انداز سے عبادت کرے، گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اسے (دوران عبادت) نہیں دیکھ رہا تو (کم از کم اس درجے پر تجھے ہونا چاہئے کہ) اللہ تجھے ضرور دیکھ رہا ہے۔ پھر اس (نوادرخش) نے کہا: (اے اللہ کے رسول!) مجھے قیامت قائم ہونے کے بارے میں کچھ بتائیے، آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اس بارے میں سائل (سوال کرنے والے) سے زیادہ مسئول (جس سے سوال کیا جا رہا ہے) نہیں جانتا، اس (اجنبی شخص) نے مزید استفسار کرتے ہوئے کہا: ”مجھے اس قیامت پتا ہونے (سے پہلے رونما ہونے والی چند) علامات کے بارے میں بتائیے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”کہ (جب) لونڈی اپنے مالک، (یعنی خاوند) کو جنم دے گی، (مطلب یہ کہ قرب قیامت بدکاری اتنی کثرت سے عام ہو جائے گی کہ مرد کو یہ پتہ نہ چل سکے گا کہ جس عورت سے وہ یہ فعل بد کر رہا ہے یہ اس کی اپنی ماں ہے اور نہ ہی عورت کو علم ہوگا کہ یہ مرد اس کا بیٹا ہے یا پھر اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قیامت کے قریب اولاد والدین کی اس قدر نافرمان ہو جائے گی کہ ایک بیٹا اپنی حقیقی والدہ سے اپنی زرخید لونڈی کا سا برتاؤ کرے گا۔) (الأمان والحفیظ) اور یہ کہ جب تو یہ دیکھے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور فقر کے مارے ہوئے تنگدست لوگ بھیڑ بکریوں کے چرواہے، ایک دوسرے سے بڑھ کر بلند و بالا عمارتیں بنانے میں فخر محسوس کریں گے۔ (حدیث کے راوی) حضرت عمرؓ کہتے ہیں: پھر یہ آنے والے صاحب وہاں سے چلے گئے، تو میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا، بعد ازاں (رسول

اللہ ﷻ نے) مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے عمر! کیا تو سائل کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ کون ہے؟ میں نے کہا: کہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، تب آپؐ نے فرمایا: ”یہ جبریلؑ تھے جو تمہارے پاس (اس لئے) آئے تھے کہ تمہیں، تمہارے دین کی بابت تعلیم دے سکیں۔“ (۱۳)

◎ تو اللہ کے رسول ﷺ نے حدیث میں مذکور ان تمام اشیاء کو دین قرار دیا، یہ اس لئے کہ یہ (سارا مضمون) پورے دین کو متضمن (اور شامل) ہے۔

وَمِنْهُ الدُّعَاءُ وَالْخَوْفُ، وَالرَّجَاءُ، وَالتَّوَكُّلُ، وَالرَّغْبَةُ، وَالرَّهْبَةُ، وَالْخُشُوعُ وَالْخَشْيَةُ، وَالْإِنَابَةُ، وَالْإِسْتِعَانَةُ، وَالْإِسْتِعَاذَةُ، وَالْإِسْتِغَاثَةُ، وَالذَّبْحُ، وَالنَّذْرُ، وَغَيْرَ ذَلِكَ مِنْ أَنْوَاعِ الْعِبَادَةِ الَّتِي أَمَرَ اللَّهُ بِهَا كُلُّهَا اللَّهُ تَعَالَى ۖ وَالِدَلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿وَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (الحج: ۱۸) (فَمَنْ صَرَفَ مِنْهَا شَيْئًا لِّغَيْرِ اللَّهِ فَهُوَ مُشْرِكٌ كَافِرٌ وَالِدَلِيلُ: قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ﴾ (المؤمنون: ۱۱۷)

”اور ایسے ہی دعاء و خوف، امید و رجاء، توکل (بھروسہ)، رغبت و رعبت (ڈر) خشوع و خشیہ (اللہ کا خوف) رجوع، استعانت (مدد طلب کرنا)، استعاذہ (پناہ طلب کرنا)، استغاثہ (مدد مانگنا)، ذبح و قربانی اور نذر و منت (ماننا) اور ان کے علاوہ دیگر عبادات بھی ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور یہ سب کی سب حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور ان باتوں پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”اور بے شک مساجد صرف اور صرف اللہ کے لئے ہیں، پس تم (ان میں) اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔“..... تو جس کسی نے ان مذکورہ عبادات میں سے کسی بھی عبادت کو کسی غیر اللہ (جیسے کسی فرشتے، جن، نبی، ولی اور پیرومرشد وغیرہ) کے لئے ادا کیا وہ مشرک و کافر ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے، جس کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس شخص کا حساب اس کے رب کے پاس ہے (اور وہ حساب یہ ہے کہ) بے شک (یہ لوگ کافر ہیں اور) کافر کبھی فلاح (کا مایابی) نہیں پاسکتے۔“

□ ﴿۳۹﴾ یعنی عبادت کی جملہ اقسام جن کا یہاں ذکر ہوا ہے یا ان کے علاوہ وہ جن کا ذکر نہیں ہوا، سب کی سب اسی ایک ذات کے لئے خاص ہیں جس کا کوئی شریک و سا جھی نہیں لہذا انہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے خاص کرنا قطعی طور پر جائز نہیں (بلکہ اس کا ارتکاب کفر و شرک ہے)۔ والعیانہ باللہ تعالیٰ

□ ﴿۴۰﴾ مولف رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہاں عبادت کی جملہ انواع و اقسام کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس کسی نے ان مذکورہ عبادات میں سے کسی بھی عبادت کو کسی غیر اللہ (مثلاً فرشتے، نبی، جن، ولی، پیر و مرشد وغیرہ) کے لئے خاص کیا تو وہ مشرک و کافر ہے اور اس بات کی دلیل انہوں (رحمہ اللہ) نے اللہ تعالیٰ کے ان فرامین کو بنایا ہے:

① ﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (الحج: ۱۸)

”اور بے شک مساجد اللہ ہی کے لئے ہیں، لہذا تم (ان میں) اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔“

② ﴿وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ﴾ (المؤمنون: ۱۷)

”اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے، جس کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، کہ بیشک کافر کبھی فلاح (کامیابی) نہیں پاسکتے۔“ (ان مذکورہ آیات میں سے)

پہلی آیت کریمہ میں دلالت کی وجہ یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے پہلے اس بات کی خبر دی ہے کہ مساجد، جو کہ سجدہ کرنے کی جگہیں ہیں یا وہ اعضائے سجدہ (جن کو انسان سجدہ کرتے وقت زمین پر رکھتا ہے) اللہ جل شانہ کے لئے ہیں اور اسی کی ملکیت ہیں، بعد ازاں اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مرتب ہوا ہے کہ: ﴿فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾..... ”تو تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔“

☆..... مطلب یہ ہے کہ جب عبادت گا ہیں اور سجدہ کے اعضاء سب کچھ اللہ کے لئے ہے تو پھر اس بات کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس (اللہ واحد) کے ساتھ کسی اور کی بندگی نہ کرو، کہ اس

کو پھر سجدے کرنا بھی شروع کر دو“.....

اور دوسری آیت کریمہ سے اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بیان فرمایا: جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے وہ کافر ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّهُ لَا يَفْلَحُ الْكَافِرُونَ﴾..... ”بے شک کافر (لوگ) کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔“ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں: ﴿لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ﴾ ”کہ اس (کافر) کے پاس اس (کفر و شرک) کی کوئی دلیل بھی نہیں۔“ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ (ایک سے زیادہ) معبودان باطلہ کے وجود پر کوئی دلیل مل سکے۔ تو یہ وصف ﴿لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ﴾ ایسا وصف ہے جو اس حقیقت کو کھول کر اور اصل معاملے کو واضح طور پر بیان کر دیتا ہے، (کہ اللہ واحد کے سوا کسی اور کو معبود پکڑ لینا بلا حجت و بلا دلیل ہوگا) نہ کہ یہ ایسا وصف ہے جو مقید ہو، یعنی جہاں کوئی ایسی (باطل پر مبنی) دلیل مل جائے تو وہاں سے یہ وصف خارج ہو جاتا ہے اور اپنی حیثیت کھو دیتا ہے (بالفاظ دیگر آیت کریمہ میں یہ ’صفت مبینہ‘ ﴿لَا بُرْهَانَ لَهُ﴾ کے ذکر کا یہ مقصد نہیں کہ اگر کہیں سے کوئی ’برہان‘ (دلیل) کسی جھوٹے معبود پر مل جائے تو اس وقت اللہ کے ساتھ اس معبود (باطل) کو پکارنا جائز ہوگا، بلکہ یہ تو حقیقت حال کو واضح کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے کہ) یہ بات سرے سے ہی ناممکن ہے کہ یہاں کوئی دلیل مل جائے کہ اللہ واحد کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے۔

وَفِي الْحَدِيثِ: الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي، أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾<sup>(۶۰)</sup> (غافر: ۶۰)

”اور دعاء کے عبادت ہونے کی دلیل ایک یہ حدیث پاک ہے ”کہ دعاء عبادت کا مغز (یعنی اصل) ہے“ اور قرآن حکیم میں ’دعاء‘ کے عبادت ہونے کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ ”تمہارا رب کہتا ہے کہ: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر واصل جہنم ہوں گے۔“

□ یہ مؤلف (شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ تعالیٰ) کی جانب سے عبادت کی ان اقسام کے دلائل کے بارے میں آغاز ہے، جو انہوں نے اپنے اس قول میں ذکر کی ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے جن انواع و اقسام کی عبادت کو بجالانے کا حکم دیا ہے جیسے اسلام، ایمان اور احسان اور انہی میں سے دعاء ہے..... الخ“

تو مؤلف رحمہ اللہ نے (اس ضمن میں) ابتداء، دعاء کی دلیلوں کے ذکر سے کی ہے (کہ دعاء عبادات میں سے ایک عبادت ہے) اسی طرح اسلام، ایمان اور احسان پر بھی۔ ان شاء اللہ عنقریب تفصیل آگے آئے گی۔“

تو یہاں مؤلف رحمہ اللہ نے امام ترمذی کی روایت کردہ ایک حدیث سے دلیل لی ہے کہ: «الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ» (۱۵)..... ”کہ دعاء عبادت کا مغز ہے۔“

اور قرآن حکیم سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے۔ ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ (غافر: ۶۰)

”اور تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک وہ لوگ جو گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ جلدی (ذلیل و خوار ہو کر) جہنم میں داخل ہوں گے۔“ العباد باللہ

تو آیت کریمہ اس بات پر واضح دلالت کرتی ہے کہ دعاء، عبادت کی انواع میں سے ایک نوع (قسم) ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کہنا بھی درست نہ ہوتا ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ ”بے شک وہ لوگ جو گھمنڈ میں آ کر میری عبادت (یعنی دعاء کرنے) سے پہلو تہی برتتے ہیں، وہ جلدی ذلیل و خوار ہو کر واصل جہنم ہوں گے“..... تو جس شخص نے غیر اللہ (اللہ کے علاوہ کسی دوسرے) کو کسی ایسی چیز کی بابت پکارا، کہ اس پر سوائے اللہ عز و جل کی ذات کے اور کوئی قدرت و اختیار نہیں رکھتا، تو وہ شخص مشرک و کافر

ہوگا، خواہ جسے (اللہ کے علاوہ) پکارا جا رہا ہے وہ زندہ ہو یا مردہ، اور جو شخص کسی زندہ کو پکارے اور وہ زندہ اس چیز پر قدرت بھی رکھتا ہو، جس کے بارے میں اسے پکارا جا رہا ہے، مثلاً: کوئی شخص یہ کہے: یا فُلَانُ اَطْعَمْنِیْ ”کہ اے فلاں مجھے کھانا کھلایا اے فلاں مجھے پانی پلا، تو ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر کوئی ایسی ہی بات یا کلمات کسی میت کو یا غائب شخص کو کہے تو وہ (کہنے والا) مشرک ہوگا، اس لئے کہ میت یا غائب شخص، ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسے مطالبات پورے کر سکے، تو اس شخص کا ایسے لوگوں کو (حاجت برآری کے لئے) پکارنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خود یہ عقیدہ رکھتا ہے، کہ مدعو (پکارا جانے والا مردہ یا غائب شخص) کائنات میں اپنی مرضی چلا سکتا ہے لہذا وہ اسی باطل عقیدے کی بدولت مشرک ٹھہرے گا۔

اور یہ بات بھی جان رکھئے، کہ دعائے دو قسمیں ہیں: ① دعاء مسئلہ اور ② دعاء عبادت۔

**دعائے مسئلہ:** اور اسے ’دعائے طلب‘ بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی حاجات و ضروریات کو طلب کرنا، مانگنا، اور ’دعائے کی یہ قسم اس وقت ’عبادت‘ شمار ہوگی جب بندہ اپنے رب سے کوئی چیز مانگے، اس لئے کہ یہ ’دعائے اللہ تعالیٰ کے حضور احتیاج و التجاء‘ (یعنی اس ذات باری تعالیٰ کے آگے محتاجی اور اسی کی طرف ہاتھ پھیلا کر مانگنے) کو شامل ہے، اور اس اعتقاد کو بھی مضمّن ہے کہ وہی یکتا ذات، قادر مطلق ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی رحیم و کریم اور بہت فضل و کرم والی بھی ہے اور اسی طرح کی ’دعائے بندے کے لئے، مخلوق میں سے اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے اس وقت کرنا جائز ہوگی جب مدعو (جسے پکارا جا رہا ہو) ’دعائے کو سمجھتا ہو‘ (کہ اس میں کیا ہے اور کس لئے اسے بلایا جا رہا ہے؟) اور ساتھ ہی وہ اس پکار کا جواب دینے کی بھی استعداد رکھتا ہو، جیسا کہ پہلے اس شخص کا قول گزر چکا ہے (یا فُلَانُ اَطْعَمْنِیْ!) کہ اے فلاں مجھے کھانا کھلا!

**دعائے عبادت:** اور دعائے عبادت یہ ہے کہ بندہ اس دوران مدعو (جسے پکارا جا رہا ہے) سے ثواب و اجر حاصل کرنے یا اس کی سزا سے بچنے کی نیت سے اس کی بندگی بجالائے

اور دعاء کی یہ قسم 'غیر اللہ' (اللہ عزوجل کے علاوہ کسی دوسرے) کے لئے درست نہیں، لہذا اس دعاء کو اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کی طرف پھیرنا (حقیقت میں غیر اللہ کی صریحاً عبادت کرنا ہے اور یہی) شرک اکبر (بڑا شرک) ہے جو انسان کو ملت اسلامیہ سے نکال باہر کرتا ہے، اور اسی پر انتہائی سخت وعید (عذاب کا وعدہ) ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ (غافر: ۶۰)

”بے شک جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری بندگی (عبادت) سے منہ موڑتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ (المیاد باللہ)

وَدَلِيلُ الْخَوْفِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۷۵) اور 'خوف' کے عبادت ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ”پس تم ان (انسانوں) سے نہ ڈرنا اور مجھ سے ڈرنا اگر تم (حقیقت میں اپنے تئیں) صاحب ایمان ہو۔“

□ ﴿خوف﴾ سے مراد ڈر اور ہیبت ہے، نیز 'خوف' انسان کے متاثر ہونے کا وہ فعل ہے جو کسی ایسی چیز کی موجودگی سے حاصل ہوتا ہے جس میں اسے ہلاکت، تکلیف یا کوئی مصیبت وغیرہ پہنچنے کا خدشہ ہو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے شیاطین کے ساتھیوں سے ڈرنے سے روکا ہے اور صرف اپنی ذات سے خوف کھانے کا حکم دیا ہے۔..... آگے خوف کی تین اقسام ہیں:

⑤ پہلی قسم: 'وہ خوف طبعی ہے جیسے انسان کا درندے سے، آگ سے یا پانی میں ڈوبنے سے ڈرنا وغیرہ اور اس قسم کے خوف پر انسان کو کوئی پکڑ یا ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَأَصْبَحَ فِي الْمَدْيَنَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ﴾ (القصص: ۱۸)

”پھر وہ (موسیٰ) صبح سویرے، ڈرتے ڈرتے، اور ہر طرف سے خطرے کو بھانپتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے“، لیکن اگر یہی 'خوف' جیسا کہ شیخ موصوف رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ کسی واجب کے چھوڑنے اور حرام کام کے ارتکاب کا سبب بن رہا ہو تو خوف کی یہ قسم بھی حرام ہوگی، اس لئے کہ جو چیز بھی کسی واجب کے ترک کرنے اور حرام کام کے ارتکاب کا سبب بنے



تو وہ (خود بھی) حرام ہے، اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُواْ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۷۵) ”پس تم ان سے مت ڈرنا اور (صرف) مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔“.....

اور اللہ تعالیٰ سے خوف (اپنے نتائج کے اعتبار سے) دو طرح کا ہے۔

① یہ وہ ’خوف‘ ہے جس کے نتیجے میں انسان شریعت کی نظر میں قابل ستائش اور قابل تعریف ہوتا ہے۔

② یہ وہ ’خوف‘ ہے جس کے نتیجے میں انسان شریعت کی نظر میں مذمت ٹھہرتا ہے تو خوف کی پہلی قسم: (یعنی خوف محمود) کا مقصود (اور ہدف) یہ ہوتا ہے کہ وہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے درمیان حائل اور آڑے آجائے، یہاں تک کہ وہ تجھے واجبات کی ادائیگی پر انگیزت دلائے اور حرام کاموں کو چھوڑ دینے پر اکسائے، اگر (اللہ کے خوف سے) یہ مقصد حاصل ہو گیا، تو پھر دل بھی اطمینان و سکون سے لبریز، اس کی نعمتوں اور اس کے فضل و کرم کو پالینے کی خوشی سے سرشار اور اس کے اجر و ثواب کے حصول کی اُمید میں ڈوب جائے گا۔

خوف کی دوسری قسم: (یعنی غیر محمود) وہ ہے جو بندے کو اللہ کی رحمت سے نا اُمیدی اور مایوسی پر اکساتی ہے اور اس وقت بندہ انتہائی افسردہ اور غمگین ہو جاتا ہے اور بسا اوقات وہ اس مایوسی کی زیادتی کی بنا پر اللہ کی نافرمانی میں بھی حد سے بڑھ جاتا ہے۔ (العباد باللہ)

⑤ دوسری قسم: ’خوف عبادت‘ ہے کہ آدمی کسی سے خوف کھاتا ہو اور اس خوف کی وجہ سے وہ اس کی بندگی (عبادت) بھی کرے، لہذا یہ خوف اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی سے کھانا جائز نہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے خاص کرنا یا اس کی طرف پھیرنا ’شُرک اکبر‘ ہے۔ (العباد باللہ)

⑥ تیسری قسم: ’سری خوف‘ ہے، جیسے کوئی آدمی قبر میں پڑے ہوئے مردے سے ڈرنا رہے یا پھر اپنے سے بہت دور کسی بزرگ، دلی یا پیر وغیرہ سے دل ہی دل میں خوف کھاتا

رہے، خواہ وہ اس پر اثر انداز ہونے کی سکت بھی نہ رکھتا ہو، تو خوف کی اس قسم کو بھی علماء نے 'شُرک' کے زمرے میں داخل کیا ہے۔

وَدَلِيلُ الرَّجَاءِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ

عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ (الکہف: ۱۱۰)

”اور امید کے عبادت ہونے کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے: ”پس جو کوئی اپنے پروردگار کی ملاقات کا امیدوار ہو تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔“

⊕ رجاء (یعنی اُمید) انسان کا کسی ایسے معاملے میں طمع کرنا، جسے وہ قریب وقت (اور قریب جگہ) میں پاسکتا ہو، اور کبھی وہ گوہر مراد اس کی پہنچ سے (حقیقت میں) دور ہوتا ہے، (مگر) امید اسے اس کے قریب کی منزل (مقام) پر اتار دیتی ہے..... اور رجاء (اُمید) کی وہ قسم جو عاجزی و انکساری اور فروتنی کو متضمن (شامل) ہو، وہ صرف اور صرف اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہے، اور اسے غیر اللہ (یعنی کسی فرشتے، نبی، ولی یا جن وغیرہ) کی طرف پھیرنا، امیدوار کے دل کی کیفیت کے اعتبار سے یا تو یہ شرک اصغر ہوگا اور یا پھر شرک اکبر۔ (والعیاذ باللہ)..... اور مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ! نے اپنے اس موقف کی دلیل میں اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ذکر کیا ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ (الکہف: ۱۱۰) ”تو جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور عبادت میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔“

اور رجاء (اُمید) کے سلسلے میں یہ بات جان لیجئے، کہ محمود رجاء (یعنی قابل ستائش اُمید) صرف اسی شخص کے لئے ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے اور اس اطاعت پر اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا امیدوار ہو، اس کی نافرمانی سے (کلی طور پر) تائب ہو،

اور پھر وہ اس توبہ کی قبولیت کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُمید بھی رکھتا ہو،..... اور اس کے برعکس بغیر عمل کے اُمید (جیسا کہ آج کل اکثر و بیشتر لوگوں کا وطیرہ ہے۔ والعیاذ باللہ) ... یہ محض (دھوکہ، فریب) غرور و گھمنڈ اور مذموم روش ہے۔

وَدَلِيلُ التَّوَكُّلِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾  
(المائدة: ۲۳) وَقَالَ (جَلَّ مِنْ قَائِلٍ) ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾  
(الطلاق: ۳) اور 'توکل' کے 'عبادت الہی' ہونے کی دلیل یہ ارشادِ ربانی ہے: ”اور اللہ پر (ہی) بھروسہ رکھو، اگر تم مؤمن ہو۔“ قرآن حکیم کے ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا ہے: ”اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا، تو اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔“

□ ﴿ کسی چیز پر توکل سے مراد، اس پر اعتماد اور بھروسہ کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ فوائد کے حصول اور مصائب سے بچاؤ میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس حد تک بھروسہ اور اعتماد کہ وہ ذات (مقصود کے حصول میں) کمال درجے تک کافی اور وافی ہے اور یہ 'توکل' ایمان کے کمال اور اس کی علامات میں سے ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (المائدة: ۲۳) ”اور اللہ پر ہی بھروسہ رکھو، اگر تم مؤمن ہو۔“..... اور جب بندہ صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر فکر و پریشانی والے معاملے کے بارے کافی ہوگا، جو اسے درپیش ہو اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ (الطلاق: ۳)..... ”اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے گا، تو اللہ اس کو کافی ہوگا۔“

☆..... مطلب یہ کہ اللہ اس کے ہر معاملے میں اس کا مددگار، معاون و محافظ اور کافی ہوگا، پھر اس پر متوکل (اعتماد کرنے والا شخص) اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہوئے کامل اطمینان کی نعمت سے سرفراز ہوگا: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بدولت ﴿إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ﴾ (الطلاق: ۳) ”بیشک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔“..... لہذا اللہ تعالیٰ کو ہر اس کام کے کرنے سے جس

کا وہ ارادہ کر لیتا ہے کوئی چیز نہ عاجز کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے۔ (اس پر متوکل اور زیادہ مطمئن اور اللہ کے حضور جھک جاتا ہے۔“..... اور یہ بات بھی جان لیجئے کہ:

توکل کی کئی ایک قسمیں ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی قسم: (جو کہ شریعت طاہرہ میں مطلوب و مقصود ہے) اور وہ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا اعتماد اور بھروسہ اور یہ کمال ایمان اور ایمان کی سچائی کی علامات میں سے ہے۔ یہ ہر مسلمان پر لازم ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا، اور اس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے۔

۲۔ دوسری قسم: 'توکل' کی یہ قسم 'سری توکل' کہلاتی ہے، کہ کوئی شخص، کسی فائدے کے حصول یا کسی مصیبت سے بچاؤ کی غرض سے کسی میت (مردہ) پر اعتماد کرے، یہ 'شُرک اکبر' ہے، اس لئے کہ اس قسم کی (باطل سوچ) صرف ایسے شخص سے متوقع ہو سکتی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتا ہو، کہ یہ میت (مرنے والا) کائنات میں (اپنی مرضی سے کوئی بھی) پوشیدہ طور پر (تبدیلی لانے کا) اختیار رکھتا ہے، خواہ وہ (جس کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا گیا ہے) کوئی نبی ہو، یا ولی اور بزرگ ہو یا کوئی طاغوت (شیطان کا ساتھی) اور اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو، اس بارے میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ تیسری قسم: کہ آدمی کسی ایسی چیز کے بارے میں کسی شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے جو کسی اور شخص کے دائرہ اختیار میں ہو، یہ شعور اور علم رکھتے ہوئے کہ جس پر وہ اعتماد کر رہا ہے اس کا مرتبہ کتنا بلند ہے اور جس کے بارے میں وہ اس پر بھروسہ کر رہا ہے وہ اپنے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے کتنا گرا ہوا اور پست ہے مثال کے طور پر ایک آدمی کسی پر حصول معاش (یعنی ملازمت یا نوکری حاصل کرنے کے لئے) اعتماد کرتا ہے (کہ وہ آگے سفارش کے ذریعے کسی دوسرے سے ملازمت دلوادے گا) وغیرہ اور توکل کی یہ قسم، "بھروسہ کرنے والے کی اس (متوکل علیہ جس پر بھروسہ کیا جا رہا ہے) کے ساتھ انتہائی دلی وابستگی اور اس پر 'حد' سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرنے کی بناء پر 'شُرک اصغر' کی قبیل میں سے ہے۔"

لیکن اگر وہ شخص اس پر صرف اس حد تک بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے کہ وہ تو صرف اسباب میں سے ایک 'سبب' ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کے ہاتھوں، اس کام کی راہ ہموار کی ہے، تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، (خاص طور پر) جب متوکل علیہ (جس پر بھروسہ کیا جا رہا ہے) میں وہ مطلوب کام سرانجام دینے کی صحیح صلاحیت موجود ہو۔“

**چوتھی قسم!** کسی دوسرے شخص پر، ایسی چیز کے بارے میں اعتماد کرنا، جس میں خود تو کل کرنے والا شخص اختیار رکھتا ہو، جیسے وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے کو (اس پر بھروسہ کرتے ہوئے) کسی ایسے معاملے میں اپنا نائب مقرر کر دے، جس میں نیابت (قائم مقام بنانا) جائز ہو۔“ تو ایسے توکل میں کوئی حرج نہیں، اس کے جواز پر کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع اُمت (صریحاً) دلالت کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے صاحبزادوں سے فرمایا: ﴿يَبْنِيْ اَذْهَبُوْا فْتَحْصِسُوْا مِنْ يُّوسُفَ وَآخِيْهِ﴾ (یوسف: ۸۷) ”اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کی سر توڑ کوشش کرو۔“

اور اسی طرح اللہ کے نبی ﷺ نے صدقات و خیرات پر عاملین اور محافظوں کو (ان پر اعتماد کرتے ہوئے) مقرر کیا۔ نیز اللہ کی حدود (اور ان کو لوگوں پر قائم اور نافذ کرنے) کا بھی آپؐ نے اوروں کو اختیار سونپا اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کو 'حجۃ الوداع' کے موقع پر اپنی قربانی کے جانوروں کی ذمہ داری سونپی کہ ان کے چمڑوں کو اور ان کے جھولوں کو صدقہ کر دیں، اور قربانی کے سو جانوروں میں سے جو باقی بچ جائیں ان کو ذبح کر دیں، جبکہ ان میں سے تریٹھ (۶۳) جانور آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ذبح کئے تھے اور جہاں تک اس کے جواز کے بارے میں 'اجماع' (امت کے اتفاق) کا تعلق ہے، تو یہ ہر اعتبار سے معلوم ہے۔

وَدَلِيلُ الرَّغْبَةِ ۝ وَالرَّهْبَةِ ۝ وَالْخُشُوعِ ۝ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ﴾

”اور رغبت و رہبت اور خشوع کے عبادت ہونے کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ”یہ لوگ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے (پوری فروتنی کے ساتھ) جھکے ہوئے تھے۔“ (الانبیاء: ۹۰)

□ ۱۰۱ الرُّغْبَةُ: کسی محبوب (پسندیدہ) چیز کو محبت سمیت پالنا (اس تک رسائی پانا)

□ ۱۰۲ الرُّهْبَةُ: خوف کی وہ بار آور نوع جو مخوف (جس ذات سے ڈرا جاتا ہے) سے راہ فرار

اختیار کرنے یعنی بچنے (کا باعث) ہو نیز یہ وہ 'خوف' ہے، جو عمل سے ملا ہوا ہوتا ہے۔

□ ۱۰۳ الْخُشُوعُ: اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے سامنے انتہا درجے کی عاجزی و

انکساری، اس طرح کہ بندہ اللہ جل جلالہ کے کوئی و شرعی ہر طرح کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔

□ ۱۰۴ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کے اوصاف بیان کئے ہیں

کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پوری رغبت، رہبت، اور خشوع و خضوع میں ڈوب کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس سے دعائیں مانگتے ہیں اور یہاں 'دعاء' (دعاء کی ہر دو قسموں) 'دعائے محبت' اور 'دعائے مسئلہ' کو شامل ہے (یعنی اس دعاء سے مراد دونوں قسم کی دعائیں ہو سکتی ہیں جن کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے)..... تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو، جو اس کے پاس ہے ان میں پوری رغبت رکھتے ہوئے اور اس ذات سے اجر و ثواب کا طمع کرتے ہوئے، اس کی سزا اور اپنے گناہوں کی شامت سے لرزہ بر اندام ہوتے ہوئے پکارتے ہیں..... اور مومن کو چاہئے کہ وہ 'خوف' (اللہ تعالیٰ کے ڈر) اور رجاء (اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید) کے درمیان رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے کی کوشش کرے، نیز وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں 'رجاء' (امید) کا پہلو غالب رکھتے، تاکہ اس فرمانبرداری پر وہ اور زیادہ چست، مستعد اور اس (اللہ

تعالیٰ کی بارگاہ میں) قبولیت پر مزید پر امید ہو سکے، اور جب اسے اللہ کی نافرمانیوں میں سے کسی نافرمانی کے فعل کا خیال آئے تو ایسے وقت میں وہ اللہ کے خوف کا پہلو غالب رکھے تاکہ وہ اس خوف کی بناء پر اس نافرمانی کے ارتکاب سے بچ نکلے اور اس طرح اس کی سزا سے بھی نجات پا جائے۔“

⑤..... بعض اہل علم یہ کہتے ہیں: کہ انسان بیماری کی حالت میں رجاء (امید) کا پہلو غالب رکھے، اور صحت و تندرستی میں خوف کے پہلو کو، اس لئے کہ بیمار (اپنی بیماری کے سبب) نرم، مزاج اور کمزور دل ہو جاتا ہے اور یہ بھی بہت ممکن ہوتا ہے کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہو، تو وہ مرجائے اور اللہ عزوجل کے ساتھ وہ اچھا گمان رکھتا ہو۔ جبکہ صحت و تندرستی کی حالت میں انسان بہت زیادہ ہوشیار، تیز، اور درازی عمر کی امید رکھتا ہے، اور یہ سوچ اس کو اکثر غور، اکثر اور کبر پر اکساتی رہتی ہے تو ایسے میں وہ اللہ تعالیٰ کے خوف کا پہلو غالب رکھے تاکہ ان مذموم حالات و خیالات سے وہ محفوظ رہ سکے۔

⑥..... اور اس بارے میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس کی رجاء اور خوف کے دونوں پہلو (بیک وقت) برابر کی سطح پر ہونے چاہئیں، تاکہ زیادہ پر امید ہونا اس کو اللہ تعالیٰ کی سزا اور پکڑ سے بے خوف نہ کر دے اور زیادہ خوف زدہ ہونا، اس کو اللہ کی رحمت سے بالکل مایوس ہی نہ کر دے، اور یہ دونوں طرف کی انتہائیں قبیح (برسی) اور اپنانے والے کو ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔ (والعیاذ باللہ)

وَدَلِيلُ الْخَشْيَةِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي﴾ (البقرة: ۱۵۰)  
 ”اور ’خشیت‘ کے عبادت ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:  
 ”پس تم ان (ظالموں) سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو۔“

□ ⑥ الْخَشْيَةُ: جس ذات سے انسان ڈرتا ہے اس کی عظمت و رفعت اور اس کی کامل بادشاہی کی معرفت پر مبنی ’خوف‘ کو ’خشیت‘ کہتے ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر: ۲۸) ”بلاشبہ اللہ کے بندوں میں سے اس (اللہ) سے ڈرتے وہی ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔“ یعنی علماء حق اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، اس کی کامل بادشاہی (اور اس کے کلی اختیارات و تصرفات کی بناء پر اس سے ڈرتے ہیں تو اس طرح سے یہ (خشیت) خوف کی نسبت زیادہ خاص ہے اور ان دونوں کے مابین فرق اس مثال سے مزید واضح ہو جاتا ہے کہ جب آپ کسی ایسے شخص سے ڈرتے ہوں، جس کے بارے میں آپ یہ نہیں جانتے کہ آیا وہ شخص آپ کو نقصان پہنچانے پر قدرت بھی رکھتا ہے کہ نہیں، تو یہ ’خوف‘ ہوگا، اور اگر آپ کسی ایسے شخص سے ڈرتے ہیں، جس کے بارے میں آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ آپ کو نقصان اور تکلیف دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے تو یہ خشیت ہے اور قبل ازیں جو احکام ’خوف‘ کی اقسام کے ضمن میں رقم کئے گئے ہیں، وہی احکام خشیت کی اقسام کے بعد کے ہیں۔

وَدَلِيلُ الْإِنَابَةِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ﴾ (الزمر: ۵۴)

”اور انابت (یعنی رجوع) کے عبادت ہونے کی دلیل یہ ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے... اور اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ، اور اس کے اطاعت گزار (اور فرمانبردار) بن جاؤ۔“

□ ﴿الْإِنَابَةُ﴾: اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفا شعاری کا دم بھرتے ہوئے اور اس کی نافرمانی سے کلی طور پر بچتے ہوئے اس کی طرف پلٹنا۔ اس اعتبار سے ’انابت‘ اپنے معنی و مفہوم میں ’توبہ‘ کے قریب ہے، البتہ وہ (انابت) اللہ جل شانہ پر اعتماد اور اس ذات کی پناہ پکڑنے (نیز اس کی آغوش رحمت میں آنے) کے اعتبار سے ’توبہ‘ کی نسبت زیادہ رقت اور گریہ زاری کا باعث ہے، لہذا ’انابت‘ بھی دیگر انواع عبادت کی طرح صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے لئے خاص ہے اور بطور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کافی ہے: ﴿وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ﴾ (الزمر: ۵۴) ”اور اپنے رب کی طرف لوٹ آؤ اور اسی کے فرمانبردار بن جاؤ۔“

اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ﴿وَأَسْلِمُوا لَهُ﴾ ”اور اس کے لئے سر تسلیم خم کرو“ اسلام سے مراد شرعی اسلام ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے جملہ شرعی احکام کو من و عن تسلیم کرنا اور ان پر عمل



پیرا ہونا ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ جل جلالہ کے تابع فرماں اور اس کے سامنے جھک جانے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ پہلی قسم ’کوئی اسلام‘ ہے اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے کوئی حکم (یا تکوینی نظام) کے سامنے جھک جانا ہے اور یہ آسمانوں اور زمین میں موجود تمام مخلوقات خواہ وہ مومن ہو یا کافر، نیکو کار ہو یا بدکار (نیز نباتات ہوں، یا حیوانات، یا جمادات، ذوی العقول میں سے ہو یا غیر ذی العقول میں سے) سب کو عام ہے اس سے روگردانی کرنا، یا کبر و نخوت کے بل بوتے پر اس سے راہ فرار اختیار کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ﴾ (آل عمران: ۸۳) ”اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے سب چار و ناچار اسی (ذات) کے تابع فرمان (مسلم) ہیں اور سب کو اسی (ذات) کی طرف پلٹنا ہے۔“

۲۔ دوسری قسم ’شرعی اسلام‘ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے شرعی حکم کو بجالانا اور اس ذات کے حضور اطاعت و وفا شعار کے ساتھ جھک جانا ہے، اور ’اسلام‘ کی یہ قسم انبیاء و رسل علیہم السلام، ان کے پیروکاروں، اور ہر اس شخص کے ساتھ خاص ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی فرمانبرداری میں جھک گیا ہو۔“ اس پر قرآن حکیم میں بہت سے دلائل موجود ہیں، جن میں ایک یہ آیت کریمہ بھی ہے، جسے مؤلف (شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔“

وَدَلِيلُ الْإِسْتِعَانَةِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾

(الفاتحہ: ۵) وَفِي الْحَدِيثِ «إِذَا اسْتَعْنَتْ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ» (۱۲)

”اور ’استعانت‘ کے عبادت ہونے کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور حدیث شریف میں ’استعانت‘ کے عبادت ہونے کے متعلق رسالت مآب ﷺ کا یہ ارشاد ایک واضح دلیل ہے: ”(اے عبد اللہ بن عباس!) جب بھی تم مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے طلب کرو۔“

﴿۳﴾ الاستِغَاثَةُ: کا مطلب ہے مدد طلب کرنا اور اسکی متعدد اقسام ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی قسم: الاستِغَاثَةُ بِاللّٰهِ: (یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا) اور یہ 'استعانت' بندے کا اپنے رب کے حضور انتہا درجے تک عاجز اور منکسر المزاج ہونے، اپنے سارے معاملات کو اس ذات کے سپرد کر دینے، اور اس ذات کے کافی و وافی ہونے کے عقیدے کو شامل ہے، اور یہ 'استعانت' اللہ جل شانہ کی ذات کے سوا کسی اور کو لائق نہیں، جس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (الفاتحہ: ۵) ”کہ (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔“ نیز اس (استعانت) کے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آیت ہذا میں اللہ تعالیٰ نے عامل (نَعْبُدُ) پر معمول (إِيَّاكَ) کو مقدم کیا ہے اور اسی طرح (نَسْتَعِينُ) عامل پر اس کے معمول (إِيَّاكَ) کو مقدم کیا ہے (جبکہ اصل عبارت یوں تھی (نَعْبُدُكَ وَنَسْتَعِينُكَ) لیکن اختصاص کی بناء پر دونوں جگہوں میں مفعول بہ (إِيَّاكَ) کو مقدم کیا گیا ہے)..... اور لغت کا وہ قاعدہ جو قرآن لایا ہے اس کی رو سے، اس چیز کو مقدم کرنا، جو کہ اپنے اصل مقام کے اعتبار سے مؤخر تھی یہ حصر اور اختصاص کا فائدہ دیتا ہے، لہذا اس اعتبار سے 'استعانت' کی اس قسم کو غیر اللہ (یعنی اللہ کے علاوہ کسی اور مخلوق) کے لئے خاص کرنا یا اس کی طرف 'پھیرنا' شرک اکبر ہے جو کہ انسان کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے۔ (والمیاذ باللہ)

۲۔ دوسری قسم: الاستِغَاثَةُ بِالْمَخْلُوقِ: (یعنی مخلوق سے کسی ایسے معاملے کے سلسلے میں مدد مانگنا جس کو حل کر دینے پر وہ (مخلوق) قدرت اور طاقت رکھتی ہو) تو استعانت کی اس قسم کے جائز یا ناجائز ہونے کا انحصار اس چیز پر ہوگا جس کے بارے میں مدد مانگی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر استعانت کوئی نیکی کا کام سرانجام دینے کی غرض سے کی گئی ہے تو یہ مدد مانگنے والے کے لئے جائز اور مدد دینے والے کے لئے مشروع (باعث اجر و ثواب) ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ﴾ (المائدہ: ۲) ”اور تم نیکی اور پرہیز

گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو۔“..... لیکن اگر کسی گناہ کے کام پر کسی سے 'استعانت' کی جائے تو یہ مدد مانگنے والے اور مدد دینے والے دونوں پر حرام ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدہ: ۲) ”اور گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کیا کرو۔“

اور اگر یہ استعانت کسی مباح (جائز) کام کے سلسلے میں لی جائے تو یہ دونوں (مدد لینے اور مدد دینے والے) کے لئے جائز ہے، بلکہ بسا اوقات ایسے کام کے بارے میں مدد کرنے والے شخص کو دوسرے پر احسان کے بدلے میں ثواب سے بھی نوازا جاتا ہے، تو اندریں صورت یہ مدد دینے والے کے حق میں مشروع (باعث اجر و ثواب) ہوگی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (البقرہ: ۱۹۵)

”اور (دوسروں پر) احسان کرو بے شک اللہ نیک کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

❧ تیسری قسم: یعنی مخلوق میں سے کسی زندہ اور ایسے حاضر، شخص سے مدد طلب کی جائے، جو کہ وہ مدد دینے پر نہ قدرت رکھتا ہو نہ اس کا کوئی بس چلتا ہو، تو یہ انتہائی لغو اور بے مقصد کام ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، جیسے کوئی شخص انتہائی بوجھل چیز اٹھانے میں کسی ضعیف و ناتواں اور بوڑھے شخص سے مدد طلب کرے۔

❧ چوتھی قسم: یعنی مردوں سے مطلق طور پر، اور زندہ لوگوں سے کسی ایسے معاملے کے بارے میں مدد مانگنا، جو وہاں موجود نہ ہو، اور وہ زندہ لوگ براہ راست اس معاملے کو حل کرنے کی سکت بھی نہ رکھتے ہوں، استعانت کی یہ قسم 'شرک' ہے، اس لئے کہ یہ صرف ایسے شخص سے متوقع ہو سکتی ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ان لوگوں کو کائنات میں اپنی مرضی سے معاملات کو چپکے سے الٹ پلٹ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

❧ پانچویں قسم: ایسے اچھے اعمال و احوال کے ذریعے مدد مانگنا، جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہوں، اور 'استعانت' کی یہ قسم اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اس کے حکم سے مشروع

(باعث اجر و ثواب) ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (البقرة: ۱۵۳) ”اے اہل ایمان، صبر اور نماز سے مدد طلب کیا کرو۔“

اور کتاب ہذا کے (متن کے) مولف شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ تعالیٰ ! نے استعانت کی پہلی قسم (کے ثبوت میں) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل لی ہے: ﴿إِيَّاكَ تَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (الفاتحہ: ۵) ”کہ الہی! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔“..... اور احادیث رسول ﷺ میں سے آپ کے اس فرمان سے دلیل لی ہے: ﴿إِذَا اسْتَعْنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ﴾ (۱۷) ”اے عبد اللہ بن عباس! (جب تو مدد مانگے تو صرف اور صرف اللہ سے مدد مانگ۔“

وَدَلِيلُ الْإِسْتِعَاذَةِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (الفلق: ۱)

قوله تعالى ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ (الناس: ۱)

”اور استعاذہ (یعنی پناہ طلبی) کے عبادت ہونے کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ ہے: ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (الفلق: ۱) ”(اے نبی) کہہ دو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا اس کی دلیل میں یہ بھی ارشاد ہے۔ ”(اے نبی!) کہو میں انسانوں کے رب، کی پناہ مانگتا ہوں۔“

□ ﴿۳۱﴾ الِاسْتِعَاذَةُ: کسی کی پناہ طلب کرنا، کسی کی پناہ میں آنا ہے اور الإِعَاذَةُ سے

مراد ہے کسی کی، ناپسندیدہ یا تکلیف دہ چیز سے حفاظت کرنا، تو اس اعتبار سے پناہ کا طلبگار جس کی پناہ چاہ رہا ہو اس پر قطعی اعتماد کرنے والا اور اس کی ذات سے دلی وابستگی اور حتی یقین رکھتا ہے، اور دیگر انواع عبادت کی طرح استعاذہ کی بھی کئی ایک اقسام ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی قسم! اللہ تعالیٰ کی ذات کی پناہ طلب کرنا اور یہ استعاذہ کی وہ قسم ہے جو کہ بندہ

مومن کی اپنے حقیقی معبود برحق کے حضور انتہا درجے کی احتیاج، اس کے ساتھ پختہ دلی، وابستگی، اس ذات برحق کے کافی و وافی ہونے کا مکمل یقین اور ہر ایک موذی چیز سے پوری

طرح اس کی حفاظت اور نصرت و حمایت کو شامل ہے، خواہ وہ موذی چیز موجود ہو یا آئندہ اس کے نقصان پہنچانے کا خدشہ ہو، چھوٹی ہو یا بڑی، بشر (انسانوں) میں سے ہو یا غیر بشر (جن و فرشتے وغیرہ) میں سے، اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کے درج ذیل فرامین ہیں:

① ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ (سورۃ الفلق)

” (اے پیغمبر!) کہہ دیجئے، کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے، اور گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔“

② ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، إِلَهِ النَّاسِ، مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْغِيَةِ وَالنَّاسِ﴾ (سورۃ الناس)

” (اے پیغمبر!) کہہ دیجئے، کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، جو لوگوں کا (حقیقی) بادشاہ ہے، جو لوگوں کا (حقیقی) الہ (معبود) ہے، اس دوسرے ڈالنے والے (شیطان) کے شر سے جو (دوسرے ڈال کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے جو لوگوں کے دلوں میں دوسرے ڈالتا رہتا ہے، خواہ وہ جنوں سے ہو یا انسانوں سے۔“

❧ دوسری قسم! اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں سے کسی صفت کے ذریعے (اللہ تعالیٰ کی) پناہ طلب کرنا، جیسے، اس کی جملہ صفات میں سے اس کا کلام ہے، اس کی عظمت و سطوت ہے، اس کی عزت و بزرگی ہے اور اسی طرح کی دیگر صفات ہیں، اور اس کی دلیل آنحضور ﷺ کے یہ ارشادات ہیں:

① ﴿أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ (۱۸)

”میں اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ و کامل کلمات کے ساتھ ہر اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو

(بھی شری چیز) اس نے پیدا کی ہے۔“

﴿۲﴾ «أَعُوذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أَغْتَالَ مِنْ تَحَنُّنِي»<sup>(۱۹)</sup>

”اے اللہ! میں تیری عظمت و بڑائی کے ذریعے تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ

میں اپنے نیچے سے نقصان پہنچایا جاؤں۔“

﴿۳﴾ اور دکھ، درد اور تکلیف کے وقت پڑھی جانے والی دعاء میں آنحضور ﷺ کے یہ دعائیہ

کلمات ہیں: «أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللَّهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَحْدُ وَأَحْذِرُ»<sup>(۲۰)</sup>

”میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس کی قدرت کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں، ہر اس چیز کے شر

سے جسے میں حاضر پاتا ہوں اور (اس سے) بچنا چاہتا ہوں۔“ نیز اس بارے میں آپ کا یہ

قول بھی ہے:

﴿۴﴾ «أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ»<sup>(۲۱)</sup>

”کہ الہی! میں تیری رضا اور خوشنودی کے ذریعے، تیری ناراضگی سے پناہ مانگتا ہوں۔“

﴿۵﴾ اور آنحضور ﷺ کے یہ دعائیہ کلمات (أَعُوذُ بِوَجْهِكَ)<sup>(۲۲)</sup>

”کہ اے اللہ! میں تیری ذات کے (پرنور) چہرے کے ذریعے (تیری ذات کی) پناہ پکڑتا

ہوں۔“

اور یہ کلمات آپ نے اس وقت ارشاد فرمائے جب اللہ جل شانہ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ (الانعام: ۶۵)

”(اے پیغمبر!) کہہ دو، کہ وہ (اللہ) اس بات پر قادر مطلق ہے کہ وہ تم پر تمہارے اوپر

(آسمان کی بلندیوں) سے عذاب بھیج دے۔“

تیسری قسم: مُردوں یا ان غیر حاضر زندہ لوگوں کی پناہ طلب کرنا، جو پناہ دینے پر

قدرت نہ رکھتے ہوں، تو ایسا کرنا شرک ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَأَنَّهُ

كَانَ رِجَالًا مِّنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا﴾ (الجن: ۶)

”اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ، جنوں کے کچھ لوگوں کی پناہ طلب کیا کرتے تھے۔“

چنانچہ ان کے اس فعل نے جنوں کو غرور اور سرکشی میں اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔  
 چوتھی قسم: مخلوق میں سے کسی آدمی یا ان مقامات وغیرہ کی پناہ پکڑنا جن کے ذریعے محفوظ ہو جانا ممکن ہو، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے، اور اس کی دلیل آنحضور ﷺ کا وہ ارشاد گرامی ہے جس میں آپؐ نے (قرب قیامت) ظاہر ہونے والے فتنوں کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

مَنْ تَشَرَّفَ لَهَا تَسْتَشْرِفُ، وَمَنْ وَجَدَ مَلْجَأً أَوْ مَعَاذًا فَلْيَعُذْ بِهِ» (۲۳)

”تو جو شخص بھی ان فتنوں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھے گا، تو یہ فتنے اس کا سامنا کرنے کے لئے (پہلے سے) سیدھے کھڑے ہوں گے، اور جو کوئی شخص (ان حالات میں) کوئی پناہ گاہ یا کوئی محفوظ مقام پالے، تو وہ وہاں اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔“

اس حدیث کو امام بخاریؒ و امام مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے اس پناہ گاہ اور محفوظ جگہ کا (واضح طور پر) ذکر بھی فرمایا ہے:

«فَمَنْ كَانَ لَهُ إِبِلٌ فَلْيَلْحِقْ بِإِبِلِهِ..... الْحَدِيثُ»

”تو جو شخص (ایسے پرفتن دور میں) اونٹ کی سواری رکھتا ہو، تو وہ اپنے اس اونٹ سے جا ملے“

(مطلب یہ کہ اس پر سوار ہو کر کہیں دور نکل جائے یا پھر اسی کی خاطر مدارات میں اپنے آپ کو مصروف رکھے تاکہ ان فتنوں کے شر سے بچ سکے) اس حدیث کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے..... اور

صحیح مسلم ہی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کر لی، جسے اللہ کے نبی ﷺ کے پاس لایا گیا، وہاں پر اس (چور عورت) نے اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی پناہ طلب کی (یعنی ان سے حمایت اور مدد طلب کی)..... الْحَدِيثُ، (۲۴)

اور صحیح مسلم ہی کی روایت میں حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اللہ کے نبی ﷺ سے (مرفوعاً) روایت کرتی ہیں، آپؐ نے فرمایا: يَعُوذُ عَائِذٌ بِالْبَيْتِ فَيَبْعَثُ إِلَيْهِ بَعْثٌ (۲۵) کہ پناہ

پکڑنے والا (اللہ کے) گھر کی پناہ پکڑے گا تو اس پر، اس کی جانب ایک فوج (جماعت) بھیجی جائے گی..... آخر تک) لیکن اگر کوئی شخص کسی ظالم کے شر سے (بچنے کی خاطر کسی کی) پناہ طلب کرے تو (ممکنہ حد تک) اس کو پناہ دینا اور اس کی حفاظت کرنا واجب ہے، اور اگر کوئی شخص اس لئے (کسی کی) پناہ طلب کرتا ہے تاکہ وہ کسی ممنوع کام تک رسائی حاصل کر سکے، یا وہ اس کے ذریعے کسی واجب اور ضروری کام سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتا ہو، تو ایسے میں اس کو پناہ دینا یا اس کی حفاظت کرنا حرام ہے۔“

وَدَلِيلُ الْإِسْتِغَاثَةِ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَبَ لَكُمْ﴾<sup>۱</sup> ”اور ‘استغاثہ’ کے عبادت ہونے کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ”(اے نبی!) (اس وقت کو یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری (وہ) فریاد سن لی۔“ (الانفال: ۹)

□ ﴿الْإِسْتِغَاثَةُ﴾ سے مراد مدد طلب کرنا ہے، اور اس کے نتیجے میں ‘مغیث’ (یعنی مدد کرنے والا) فریاد کرنے والے کو سختی اور ہلاکت سے بچاتا ہے۔ اس کی بھی متعدد اقسام ہیں:

۱۔ پہلی قسم: اللہ عزوجل سے مدد طلب کرنا اور اس سے مشکل اور تکلیف دہ حالات میں فریاد کرنا وغیرہ اور یہ سب سے افضل و اکمل عمل ہے، کیونکہ یہ انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے پیرو کاروں کا طریقہ اور سنت رہی ہے، اس کی دلیل میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے قرآن حکیم کی یہ آیت ذکر کی ہے: ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَبَ لَكُمْ أَتْنِي مِهْدُكُمْ بِأَنْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدَفِينَ﴾ (الانفال: ۹) ”اے نبی، وہ وقت یاد کرو) جب تم اپنے رب سے (میدان بدر میں) فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری (وہ) فریاد سن لی (اور فرمایا) کہ میں یکے بعد دیگرے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تماری مدد کرنے والا ہوں۔

اور یہ دُعا غزوہ بدر کے موقع پر کی گئی، جب اللہ کے نبی ﷺ نے مشرکین مکہ کو دیکھا کہ وہ



ایک ہزار کی تعداد میں ہیں، جبکہ آپؐ کے صحابہؓ کی تعداد تین سو دس آدمیوں سے کچھ اوپر تھی، تب آپؐ اپنے خیمہ (یا چہوترہ) پر تشریف لائے اور اپنے دست مبارک اٹھائے ہوئے، قبلہ رخ ہو کر اپنے اللہ عزوجل کے حضور دعاء گو ہوئے آپؐ یہ فرما رہے تھے:

«اللَّهُمَّ أَنْجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي، اللَّهُمَّ إِنَّ تَهْلِكَ هَذِهِ الْعَصَابَةُ مِنْ أَهْلِ  
الْإِسْلَامِ لَا تُغْبِضُ فِي الْأَرْضِ» (۲۷)

”الہی! جو تو نے مجھ سے (فتح کا) وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما، الہی! فرزند ان اسلام کی اس مختصر جماعت کو اگر آج تو نے ختم کر دیا، تو پھر زمین پر تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔“

آپؐ مسلسل اپنے ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے اپنے رب کے حضور گریہ زاری و فریاد کرتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ کے شانوں سے آپؐ کی چادر نیچے گر گئی، اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپؐ کی چادر کو پکڑا اور (دوبارہ) آپؐ کے کندھوں پر ڈال دی، پھر پیچھے سے آپؐ کو اپنے ساتھ لگا لیا، اور کہا: ”اے اللہ کے نبی! آپؐ کی آپؐ کے رب کے حضور فریاد و گریہ زاری کافی ہے وہ (آپؐ کا رب) آپؐ سے کئے ہوئے وعدہ کو (ضرور اور) جلدی پورا فرمائے گا۔“ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔“

❖ دوسری قسم: مردوں سے فریاد کرنا یا ان غیر حاضر زندہ لوگوں سے جو دادرسی اور مدد کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں، اور ایسا کرنا شرک ہے، اس لئے کہ ایسا فعل صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ان لوگوں کو کائنات کے مختلف امور میں اپنی مرضی سے پوشیدہ طور پر تصرف اور رد و بدل کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ تو اس طرح یہ فریاد کرنے والا شخص (اللہ تعالیٰ کی خاص صفت) ربوبیت سے ایک حصہ ان لوگوں کے لئے خاص کر دیتا ہے (جن سے یہ فریاد کرتا ہے) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمِنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْثِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ أُولَئِكَ مَعَ اللَّهِ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ﴾

”بھلا وہ کون ہے جو لاچار و بے بس کی فریاد رسی کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے، اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے، اور (کون ہے وہ جو) تمہیں زمین کے جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے

ساتھ کوئی اور الہ (معبود) ہے؟ تم لوگ تھوڑا ہی غور کرتے ہو۔“ (النمل: ۶۲)

﴿ تیسری قسم: ان زندہ لوگوں سے فریاد کرنا، جو باشعور اور فریادری پر قدرت رکھتے ہوں، تو یہ جائز ہے، بالکل ایسے ہی، جیسے ضرورت پڑنے پر کسی سے تعاون یا مدد لی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَاسْتَعِذْهُ الْذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الْذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَّدَ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ﴾ (القصص: ۱۵) ”تو جو شخص موسیٰ کی اپنی قوم سے تھا، اس نے موسیٰ سے اس (قبیلے) کے خلاف فریاد کی، جو دشمن کی قوم سے تھا، موسیٰ نے اسے ’مکا مارا‘ تو اس کا کام ہی تمام کر دیا۔“

﴿ چوتھی قسم: ایسے زندہ شخص سے فریاد کرنا، جو فریادری پر قدرت تو نہ رکھتا ہو، مگر فریادی اس کے بارے میں یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو کہ اسے کوئی خفیہ طاقت یا اختیار حاصل ہے، جیسے کوئی ڈوبنے والا شخص کسی اپانچ یا معذور سے فریاد کرے، تو ایسا کرنا ایک تو بالکل بیکار اور لغو ہے اور دوسرے، جس سے وہ فریاد کر رہا ہے اس کے ساتھ یہ مذاق کے مترادف ہے تو اس بناء پر اسے ایسا کرنے سے روکا جائے، اور یہاں اس قسم کی فریاد سے روکنے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ خود ڈوبنے والا شخص ہے، بسا اوقات کوئی دوسرا شخص اس کے اس فعل سے دھوکا کھاتے ہوئے یہ خیال (اپنے دل و دماغ میں) بٹھا سکتا ہے کہ یہ اپانچ اور معذور شخص، جس سے فریاد کی گئی ہے، ضرور اس کے پاس کوئی ایسی خفیہ طاقت اور قوت کا راز موجود ہے، جس کے ذریعے وہ بیٹھے بٹھائے دوسروں کو مصائب و شدائد سے رہائی دلا سکے اور بچا سکے پر قدرت رکھتا ہے۔

وَدَلِيلُ الذَّنْبِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿قُلْ إِنْ صَلَّيْتُ وَنَسِيتُ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ﴾ (الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴) وَمِنْ السَّنَةِ: «لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ» (۲۷)

”ذبح و قربانی کے عبادت ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔“ (اے نبیؐ) کہہ دو، بے شک میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت (قربانی وغیرہ) میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سراطاعت جھکانے والا میں ہوں، اور حدیث شریف میں اسی کی دلیل رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”جس نے کسی غیر اللہ (نبی، بزرگ، پیر و مرشد، صاحب قبر وغیرہ) کے تقرب (کے حصول) کے لئے جانور ذبح کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔“ (العبد باللہ)

﴿۱۱۳﴾ الذَّنْبُ: سے مراد ایک خاص طریقے سے جانور کا خون گرانا کہ جس سے اس کی روح اس کے بدن سے نکل جائے اور ذبح کا یہ عمل کئی ایک اسباب اور وجوہات کی بناء پر وقوع پذیر ہوتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلا سبب: کہ کوئی جانور عبادت کے طور پر ذبح کیا جائے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت اس ذات کی تعظیم کا ارادہ رکھتا ہو اس کے حضور عاجزی و انکساری کا اظہار کرتا ہو اور اس کے تقرب کے حصول کا متمنی ہو، جس کے لئے وہ یہ جانور ذبح کر رہا ہے تو ایسا تعبدی (عمل) صرف اور صرف اللہ عز و جل کے ساتھ اس طریقے کے مطابق خاص ہے جو طریقہ خود اللہ جل شانہ نے مشروع (اور مقرر) فرمایا ہے اور عبادت کی اس قسم (ذبح) کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لئے ادا کرنا، شرک اکبر ہے اور اس بات کی دلیل شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے بھی ذکر کی ہے جو اللہ عز و جل کا یہ فرمان ہے ﴿قُلْ إِنْ صَلَّيْتُ وَنَسِيتُ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا

أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳) ”(اے نبی!) کہہ دو، میری نماز، میری تمام عبادات، (قربانی وغیرہ) میرا جینا اور میرا مرناسب کچھ اللہ، جہانوں کے پروردگار کے لئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں..... آخر تک“

❖ دوسرا سبب: یہ کہ کوئی جانور، کسی مہمان کی عزت افزائی یا کسی کی شادی کے ویسے کے موقعہ پر یا اسی طرح کے کسی عام اجتماع وغیرہ پر لوگوں کو کھانا کھلانے کے لئے ذبح کیا جائے تو اس کا شریعت طاہرہ میں ایک مسلمان کو حکم دیا گیا ہے خواہ یہ وجوب (فرض) کا حکم رکھتا ہو یا مستحب ہونے کا، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ» (۲۸)

”جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت و خاطر مدارات کرے۔“

نیز اس بات کی دلیل اللہ کے نبی ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے: (جو آپؐ نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو ان کی شادی کے موقعہ پر فرمایا تھا: «أَوْ لِمَ وَلَوْ بِشَاةٍ» (۲۹)  
”کہ ولیمہ کر خواہ (کم از کم) ایک بکری کے ساتھ ہی سہی۔“

❖ تیسرا سبب: کہ انسان کوئی جانور خود کھانے کی غرض سے یا ذاتی کاروبار کے لئے یا اسی طرح کی کسی اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ذبح کرے تو اس کا یہ عمل مباح امور کی قبیل سے ہوگا، اس لئے کہ تمام امور اور معاملات میں اصل جواز ہے (الایہ کہ ممانعت کے لئے کوئی واضح شرعی دلیل موجود ہو) اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ﴾ (طہین: ۷۱، ۷۲)

”کیا وہ لوگ دیکھتے نہیں کہ جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہیں، ان میں سے ان کے لئے چوپائے تو ہم نے پیدا کئے اور اب یہ ان کے مالک ہیں“ اور ہم نے ان مویشیوں کو ان کا مطیع (تابع فرمان) بنا دیا ہے کہ ان میں سے کسی پر وہ سوار ہوتے ہیں اور کسی کا گوشت

کھاتے ہیں۔“

اور ’ذبح‘ کی یہ صورت اپنے ’وسیلہ‘ کے مطابق کبھی شرع میں مطلوب ہوگی یا پھر ممنوع ہوگی (مطلب یہ کہ یہ جانور ذبح کرنے کا کون سا ذریعہ اختیار کیا گیا ہے اگر تو وہ شرعاً صحیح اور درست ہے تو جانور ذبح کرنا بھی صحیح ہوگا، وگرنہ پھر ممنوع اور ناجائز ہوگا۔

وَدَلِيلُ النَّذْرِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا﴾ (الدھر: ۷)

اور ’نذر‘ کے عبادت الہی ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”(یہ وہ لوگ ہیں) جو نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔“

□ ﴿۷﴾ مطلب یہ ہے کہ ’نذر‘ کے عبادت الہی ہونے کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے: ﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا﴾ (الدھر: ۷) ”(یہ وہ لوگ ہیں) جو نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر ( سختی) ہر طرف پھیلا ہوگا۔“

□ ﴿۸﴾ آیت کریمہ میں دلالت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو اپنی نذروں کو پورا کرتے ہیں اور یہ اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل (نذر) مان کر اس کو پورا کرنا) کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال میں سے ہر محبوب چیز عبادت (کا درجہ رکھتی) ہے اور اس بات کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے: ﴿وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا﴾

”اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر ہر طرف پھیلا ہوگا۔“

(یعنی حساب و کتاب کے دن سے ڈرنا بھی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے کیونکہ یہی خوف انسان کو برائی سے بچاتا اور نیکی کی رغبت دلاتا ہے، لہذا اللہ کے تیار کردہ عذاب سے ڈر کر گناہ کو چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اختیار کر لینا بذات خود نیکی اور عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔)

اور یہ بات (اچھی طرح سے) جان لیجئے، کہ وہ ’نذر‘ جس کو پورا کرنے اور جس پر کاربند

رہنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے یہاں تعریف کی ہے، اس سے مراد وہ تمام عبادات ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، تو وہ فرضی عبادات، جن کی ادائیگی کے لئے انسان جب ابتداء کر لے تو وہ (ایک طرح سے) ان کو اپنے اوپر لاگو کر لیتا ہے، لہذا ان کو پورا کرنا انسان پر ضروری اور لازم ہو جاتا ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ثُمَّ لَيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (الحج: ۲۹)

”پھر چاہئے کہ وہ اپنا میل پکیل دور کریں، اور اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم (اور آزاد) گھر کا طواف (بھی) کریں۔“

اور نذر کی وہ قسم جس میں انسان کسی بھی چیز کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے جذبے سے کسی ایسے کام کی نذر مان لیتا ہے جو اس پر (عام حالات میں) واجب نہیں، تو یہ ’مکروہ‘ کا حکم رکھتی ہے اور بعض علمائے کرام کا کہنا ہے کہ ایسی نذر کا پابند ہونا حرام ہے، اس لئے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایسی نذر سے روکتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّهُ لَا يَأْتِي بِخَيْرٍ وَإِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ» (۳۰)

”کہ یہ کسی بھلائی کا پیش خیمہ نہیں ہو سکتی (اس کا صرف اتنا فائدہ ہو سکتا ہے کہ) اس کے ذریعے کجوں آدمی سے مال نکلوا یا جاسکے۔“

مگر اس کے باوجود اگر انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے جذبے سے (اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی حد میں رہتے ہوئے) نذر مان لے، تو اس کی انجام دہی اس پر واجب ہوگی، اس لئے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ نَذَرَ أَنْ يُطِيعَ اللَّهَ فَلْيُطِعهُ» (۳۱)

”جس شخص نے اس غرض سے نذر مانی کہ وہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی اس نذر کو پورا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کام کر گزرے۔“

☆..... مذکورہ کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ نذر کا اطلاق عام حالات میں صرف فرض عبادات پر ہوتا ہے۔ اور نذر خاص کا اطلاق، جو کہ انسان کسی چیز کو اللہ عزوجل کے لئے اپنے آپ پر

لازم کر لیتا ہے تو اس 'مذہب خاص' کو علمائے حق نے کئی ایک قسموں میں منقسم کیا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔



## معرفۃ دین الإسلام

(دین اسلام کی پہچان)

الاضْلُ الثَّانِي ①: مَعْرِفَةُ دِينِ الْإِسْلَامِ بِالْأَدِلَّةِ، وَهُوَ: الْإِسْتِسْلَامُ ② لِلَّهِ  
بِالتَّوْحِيدِ ③ وَالْإِنْقِيَادُ لَهُ بِالطَّاعَةِ ④ وَالْبَرَاءَةُ مِنَ الشِّرْكِ وَأَهْلِيهِ ⑤

”دوسرا اصول: دین اسلام کو دلائل کے ساتھ جاننا، اور وہ یہ ہے کہ توحید الہی کو دل و جان سے اپناتے ہوئے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مطیع و سپرد کر دینے، اس کے احکامات کی پیروی کرتے ہوئے اس کا سراپا تابع فرمان بنے رہنے، اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانے والے سے اور اہل شرک سے کلی بیزاری کا نام ہے۔“

□ ① یعنی دین کے تین اصولوں میں سے، دوسرا اصول ’دین اسلام‘ کی دلائل کے ذریعہ معرفت کا حصول ہے، کہ انسان دین اسلام کی پہچان ’کتاب و سنت‘ کے دلائل کے ساتھ کرے۔“

□ ② یعنی دین اسلام اور اگر آپ چاہیں تو مجرد ’اسلام‘ بھی کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ توحید الہی کو دل و جان سے اپناتے ہوئے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مکمل طور پر اس ذات کے سپرد کر دینے اور ساتھ ہی ساتھ ’شرک‘ اور اہل شرک سے قطعی طور پر بیزاری کا نام ہے اور یہ اسلام ان تین بڑے امور کو شامل ہے:

① توحید الہی کو دل و جان سے اپنانا۔

② اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں ڈوبے ہوئے مکمل طور پر اپنے آپ کو اس ذات کے سپرد کر دینا۔

③ شرک اور اہل شرک سے مکمل بیزاری اور ان سے بایکٹ۔



□ ﴿۴﴾ مطلب یہ کہ بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں اپنے آپ کو شرعی طور پر جھکا دے، اس کے لئے سر تسلیم خم کر دے، اس کی اطاعت سے سرمو انحراف نہ کرے، اور یہ اللہ عزوجل کی توحید کے اثبات اور عبادت میں اس ذات کی یکتائی تسلیم کر لینے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے اور یہی وہ 'اسلام' ہے، جس پر بندہ مومن کی مدح سرائی کی جاتی ہے اور اسے ثواب سے نوازا جاتا ہے، اور جہاں تک اس بندے کا اپنے رب کے حضور قدری (یعنی تکوینی) نظام کے تحت جھکنا اور اطاعت کرنا ہے تو اس میں کوئی اجر و ثواب نہیں ہے، کیونکہ اس میں انسان کا کوئی ذاتی حیلہ (یعنی ارادے اور جذبے کے تحت حکم ماننا وغیرہ) نہیں اللہ تعالیٰ قدری (اور تکوینی) اطاعت گزاری کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَالَّذِينَ يَرْجُونَ﴾

”اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے سب چار و ناچار اسی (اللہ واحد) کے تابع فرمان (مسلم) ہیں اور (سب) اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے“ (آل عمران: ۸۳)

□ ﴿۵﴾ اور یہ (الطاعة) اللہ جل شانہ کے جملہ احکامات کو بجالانا اور تمام منکرات سے پرہیز کرنا ہے، اس لئے کہ حکم میں 'اطاعت' اُس حکم کو بجالانا ہے اور نہی میں اطاعت اُس کام سے رک جانا ہے۔

□ ﴿۶﴾ یعنی 'شُرک سے براءت' سے مراد، اس شرک سے قطعی طور پر بیزار ہونا اور اس سے الگ تھلک ہو جانا ہے اور اس سے بیزاری اہل شرک (یعنی اصل میں مشرکین) سے بیزاری ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءُؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدًّا﴾ (الممتحنة: ۴)

”تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے، جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے قطعی بیزار ہیں اور ان سے بھی جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے

ہو، ہم تمہارے (دین کے) منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بیر پیدا ہو چکا تا آنکہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔“

وَهُوَ ثَلَاثُ مَرَاتِبَ ①: الْإِسْلَامُ، وَالْإِيمَانُ،

وَالْإِحْسَانُ، وَكُلُّ مَرْتَبَةٍ لَهَا أَرْكَانٌ ②

”اور دین کے تین درجات ہیں: ۱۔ اسلام، ۲۔ ایمان، ۳۔ احسان،

اور پھر ان تینوں میں سے ہر ایک درجے کے کئی ایک ارکان ہیں۔“

□ ① شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دین کے تین مراتب بیان

کئے ہیں، جن میں کچھ دوسروں پر فوقیت رکھتے ہیں، اور وہ مراتب یہ ہیں، اسلام، ایمان اور احسان۔

□ ② شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے اس قول ”کہ آگے ان تینوں میں سے ہر ایک کے کچھ

ارکان ہیں“ کی دلیل آنحضور ﷺ کا ’حدیث جبریل‘ میں وہ تفصیلی فرمان ہے، جسے امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے جب حضرت جبریل رضی اللہ عنہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم! کی موجودگی میں) آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں پوچھنے لگے، آپ ﷺ نے جواب میں ان کی وضاحت کی اور فرمایا: «هَذَا جِبْرِيلُ نَاكُم يَعْلَمُكُمْ دِينَكُمْ» (۳۲)

”یہ جبریل تھے، آپ کے پاس آئے تھے تاکہ وہ تمہیں تمہارے دین کی تعلیم دیں۔“

فَارَكَانُ الْإِسْلَامِ خَمْسَةٌ ③: شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ

اللَّهِ ④ وَاقَامُ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ، وَحَجُّ بَيْتِ اللَّهِ الْحَرَامِ

تو اسلام کے پانچ ارکان یہ ہیں: ① اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود

بحق نہیں، اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے (سچے) رسول ہیں ② نماز قائم کرنا ③ زکوٰۃ ادا کرنا ④

رمضان المبارک کے روزے رکھنا ⑤ اور بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔“

□۸﴿ یعنی اسلام کے مذکورہ پانچ ارکان کی دلیل، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جس میں وہ کہتے ہیں، کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے“ ① اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ ② نماز قائم کرنا، ③ زکوٰۃ ادا کرنا ④ رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور ⑤ بیت اللہ شریف کا حج ادا کرنا۔“ (۳۳)

□۹﴿ ”اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں“ یہ پورا بیان ایک رکن بن گیا ہے اور یہ مکمل بیان دو حصوں پر مشتمل ہونے کے باوجود اسلام کا ایک مستقل رکن ہے، اس لئے کہ دین میں جملہ عبادات کا وقوع پذیر ہونا انہی دونوں گواہیوں پر منحصر ہے، لہذا کوئی عبادت اس وقت تک قبول نہیں کی جاتی جب تک وہ اللہ عزوجل کے لئے خالص ہو کر نہ کی جائے، اور قبولیت کی اس شرط کو، ’ایک اللہ کی گواہی‘ (یعنی رکن کا پہلا حصہ) شامل ہے، اور اسی طرح کوئی بھی عبادت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتی جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں نہ ہو، اور قبولیت کی اس شرط کو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی (یعنی رکن کا دوسرا حصہ) شامل ہے۔

فَدَلِيلُ الشَّهَادَةِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (آل عمران: ۱۸)

”شہادت توحید (اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی اور وحدہ لا شریک لہ ہونے) کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ”اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اور (یہی گواہی) سب فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے، وہ انصاف پر قائم ہے، اس زبردست حکیم کے سوا حقیقتاً کوئی لائق عبادت نہیں۔“

□۱۰﴿ اس آیت کریمہ میں خود اللہ جل شانہ کی اپنی ذات کی گواہی کا ذکر ہوا ہے کہ اس کیلئے ذات کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں اور اسی عقیدہ توحید پر فرشتوں اور علمائے حق کی بھی

گواہی کا بیان ہے اور یہ بھی کہ اللہ جل مجدہ انصاف پر قائم اور حاکم ہے، پھر اللہ عز و جل نے اپنے اس فرمان سے اپنی ان مذکورہ صفات علیا کی تقریر و توثیق فرمائی ہے: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی عبادت کا حقدار نہیں“ نیز آیت ہذا میں علمائے حق کا عظیم وصف بیان ہوا ہے کہ اللہ جل شانہ نے ان کی بابت یہ خبر دی ہے کہ وہ خود اس کی ذات کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اس کی وحدانیت پر گواہی دینے والے ہیں اور ان علماء کرام سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اللہ کی شریعت طاہرہ (کتاب و سنت میں وثوق) کا علم رکھتے ہیں، اور جن میں انبیاء و رسل علیہم السلام سرفہرست ہیں اور آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ گواہی، اپنے گواہ اور جس بات کے بارے گواہی دی جا رہی ہے دونوں کی عظمت کے اعتبار سے سب سے بڑی گواہی ہے، کیونکہ گواہی دینے والا وہ خود اللہ تعالیٰ ہے، اس کے مقربین فرشتے اور علمائے حق ہیں اور جس بات کی گواہی دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے میں یکتائی اور وحدانیت کی ہے، جس کی تقریر و توثیق آخر میں اس فرمان ربی تعالیٰ سے کی گئی ہے۔ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”کہ اس زبردست حکیم ذات کے سوا کوئی اور عبادت کا حقدار نہیں۔“

وَمَعْنَاهَا: لَا مَعْبُودَ بِحَقِّهِ إِلَّا اللَّهُ (لَا إِلَهَ) نَافِيًا جَمِيعَ مَا يُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ تَعَالَى إِلَّا اللَّهَ مُثَبِّتًا الْعِبَادَةَ لِلَّهِ وَخَذَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ فِي عِبَادَتِهِ، كَمَا أَنَّهُ لَا شَرِيكَ لَهُ فِي مُلْكِهِ ⑩

اور اس شہادت توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں بلکہ (لا إِلَهَ) میں ہر اس چیز کی نفی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کی جاتی ہے، اور (إِلَّا اللَّهُ) میں صرف ایک اللہ کے لئے ہر قسم کی عبادت کا اثبات ہے، اس کی عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں، بلکہ اسی طرح، جیسا کہ اسکی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک اور حصہ دار نہیں ہے۔

⑩ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کے اس قول (وَمَعْنَاهَا) سے مراد یہ ہے کہ

کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اصل مطلب یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا معبود برحق کوئی نہیں، (جبکہ بغیر

حق کے معبودان باطلہ ہو سکتے ہیں) تو کلمہ 'لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ' کی گواہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی زبان اور دل سے یہ اعتراف کرے، کہ اللہ عزوجل کے سوا حق کے ساتھ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس لئے کہ کلمہ میں 'إِلَهَ' معبود کے معنی میں ہے اور 'التَّائِلَةُ' (باب تفعل سے) کا 'التَّعَبُّدُ' معنی کیا گیا ہے اور یہ پورا جملہ (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) بیک وقت نفی و اثبات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ یعنی 'لَا إِلَهَ' نفی جبکہ دوسرا حصہ 'إِلَّا اللَّهُ' اثبات ہے اور لفظ جَلَالَهُ (اللہ) یہاں 'لا' کی محذوف خبر کا 'بدل' ہے اور 'لَا' کی محذوف خبر حق مبدل منہ ہے، تو اس طرح اصل عبارت یوں ہوگی (لَا إِلَهَ حَقٌّ إِلَّا اللَّهُ)

نیز اس پورے جملہ میں 'لَا' کی محذوف خبر (اور وہ حَقٌّ کا کلمہ ہے) مقدر ماننے سے ہمارے لئے درج ذیل اشکال کا جواب واضح ہو جاتا ہے: (اور اشکال یہ ہے): کہ یہ کہنا کیسے ممکن اور صحیح ہے (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جب کہ یہاں دنیا میں (بے شمار) معبودان ایسے موجود ہیں جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے اور جن کا نام خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں 'الْإِلَٰهَةُ' رکھا اور ان کو پوجنے والے بھی اسی نام 'الْإِلَٰهَةُ' سے ہی پکارتے ہیں اور اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ لَمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ﴾ (ہود: ۱۰۱) ”اور جب تیرے رب کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود، جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے۔“ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم 'الوہیت' (عبودیت) کو اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور کے لئے ثابت کریں، جب کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ اپنی اقوام کو یہ کہتے رہے ہیں: ﴿أَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ﴾ (الاعراف: ۵۹) ”ایک اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں“ (تو آیت ہذا میں اللہ کے پیغمبر ﷺ نے بھی غیر اللہ کو الہ کے نام سے ذکر کیا ہے) تو اس اشکال کا جواب (جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں) کہ جملہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ میں لا نافیہ کی خبر مقدر ماننے سے واضح ہو جاتا ہے تو ہم

جواب میں یہ کہیں گے (لَا إِلَهَ حَقٌّ إِلَّا اللَّهُ) کہ ”ایک اللہ کے سوا معبود برحق کوئی نہیں“ اور بقیہ جتنے معبودان ہیں، جن کی اللہ کے سوا پوجا کی جاتی ہے، وہ الٰہتہٗ معبودان تو ہیں، مگر سب خود ساختہ، باطل (یعنی جھوٹے طاغوت) ہیں اور نہ ہی الٰہیت میں سے کچھ حق ان کیلئے ہو سکتا ہے اور اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ﴾ (الحج: ۶۲)

”یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی ’حق‘ ذات ہے اور اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ سب کچھ باطل ہے اور اللہ ہی عالی شان اور کبریائی والا ہے۔“

نیز اس بات کی حقیقت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے: ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ، وَمَنْوَةَ الْغَالِيَةَ الْأُخْرَىٰ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِيَّتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُكُمْ مَا أُنْزِلَ اللَّهُ بِهَِا مِنْ سُلْطٰنٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ﴾ (النجم: ۱۹-۲۳)

”کیا بھلا تم نے لات و عزلی (دیویوں) پر بھی غور کیا؟ اور ایک تیسری (دیوی) منات پر بھی؟ کیا تمہارے لئے تو لڑکے ہوں اور اس (اللہ عزوجل) کے لئے لڑکیاں؟ یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم ہے، یہ تو بس ایسے نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، (ان ناموں کے علاوہ ان کی کچھ حقیقت نہیں) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری، یہ (مشرک) لوگ محض ظن (گمان) کی پیروی کر رہے ہیں یا پھر اس چیز کی جو ان کے دل چاہتے ہوں (یعنی خواہشات نفس کے پجاری ہیں) حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد بھی اس بات کی تائید کرتا ہے ﴿مَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِيَّتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُكُمْ مَا أُنْزِلَ اللَّهُ بِهَِا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ (یوسف: ۴۰) ”اس (اللہ عزوجل) کو چھوڑ کر تم جن (بتوں) کی پوجا کر رہے ہو، کہ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے،

اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں کوئی سند (دلیل وغیرہ) نہیں اتاری۔“

تب مذکورہ بالا بحث کی رُو سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا معنی یہ ہوگا: ”کہ اللہ عزوجل کے سوا حق کے ساتھ اور کوئی معبود نہیں اور جو اس دنیا میں اللہ کے سوا معبودان پائے جاتے ہیں، تو ان کی ان کے ناموں کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں اور نام بھی ان کے صرف ان کے پجاریوں نے رکھ چھوڑے ہیں، تو اس طرح سے ان کی الوہیت (عبودیت کا وصف) جس کا ان کے پجاری دعویٰ کرتے ہیں، حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ اس کے برعکس جھوٹ اور باطل ہے۔

وَتَفْسِيرُهَا الَّذِي يُوَضِّحُهَا، قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ ۖ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ إِنِّي مِنَ الْمُتَعَبِّدِينَ ۚ﴾ (الزمر: ۲۴) ﴿وَجَعَلَهَا ۖ كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ ۖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝﴾ (الزمر: ۲۶) (۲۸۲۲۶)

”اور اس کلمہ شہادت کی تفسیر و تشریح اللہ تعالیٰ ہی کے ان فرامین میں واضح طور پر موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور (اے پیغمبر) وہ وقت یاد کرو، جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا، ”تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، میرا تعلق صرف اس سے ہے، جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری راہنمائی کرے گا اور ابراہیم علیہ السلام یہی کلمہ (عقیدہ) اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گئے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔“

□ ﴿ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست) حُفَّاءَ (جو لوگ ساری دین سے تعلق توڑ کر صرف اور صرف اللہ کی طرف رجوع کر لیں ان) کے امام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل (اور الواعزم) پیغمبر ہیں۔

□ ﴿ (برآء) یہ لفظ کلمۃ البرآءۃ سے صفت مشبہ ہے (یعنی اس میں مبالغہ کا معنی ہے) اور یہ برئ (بیزار) سے زیادہ بلغ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿إِنِّي بِرَاءٌ مِّنْ تَعَبُّدُونَ﴾ ”کہ تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں“..... لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مساوی ہے (یعنی معنی کی ادائیگی میں اس کے مترادف ہے)

﴿۳﴾ سوائے اس ذات کے، جس نے ابتداء ہی میں مجھے فطرت اسلام پر پیدا فرمایا (میرا ان سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو) اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿إِلَّا إِلَٰهِي فَطَرَنِي﴾ یہ اپنے معنی میں (إِلَّا اللّٰهُ) کے مساوی و مترادف ہے، لہذا وہ پاک اور بلند و بالا ذات، جس کا اس کی عبادت میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا، اسی طرح اس کی بادشاہی میں بھی اس کا کوئی ہمسرو سا جہی نہیں بن سکتا، بطور دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے:

﴿إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف: ۵۴)

”خبردار رہو، اس (اللہ) کے لئے ہی ساری مخلوق اور ہر قسم کا حکم (اور اختیار) ہے، بابرکت ہے وہ اللہ (جو) تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

اس آیت کریمہ میں ساری مخلوقات اور ہر قسم کا امر و حکم اور سارے اختیارات صرف اللہ واحد کے لئے محصور (یعنی بند) کر کے رکھ دیئے گئے ہیں، جو کہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ تو اسی یکتا ذات کے لئے ہی مخلوق ہے اور اسی کے لئے ہی امر (حکم) ہے (بالفاظ دیگر) تمام مخلوقات اسی کی ملکیت اور تمام کوئی و شرعی امور اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

﴿۴﴾ سَيَهْدِين: یعنی عنقریب وہ (اللہ) میری حق بات (اور جادہ حق) پر میری رہنمائی فرمائے گا اور مجھے اس پر چلنے اور اس پر کار بند رہنے کی توفیق بھی مرحمت فرمائے گا۔

﴿۵﴾ وَجَعَلَهَا: یعنی اس کلمہ کو باقی رکھ دیا، اور اس کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک ’معبود باطل‘ سے بیزار اور متنفر ہونا ہے۔

﴿۶﴾ يَفِي عَقِبِهِ: مطلب یہ کہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں (اس کلمہ کو رکھ دیا)

﴿۷﴾ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ تاکہ وہ (اس کلمہ کی طرف) رجوع کریں اور شرک سے منہ موڑ لیں۔

وَقَوْلُهُ ﴿قُلْ﴾ يَا هَلْ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿﴾ (آل عمران: ۶۴)



”اور اللہ جل مجدہ کا فرمان ہے: ”(اے نبی) آپؐ فرما دیجئے، کہ اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (اور وہ بات) یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنالے (اس دعوت کو قبول کرنے سے) اگر وہ منہ موڑ لیں تو (ان سے) صاف کہہ دیجئے کہ تم لوگ (اس بات پر) گواہ رہو، ہم تو مسلمان (صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کرنے والے) ہیں۔“

□ ﴿۱۹﴾ قُلْ: یہاں، اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے مناظرہ کے لئے اللہ کے نبی ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے (اور مخاطب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے)

□ ﴿۲۰﴾ ﴿تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ﴾ میں کَلِمَۃ سے مراد یہ ہے ”کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کریں اور نہ کسی اور کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی، کسی اور کو اللہ کے سوا رب نہ پکڑ لے، تو ہم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس سارے کلام کا مجموعہ اصل میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مفہوم ہے، اور آیت کریمہ میں ﴿سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ﴾ کا معنی یہ ہے ”کہ ہم (مسلمان) اور تم (یہود و نصاریٰ) اس عقیدہ توحید میں برابر ہیں۔“

□ ﴿۲۱﴾ مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اللہ عز و جل کے سوا کسی اور کو اپنا رب نہ بنالے، کہ وہ اس کی اس انداز سے تعظیم کرنا شروع کر دے، جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتا ہے، اور اس کی اس طرح سے عبادت کرے، جس طرح سے وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر کسی اور کے حکم کو مضبوطی سے پکڑ لے، (والعیاذ باللہ)

□ ﴿۲۲﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا: یعنی اگر یہ (یہودی و عیسائی) لوگ اس بات سے منہ پھیر لیں جس کی طرف تم ان کو دعوت دیتے ہو۔

□ ﴿۲۳﴾ تو پھر تم (اے اہل ایمان) ان کے سامنے یہ واشگاف اعلان کرو اور اس بات کے اظہار پر ان کو گواہ بھی بنالو، کہ بے شک ہم تو اللہ کے لئے تابع فرمان ہیں اور اس عظیم کلمہ

توحید (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) سے اعراض کرنے اور اس سے بغض و عداوت رکھنے کی جس روش پر تم قائم ہو، اس سے ہم بری الذمہ ہیں (اور ہم تم کو اس کی طرف دعوت دے کر اپنے معبود برحق کے ہاں بھی بری الذمہ ہو گئے ہیں)

وَدَلِيلُ شَهَادَةِ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ ۖ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ۖ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ ۚ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝﴾  
(التوبہ: ۱۲۸)

”اور اس گواہی کی دلیل کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:“  
تحقیق تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے، جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں  
پڑنا اس پر شاق (گزرتا) ہے، تمہاری فلاح (دنوی و اخروی کامرانی) کا وہ بہت زیادہ  
خواہش مند ہے، ایمان والوں کے لئے وہ بڑا شفیع اور رحیم پیغمبر ہے۔“

□ ﴿۳﴾ اللہ کے اس فرمان ﴿مِنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ سے مراد ہے کہ وہ پیغمبر تمہاری ہی جنس  
سے ہے (کوئی فرشتہ یا جن وغیرہ نہیں) بلکہ وہ تمہاری قوم سے اور تم میں سے ہی ایک خاندان  
کے گھر پیدا ہوا اور پر دان چڑھا جیسا کہ (ایک اور جگہ پر) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿هُوَ  
الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ  
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (الجمعة: ۲)  
” (اللہ) وہی تو ہے، جس نے اُن پڑھ لوگوں میں، انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو انہیں  
اللہ (تعالیٰ) کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم  
دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح (اور کھلی) گمراہی میں پڑے تھے۔“

□ ﴿۴﴾ مطلب یہ ہے کہ جو چیز تم پر گراں گزرتی ہے یا تم کو نقصان اور دکھ دیتی ہے، وہی  
چیز اس پیغمبر پر بھی شاق گزرتی ہے اور اسے کرب اور دکھ دیتی ہے۔

□ ﴿۵﴾ یعنی یہ پیغمبر تمہارے فائدے کے حصول اور تم سے ہر طرح کی تکلیف اور دکھ درد  
کے مداوے اور ازالے پر بڑے حریص واقع ہوئے ہیں۔

□ ﴿۱۵﴾ یعنی اہل ایمان کے حق میں بڑے نرم مزاج اور رحم دل ہیں اور آپؐ کی ان صفات کو مؤمنین کے لئے، اس بنا پر خاص ذکر کیا گیا ہے، کہ آپؐ کو کفار و منافقین کے ساتھ جہاد و قتال کرنے اور ان کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کا اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا۔ نیز رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات اس حقیقت پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

”(اے نبی) کہہ دو، کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول (بنا کر بھیجا گیا)

ہوں۔“

اور اس معنی کی بہت ہی زیادہ آیات بینات ہیں جو اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔“

وَمَعْنَى شَهَادَةِ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ: طَاعَتُهُ فِيمَا أَمَرَ، وَتَصَدِيقُهُ فِيمَا أَخْبَرَ، وَاجْتِنَابُ مَا عَنْهُ نَهَى وَزَجَرَ، وَأَنْ لَا يَعْبُدَ اللَّهَ إِلَّا بِمَا شَرَعَ ﴿۱۶﴾

”اور حضرت محمد ﷺ کے ’رسول اللہ‘ ہونے کی شہادت (گواہی) کے معنی یہ ہیں: کہ آپؐ نے جو حکم دیا ہے اس کی اطاعت کی جائے، اور آپؐ نے جو خبر دی ہے، اسے سچ مانا جائے، اور جن امور سے آپؐ نے روکا اور منع کیا ہے اس سے کلی اجتناب کیا جائے، اور اللہ عز و جل کی عبادت صرف اسی طریقہ ہی سے کی جائے جو اس نے مشروع کیا ہے۔“

□ ﴿۱۶﴾ اس گواہی کا مطلب ”کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں“ وہ زبان سے اقرار اور دل کی عمیق گہرائیوں سے ایمان لانا اور تصدیق کرنا ہے کہ حضرت محمد بن عبد اللہ، قریشی، ہاشمی، جن و انس کی تمام مخلوقات کی طرف اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۵۶)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔“

اور اللہ تعالیٰ کی یہ عبادت صرف اس مشروع طریقے کے مطابق ہی درست ہو سکتی ہے،

جسے حضرت محمد ﷺ اللہ کی طرف سے لے کر آئے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (الفرقان: ۱)

”باہرکت ہے وہ ذات جس نے نازل فرمایا فرقان (قرآن) اپنے بندے (حضرت

محمد ﷺ) پر تاکہ وہ (اس کتاب ہدایت کے ذریعے) تمام جہانوں کو ڈرانے والا ہو۔“

اور اس شہادت (گواہی) کا تقاضا یہ ہے کہ (اے مخاطب!) تو ہر اس بات کی دل سے

تصدیق کرے، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے اور جس کام کا آپؐ حکم

دیں اس کی فوری تعمیل کرے اور جس چیز سے آپؐ نے روکا یا خبردار کیا ہے، اس سے تو قطعی

طور پر پرہیز کرے اور بچ جائے اور یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کے مقرر کئے ہوئے

طریقہ کے مطابق کرے، نیز اس شہادت کا یہ بھی تقاضا ہے، کہ تیرا حتمی طور پر یہ عقیدہ نہیں

ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسی ہستی ہیں کہ ان کا (اللہ جل جلالہ کی طرح) ربوبیت میں

بھی حصہ ہے اور جس کی بناء پر آپؐ اس کائنات کے اُمور اور معاملات کو اپنی مرضی سے

بدلنے اور الٹ پلٹ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں یا آپؐ (اللہ جل جلالہ کے ساتھ) عبادت کے

حق میں بھی شریک ہیں (العباد باللہ) بلکہ اس کے برعکس تیرا عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ آپؐ خود

ﷺ اللہ کے وہ بندے ہیں، جن کی عبادت نہیں کی جاسکتی (یعنی عابد ہیں معبود نہیں)، آپؐ وہ

رسولؐ ہیں جن کی تکذیب نہیں کی جاسکتی اور نہ آپؐ خود اپنی ذات اور نہ اپنے سوا کسی اور کے نفع و

نقصان کے مالک ہیں، مگر اس حد تک جو خود اللہ تعالیٰ چاہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي

مَلَكٌ إِنِّي أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ (الانعام: ۵۰)

”(اے محمد!) آپؐ ان سے کہتے کہ: میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ

ہی میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اسی چیز

کی پیروی کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔“

آپ تو اللہ کے مامور بندے ہیں اس لئے آپ صرف اس حکم کی پیروی کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِنِّي لَا أُمِلُّكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا﴾ (الحج: ۲۲، ۲۱)

”(اے نبی!) ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہارے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا، آپ کہیے کہ مجھے اللہ سے ہرگز کوئی بچا نہ سکے گا اور نہ ہی میں اس کے سوا کوئی پناہ گاہ پاسکوں گا۔“

نیز ارشاد ربانی ہے: ﴿قُلْ لَا أُمِلُّكَ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْغَيْرِ وَمَا مَسْنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

”(اے محمد!) ان سے کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی قسم کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں تو صرف ایک خبردار کرنے والا، اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔ ان لوگوں کے لیے جو میری بات سنیں۔“

اور (اے مخاطب!) ان مذکورہ آیات کی روشنی میں تو یہ بات بخوبی سمجھ لے کہ یہاں مخلوقات میں سے کوئی بھی ہستی اللہ وحدہ لا شریک کے سوا عبادت کی مستحق نہیں، نہ رسول اللہ ﷺ اور نہ آپ کے علاوہ کوئی اور مخلوق، اور یہ عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنْ صَلَّاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾

”(اے نبی!) کہہ دو کہ میری نماز، میرے تمام مراسم عبادت (یعنی قربانی وغیرہ) میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ تمام جہانوں کے پروردگار کیلئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی بات کا ہی مجھے حکم دیا گیا ہے اور (اس ضمن میں) سب سے پہلے سر تسلیم خم کرنے والا میں ہوں۔“

اور آپؐ کا تجھ پر یہ حق ہے کہ تو آپؐ کو وہ مقام اور مرتبہ دے، جس مقام اور مرتبہ سے خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نوازا ہے اور آپؐ کا وہ مقام و مرتبہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ)

وَدَلِيلُ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ ۖ وَتَفْسِيرُ التَّوْحِيدِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ﴾ (البينة: ۵)

”نماز، زکوٰۃ اور تفسیر توحید کی، مشترکہ دلیل خالق کائنات کا یہ فرمان ہے: ”اور ان (لوگوں) کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔“

□ ﴿۹﴾ مطلب یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادتیں دین میں سے ہیں اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ﴾ ”اور ان (لوگوں) کو اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی ذات کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ یہ آیت کریمہ عبادت کی تمام قسموں کو شامل ہے، لہذا انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں ان عبادات کی ادائیگی کے وقت اللہ عز و جل کے لیے خالص ہو، حنیف بنے (یعنی صرف اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کرے اور اس پر بھروسہ رکھے) اور صرف اسی ذات کی نازل کردہ شریعت طاہرہ کی پیروی کرتا رہے۔

□ ﴿۱۰﴾ اس کلام الہی میں خاص (اور وہ نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادت ہیں) کا عطف، عام (اور یہ عبادت کی تمام انواع ہیں) پر ہے اس لیے کہ نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی عبادت کی قبیل سے ہیں، مگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہاں انہیں ان دونوں کی، شریعت میں

اہمیت و فضیلت کے پیش نظر الگ ذکر کیا ہے، تو نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ سراسر مالی عبادت ہے، اور اللہ عز و جل کی کتاب قرآن حکیم میں ان دونوں عبادات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

﴿۵۴﴾ **وَذَلِكُمْ** اور یہ اس اسم اشارہ کا مشار الیہ یہ ہے ”کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، دین کو اسی کے لیے خالص کر کے اور اس کے لیے یکسو ہو کر کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔“

﴿۶۶﴾ دینُ الْقِیمَةِ مطلب یہ ہے کہ ٹھوس اور مضبوط، درست اور صحیح ملت کا دین، جس میں کسی قسم کا کوئی ٹیڑھ پن اور کجی نہ ہو، اس لئے کہ یہ اللہ عز و جل کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کا دین بالکل سیدھا اور صحیح ہے۔ جیسا کہ اس کی شہادت میں خود اللہ عز و جل کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ﴾ (الانعام: ۱۵۳)

”اور بلاشبہ یہی میری سیدھی راہ ہے، لہذا اسی پر چلتے جاؤ، اور دوسری راہوں پر نہ چلو، ورنہ وہ (دوسری راہیں) تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا کر جدا کر دیں گی۔“

اور یہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حَقَّاعًا وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ﴾ جس طرح عبادت و نماز کے ذکر کو شامل ہے، اسی طرح یہ حقیقت توحید کا بھی تذکرہ کرتی ہے، اور حقیقت توحید یہ ہے کہ ہر قسم کے شرک سے بیزار اور اس سے منہ موڑتے ہوئے اللہ عز و جل کے لئے خالص ہو کر بندگی کرنا، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے مخلص نہ ہوگا وہ موحد (توحید پرست) نہیں بن سکے گا، اور اسی طرح جس شخص نے اپنی عبادت کو غیر اللہ (مثلاً کسی نبی، ولی، جن یا فرشتے وغیرہ) کے لئے خاص کیا تو وہ بھی موحد (توحید پرست) نہیں ہے۔

وَدَلِيلُ الصَّيَامِ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ  
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرة: ۱۸۳)

”اور رمضان المبارک کے فرض روزے رکھنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”اے اہل ایمان! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔“

﴿﴾ یعنی ان روزوں کی فرضیت کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا  
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾  
”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض  
کئے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔“ (البقرة: ۱۸۳)

اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ”کہ جس طرح  
یہ روزے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔“..... میں چند فوائد درج ذیل ہیں:

﴿﴾ پہلا فائدہ: روزوں کی اہمیت و فضیلت: اس حیثیت سے کہ عز و جل نے انہیں ہم سے  
پہلی امتوں پر فرض کیا تھا، اور یہ اللہ تعالیٰ کی ان روزوں سے محبت کی دلیل ہے اور اس بات کی  
بھی کہ یہ ہر امت کے لئے لازم اور ضروری رہے ہیں۔

﴿﴾ دوسرا فائدہ: اس امت محمد ﷺ پر آسانی اور تخفیف: اس اعتبار سے کہ صرف اس امت  
کو ہی روزوں جیسی عبادت کا پابند نہیں کیا گیا، جس میں بسا اوقات انسانی نفوس و اجسام کو  
مشقت اور تکلیف سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

﴿﴾ تیسرا فائدہ: اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس  
کے دین کو مکمل کر دیا ہے، اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان فضائل کی بھی تکمیل فرمادی ہے جو  
گذشتہ امتوں میں تھے (مگر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے تھے)



□ ﴿﴾ اللہ عزوجل نے اس آیت کریمہ میں روزوں کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ یعنی تم روزوں جیسی عبادت کی ادائیگی اور جو کچھ اس کے نتیجے میں پرہیزگاری اور اللہ کے خوف کی صورت میں صلہ ملتا ہے، کے سبب اللہ عزوجل کی تیار کردہ سزا سے بچ سکو (یا اس کی نافرمانی سے محفوظ رہ سکو) اور اس بڑے فائدے کی جانب اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے اس فرمان میں یوں وضاحت فرمائی ہے: «مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلِ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ» (۳۳)

”جو شخص (روزہ کی حالت میں) جھوٹ بولے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی قطعی ضرورت نہیں کہ یہ شخص اپنے کھانے اور پینے کو چھوڑ دے۔“

وَدَلِيلُ الْحَجِّ ﴿﴾ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (آل عمران: ۹۷)  
 ”اور بیت اللہ شریف کا حج کرنے کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ”اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے، کہ جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی (استطاعت کے باوجود) اس حکم کی پیروی سے انکار کرے، تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔“

□ ﴿﴾ یعنی حج کی فرضیت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ ”اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، وہ اس (گھر) کا حج کرے، اور جو کوئی (استطاعت کے باوجود) اس حکم کی تعمیل سے انکار کرے (تو اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ یہ آیت کریمہ، ہجرت کے نویں سال نازل ہوئی اور اسی وقت حج فرض ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے (اپنے بندوں پر رحمت کے طور پر) یہ فرمایا: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ کہ جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو (صرف اسی پر حج فرض ہے) جس کا مدلول یہ ہے کہ جو

شخص اس کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس پر حج سرے سے فرض ہی نہیں۔

□ ﴿اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾﴾ اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اللہ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے (اسے تو ان تمام دنیا والوں کی نافرمانی کی بھی کوئی پرواہ نہیں)..... اس بات کی دلیل ہے کہ جس شخص نے طاقت رکھتے ہوئے 'حج' چھوڑ دیا تو یہ کفر یہ طرز عمل ہوگا، ایسا کفر یہ عمل، جو جمہور علماء کے مطابق اسے ملت اسلامیہ سے تو نکال باہر نہیں کرے گا (مگر وہ انتہا درجے کا منکر اور کمزور ایمان والا شخص ہوگا۔ (والمیاد بالیہ) اور جمہور علماء رحمہم اللہ! کا یہ موقف حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کی بناء پر ہے کہ: «كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ لَا يَرَوْنَ شَيْئًا مِنَ الْأَعْمَالِ تَرَكُهُ كُفْرًا غَيْرَ الصَّلَاةِ» (۳۵)

”رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کے سوا اور کسی عمل کو ترک کر دینا کفر نہیں خیال کرتے

تھے۔“ (مطلب یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نماز چھوڑ دینا کفر تھا) (والمیاد بالیہ)

الْمَرْتَبَةُ الثَّانِيَّةُ: الْإِيمَانُ ۖ وَهُوَ بِضْعٌ ۙ وَسَبْعُونَ شُعْبَةً ۖ فَأَعْلَاهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى ۖ عَنِ الطَّرِيقِ وَالْحَبَاءِ ۖ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ (صحیح مسلم: ۳۵)

”دوسرا درجہ: (ایمان اور اس کے ارکان کی بحث کے ضمن میں) ایمان کے ستر سے کچھ اور پر شعبے ہیں، جن میں سے اعلیٰ ترین درجہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں) کہنا ہے، اور سب سے ادنیٰ درجہ ایمان، راستے سے ایذا و ضرر رساں چیزوں (کاٹنے وغیرہ) کو ہٹانا ہے اور شرم و حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ (یعنی شاخ) ہے۔“

□ ﴿یعنی دین کے ان درجات میں سے، جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے دوسرا درجہ ایمان ہے۔

□ ﴿الْإِيمَانُ: ایمان کا لغوی معنی ہے 'تصدیق' (سچ ماننا) اور شرعی اصطلاح میں

ایمان سے مراد دل میں سچائی کا اعتقاد، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل پیرا ہونا ہے اور یہ

ایمان ستر (۷۰) سے کچھ زیادہ شاخوں پر مشتمل ہے۔

﴿۹﴾ **النِّضْعُ**: باء کے کسرہ یعنی ذیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور اس کا اطلاق تین کے

عدد سے نو تک ہوتا ہے۔

﴿۱۰﴾ **الشُّعْبَةُ**: کسی چیز کے ایک حصے کو (شعبہ) کہتے ہیں۔

﴿۱۱﴾ **إِزَالَةُ الْأَذَى**: یعنی کسی موذی چیز کو راستے سے ہٹا دینا (إِمَاطَةُ الْأَذَى کا معنی

ہے) اور یہ ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جو کسی بھی گزرنے والے کو اذیت اور تکلیف دے، جیسے کوئی چٹان، کانٹے، کوڑا کرکٹ، گندگی اور بدبودار اشیاء وغیرہ

﴿۱۲﴾ **حیا**: وہ تاثراتی وصف ہے، جو انسان میں شرمندگی و ندامت کے وقت واقع اور

ظاہر ہوتا ہے اور انسان کو مروت کے خلاف کام کرنے سے روکتا ہے۔

☆..... اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کے اس کلام ”کہ ایمان کی ستر (۷۰)

سے کچھ اوپر شاخیں ہیں“ اور اس کلام ’ایمان کے چھ (۶) ارکان ہیں‘ کے درمیان مطابقت پیدا

کرنے کے لئے ہم یوں کہیں گے: کہ ایمان کی وہ قسم، جس کا تعلق اعتقاد سے ہے یا بالفاظ

دیگر وہ ایمان جسے ’عقیدہ‘ سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کے اصول (یا ارکان) تو چھ ہی ہیں، جو

کہ حدیث جبریل ؑ میں ذکر ہوئے ہیں، جب حضرت جبریل الایمنؑ نے آپؐ سے یہ

سوال کیا تھا کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے تو آپؐ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا: ایمان

یہ ہے، کہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے

پیغمبروں پر، آخرت کے دن پر اور اس کی اچھی اور بُری ہر دو طرح کی تقدیر (فیصلے) پر بھی

ایمان لائے۔“ (۳۶)

اور ’ایمان‘ کی وہ قسم جو اعمال، ان کی اقسام اور ان کی اجناس پر مشتمل ہے، تو اس کی

ستر (۷۰) سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں، اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نماز کو بھی ’ایمان

کا نام دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ﴾ (البقرة: ۱۴۳)

”اور اللہ نہیں چاہتا کہ وہ تمہارے ایمان (یعنی نمازوں کو) ضائع کرے۔“

مفسرینؒ کہتے ہیں: کہ اس سے تمہاری وہ نمازیں ہیں وہ تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں، اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اس سے پہلے کہ ان کو کعبہ مشرفہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا، بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔

وَأَرَّكَانُهُ سِتَّةٌ: أَنْ تُوْمِنَ بِاللّٰهِ ۝

”اور ایمان کے چھ ارکان ہیں: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔“

□ ﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ پر ایمان چار (۴) امور کو متضمن (یعنی شامل) ہے:

پہلا: اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان اور وجود باری تعالیٰ پر، فطرت، عقل، شریعت اور حس (واضح طور پر) دلالت کرتی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

### ① اللہ تعالیٰ کے وجود پر فطری دلالت

ساری مخلوق، بغیر کسی سابقہ تفکیر و تعلیم کے، اپنے حقیقی خالق پر ایمان رکھتے ہوئے پیدا ہوتی ہے، اور وہ اپنی فطرت کے اس تقاضے سے سرمو انحراف نہیں کرتی، سوائے اس کے کہ کوئی اس کے دل پر (ایسا خارجی) عامل مسلط ہو جائے، جو اسے اس کی اصل فطرت (اللہ پر ایمان) سے منحرف ہونے پر مجبور کر دے، جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ کے اس فرمان میں آیا ہے:

«مَا مِنْ مَّوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَكْبَاهُ يَهُودًا، أَوْ يَنْصَرَانِهِ، أَوْ يُمَجَّسَانِهِ» (۳۷)

”کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اسلام کی فطرت پر ہی پیدا کیا جاتا ہے، مگر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنادیتے ہیں، یا اسے عیسائی بنادیتے ہیں، یا پھر اسے مجوسی (آتش پرست) بنادیتے ہیں۔“ (العبدان باللہ)

### ② اللہ تعالیٰ کے وجود پر عقلی دلالت

تو یہ اس بناء پر ثابت شدہ ہے، کہ اس کائنات میں مخلوقات کا سابقہ (اول) اور لاحقہ

(آخر) ہے، جس کے لئے ایسے خالق کا ہونا ناگزیر ہے، جو اسے وجود میں لایا ہے، تو یہ بات ممکن ہی نہیں کہ کوئی چیز خود بخود وجود میں آجائے اور نہ یہ ممکن ہے کہ یہ مخلوقات خود اپنے آپ کو وجود میں لائیں، اس لئے کہ کوئی چیز خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اپنے وجود میں آنے سے پہلے خود معدوم (کا لعدم) ہوتی ہے تو ایسی حالت میں وہ خالق کیونکر ہو سکتی ہے؟

اور نہ یہ ممکن ہے کہ یہ (مخلوقات کائنات کی ہستی پر) اتفاقی طور پر وجود میں آگئی ہوں، اس لئے کہ ہر وجود میں آنے والی چیز (یا وقوع پذیر ہونے والی چیز) کے لئے ضروری ہے کہ کوئی موجد (یا محدث) ہو جو اسے وجود میں لاسکے اور اس لئے بھی کہ ایسے انوکھے اور شاندار، ایک دوسرے سے انتہاء کی حد تک مانوس اور مربوط نظام کائنات پر، جو کہ اسباب اور اس کے مسببات کے درمیان اور کائنات میں ایک دوسرے کے باہمی ترابط و تناسق کے درمیان چل رہا ہے، مخلوقات کا وجود اس بات کا قطعی طور پر انکار کرتا ہے کہ وہ محض اتفاقی طور پر (از خود) وجود میں آگئی ہیں، تو جب اتفاقی طور پر وجود میں آنے والی چیز، اپنے وجود کی اصل کے اعتبار سے ہی کسی نظام کے مطابق نہیں تو وہ چیز آگے چل کر اپنی بقاء اور درجہ بدرجہ کمال کے حصول میں کیسے منظم رہ سکتی ہے؟

☆..... اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس صفحہ ہستی پر مخلوقات کا از خود وجود میں آ جانا ناممکن ہے اور نہ یہ کہ وہ محض اتفاقیہ وجود میں آگئی ہیں، تو ان کا لامحالہ کوئی موجد (اور خالق) ہے اور وہ موجد اور خالق رب العالمین (یعنی تمام جہانوں کا پروردگار) ہی ہے، اور اس بات کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے عقلی اور قطعی دلیل 'سورہ طور' میں ان الفاظ میں ذکر فرمائی ہے:

﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ﴾ (الطور: ۳۵) ”یا کیا وہ بغیر کسی چیز کے خود ہی پیدا ہو گئے ہیں، یا یہ خود اپنے آپ کو پیدا کرنے والے ہیں؟“ مطلب یہ ہے کہ نہ وہ خالق کے بغیر پیدا کئے گئے ہیں اور نہ انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے، لہذا اس بات کا تعین ہو گیا کہ ان کا حقیقی خالق، صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے اور اسی بناء پر ہی حضرت

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے، جب رسول اللہ ﷺ کو سورہ طور کی تلاوت فرماتے سنا، اور آپ اس وقت ان آیات پر پہنچے تھے: ﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ أَمْ خُلِقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوقِنُونَ أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصِيطِرُونَ﴾ (الطور: ۳۵-۳۷)

”یا کیا وہ بغیر کسی چیز کے خود ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے آپ کو پیدا کرنے والے ہیں؟ یا آسمانوں اور زمینوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ (اللہ کی قدرتوں پر) یقین ہی نہیں رکھتے، کیا ان کے پاس آپ کے پروردگار کی رحمت کے خزانے ہیں؟ یا یہ ان خزانوں پر حکم چلانے والے ہیں؟“

اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ اس وقت تک مشرک تھے آپ سے ان آیات کی تلاوت سن کر کہنے لگے: قریب تھا کہ میرا دل اڑ کر حلق سے باہر آ جاتا، اور یہ وہ پہلا موقع تھا، جب ایمان نے میرے دل میں جگہ پائی۔ اسے امام بخاریؒ نے اپنی ’صحیح‘ میں مختلف جگہوں پر<sup>(۳۸)</sup> (اور مختلف الفاظ کے ساتھ) روایت کیا ہے۔

یہاں ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں، جو اس بات کو مزید واضح کر دے گی: مثلاً کوئی شخص آپ سے کسی ایسے مضبوط، بلند وبالا اور پُرکشش محل جسے باغات گھیرے ہوئے ہوں، اور اس کے درمیان نہریں بہتی ہوں اور وہ نرم و گداز پھوٹوں اور تخت پوشوں سے بھر پور ہو، نیز اپنے تمام زیب و زینت کے سامان سے وہ مکمل طور پر آراستہ و پیراستہ ہو، کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ کہے: کہ یہ محل اور جو کچھ اس کے بیچ میں کمال کی حد تک نعمتیں ہیں یہ سب اپنے آپ کو خود وجود میں لائی ہیں، یا یہ سب کچھ محض اتفاقی طور پر، بغیر کسی موجد (بنانے والے) کے وجود میں آ گئی ہیں، تو فوری طور پر آپ اس کی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے اور (اس سے بڑھ کر) آپ اسے جھٹلا دیں گے، اور اس کی اس بات کو بے وقوفی پر مبنی شمار کریں گے، تو کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھ لینا جائز اور درست ہوگا کہ یہ کائنات اپنی

زمینوں اور آسمانوں، اپنے افلاک و احوال اور اپنے انتہائی عجیب اور پرکشش نظام سمیت اپنے آپ کو خود وجود میں لائی ہے، یا بغیر کسی 'موجد' کے محض اتفاقیہ اس صفحہ ہستی پر نمودار ہو گئی ہے؟! (ہرگز نہیں)

## ۵) اللہ تعالیٰ کے وجود پر شرعی دلالت

اس بارے میں تمام آسمانی کتابیں شہادت دیتی ہیں کہ جن مخلوقات کی مصلحتوں اور فوائد پر مشتمل جملہ احکام کو وہ لے کر آئی ہیں، اس بات پر واضح دلیل ہیں کہ وہ اس پروردگار حکمت والے کی طرف سے ہیں، جو اپنی مخلوق کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، اور پھر جو تکوینی نظام سے متعلقہ خبریں ان سماوی کتب کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں اور جو کہ واقعات و حوادث کی سچائی پر مشاہد بھی ہیں، اس بات پر صریحاً دلالت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ اس حقیقی پروردگار کی طرف سے ہے، جو جس چیز کی بابت خبر دے، اس کو وجود میں لانے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ اور

## ۶) اللہ تعالیٰ کے وجود پر حسی (شعوری) دلالت کی دو صورتیں ہیں

ایک یہ کہ: ہم عام حالات میں اللہ تعالیٰ کو پکارنے والوں کی دعاؤں کی قبولیت اور دکھ اور تکلیف میں مبتلا لوگوں کی مدد و نصرت آ جانے کو سنتے بھی ہیں اور مشاہدہ بھی کرتے ہیں، جو کہ وجود باری تعالیٰ پر ایک قطعی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ﴾ (الانبیاء: ۷۶) ”اور نوحؑ کو بھی (اپنی رحمت میں داخل کیا) جبکہ ان سب سے پہلے، اس نے (ہمیں) پکارا تو ہم نے اس کی دعا قبول کی۔“

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَبَ لَكُمْ﴾ (الانفال: ۴)

”اور وہ موقع یاد کرو، جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری دعا کو شرف قبولیت سے نوازا... الخ“

اور صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”کہ ایک اعرابی (بدو)

جمعہ کے دن (مسجد میں) داخل ہوا اور اللہ کے نبی ﷺ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو وہ

اعرابی (بدو) کہنے لگا: (اے اللہ کے رسول!) خشک سالی کی وجہ سے مال و اسباب برباد ہو گئے اور کنبہ و قبیلہ بھوک سے تڑپنے لگے ہیں، ہمارے لئے اللہ سے دعاء کیجئے، اس پر آپؐ نے اپنے ہاتھوں کو اللہ کی بارگاہ میں اٹھایا اور دعاء کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے، تو آپؐ ابھی اپنے منبر سے نیچے نہیں اتر پائے تھے کہ میں نے دیکھا بارانِ رحمت کے قطرے آپؐ کی داڑھی مبارک پر ٹپک رہے تھے اور پھر آئندہ دوسرے جمعہ کو وہی اعرابی (بدو) یا کوئی اور کہنے لگا: (اے اللہ کے رسول!) کثرتِ باران سے گھر گر پڑھے اور مال و اسبابِ پانی میں ڈوب گئے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ہماری عافیت کی دعاء کیجئے، آپؐ نے (اُسی وقت) اپنے ہاتھ مبارک اٹھائے اور فرمایا «اللَّهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا»<sup>(۳۹)</sup> کہ ”الہی! اب ہمارے گرد و پیش میں بارش برسا ہمارے اوپر نہیں“ تو آپؐ (اس کے بعد) جس جانب بھی اشارہ فرماتے اس طرف سے بادل چھٹ جاتے۔“

اور یہ دعاؤں کی قبولیت کا سلسلہ آج تک ہر اس شخص کے لئے قابلِ ملاحظہ دلیل ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حضور صدقِ دل سے التجاء کرتا اور قبولیت کی شروط کا اہتمام کرتا ہے۔

اور دوسری یہ کہ: انبیاء علیہم السلام کی واضح نشانیاں، جنہیں معجزات کا نام دیا گیا ہے اور جن کا لوگ مشاہدہ کرتے اور ان کے بارے میں سنتے آئے ہیں، ان ہستیوں کو بھیجنے والی ذات کے وجود پر ایک قطعی دلیل ہیں، اور وہ ذات اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے کہ یہ امور، بشر کی طاقت اور بس سے باہر ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی حمایت اور نصرت میں جاری فرماتا ہے۔ اور اس کی ایک واضح مثال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا، جب ان کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اپنی لٹھی کو سطحِ سمندر پر ماریں، تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے مارا تو وہ پانی بارہ خشک راستوں میں پھٹ گیا اور وہ پانی ان تمام راستوں کے درمیان پہاڑ کی طرح کھڑا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَتَنَافَلَ كُلُّ فَرْقٍ مَّا لَطَوْدِ الْعَظِيمِ﴾ (الشعراء: ۶۳)



”چنانچہ ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ ”اپنا عصا (لاٹھی) سمندر پر مارو۔ چنانچہ سمندر پھٹ گیا

اور اس کا ہر ایک حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح (ساکن و جامد) ہو گیا۔“

اور اس کی دوسری مثال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بڑا معجزہ ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم

سے مردوں کو زندہ اور ان کو ان کی قبروں سے باہر نکال کر کھڑا کر دیتے تھے، اس بارے میں

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (آل عمران: ۴۹)

”اور میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔“

اور ایک جگہ یہ الفاظ ہیں: ﴿وَأَذِ تَغْيِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

”اور جب تو مردوں کو میرے حکم سے زندہ نکال باہر کھڑا کرتا تھا۔“

اور اس ضمن میں ایک تیسری مثال: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا معجزہ ہے، جب آپ سے

قریش مکہ نے یہ نشانی طلب کی، تو آپ نے چاند کی طرف اشارہ کیا، تو وہ پھٹ کر دو ٹکڑے

ہو گیا، جسے لوگوں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھا۔“ اس کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿اَفْتَتَبَتِ السَّاعَةُ وَالنَّشَقُ الْقَمَرُ، وَانْ يَرَوْا آيَةً يُعَرِّضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾

(القدر: ۲۱)

” (قیامت کی گھڑی) قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا، یہ کافر، خواہ کوئی بھی معجزہ دیکھ لیں، تو

اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے، جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔“

تو یہ تمام حسی (اور شعوری) نشانیاں اور معجزات، جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی حمایت

و نصرت کیلئے جاری فرماتا ہے اس ذات باری تعالیٰ کے وجود پر قطعی اور واضح دلالت کرتی ہیں۔

دوسرا: اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان: مطلب یہ ہے کہ وہ ذات، یکتا پروردگار ہے، جس

کا نہ کوئی شریک و ساجھی ہے اور نہ مددگار“ اور الرَّبُّ: وہ ہوتا ہے، جس کی مخلوق ہو، جس کی

بادشاہی ہو اور جس کا اختیار چلتا ہو، لہذا مذکورہ تعریف کی روشنی میں، نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی

خالق (پیدا کرنے والا) ہو سکتا ہے، نہ اس اللہ کے سوا کوئی اور حقیقی بادشاہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی

اس کے سوا ہر قسم کے معاملے کا کسی کو اختیار ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿أَلَا لَهُ

الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (الاعراف: ۵۴) ”خبردار اسی ذات کے لئے ہی ساری مخلوق اور ہر قسم کا معاملہ ہے۔“ نیز ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ﴾ (فاطر: ۱۳)

”یہ ہے اللہ (کی شان) جو تمہارا پروردگار ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اور اسے چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو، وہ تو ایک ’پرکاہ‘ کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔“

اور مخلوق میں سے کسی ایک کے بارے میں (آج تک) یہ علم نہیں ہو سکا کہ کسی نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کیا ہو، سوائے اس شخص کے، جو کبر و نخوت میں حد سے بڑھ جائے اور بغیر اعتقاد کے ایسی بڑی بات کہہ دے، جیسا کہ فرعون سے سرزد ہوا تھا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا: ﴿أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى﴾ (النازعات: ۲۴) ”کہ میں تمہارا بڑا رب ہوں“ اور اس نے یہ بھی کہا تھا:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَلَأَ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرِي﴾ (القصص: ۲۸)

”اے میری قوم کے سردارو، مجھے اپنے سوا تمہارے کسی اور معبود کا علم نہیں۔“

لیکن فرعون کے یہ بول بغیر عقیدہ کے تھے (یعنی جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس پر وہ یقین نہیں رکھتا تھا)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَجَعَلُوا بَيْنَهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلُمًا وَعُلوًا﴾

”اور انہوں نے اس راہِ ظلم اور تکبر و انکار کو دیا، حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے، (کہ موسیٰ

سچے ہیں)“ (النمل: ۱۳)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ فرعون سے کہا اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حکایت کی ہے۔ ﴿لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَايِرَ وَاقِنِّي لَا ظَنُّكَ يَفِرُّعُونَ مَثْبُورًا﴾ (الاسراء: ۱۰۲) ”تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں اور

میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے۔“

اور اسی بناء پر ہی مشرک لوگ باوجود اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں شرک کرنے کے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّعٰوِیَّ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَیْءٍ وَهُوَ یَجْبِرُ وَلَا یَجَارُ عَلَیْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ فَأَنِّیْ تُسْحَرُونَ﴾

(المؤمنون: ۸۳ تا ۸۹)

”اے نبی! آپ ان سے پوچھئے کہ: اگر تمہیں کچھ علم ہے تو بتا دو کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کا ہے؟ وہ فوراً کہہ دیں گے کہ ’اللہ کا‘ ہے۔ آپ ان سے کہئے، پھر تم نصیحت قبول کیوں نہیں کرتے؟ پھر ان سے پوچھئے: کہ سات آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ فوراً کہہ دیں گے: کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے، آپ کہئے، پھر تم اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں؟ پھر آپ ان سے پوچھئے کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ، ہر چیز پر حکومت کس کی ہے؟ اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے، مگر اس کے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں مل سکتی، وہ فوراً کہیں گے: اللہ ہی ہے“ آپ ان سے کہئے، پھر تم پر کہاں سے جادو چل جاتا ہے؟“

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَیْنِ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُولُنَّ

خَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ﴾ (الزخرف: ۹)

”اور (اے نبی!) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یقیناً

کہیں گے: کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا جو بڑا زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَیْنِ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنِّیْ یُفَكِّكُنَّ﴾ (الزخرف: ۸۷) ”اور (اے پیغمبر!) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا

کیا ہے؟ تو یقیناً کہیں گے کہ ’اللہ نے‘ پھر انہیں کہاں سے دھوکا لگ جاتا ہے؟“

اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم تمام کوئی و شرعی امور کو شامل ہے (اور تفصیل اس کی یہ ہے) کہ

جس طرح وہ کائنات میں اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق تدبیری فیصلے کرتا ہے، اسی طرح وہ اس کائنات میں اپنی حکمتوں کے تقاضوں کے مطابق عبادات کو مشروع کرنے اور (اپنے بندوں کے) معاملات سے متعلقہ احکامات کو نافذ کرنے پر بھی حاکم ہے، تو جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ عبادات میں کوئی مشروع (شرعی احکام نافذ کرنے والا) پکڑ لیا یا اس حاکم اعلیٰ کے ساتھ کوئی حاکم بنالیا، تو اس نے واضح شرک کا ارتکاب کیا اور وہ اپنا ایمان بھی ثابت نہ رکھ سکا۔“ (والعیان باللہ)

تیسرا: اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر ایمان: یعنی اس بات پر ایمان کہ وہ ذات یکتا اور معبود برحق ہے، اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں۔“ اور کلمہ الالہ، المآلۃ کے معنی میں ہے، یعنی معبود (مفعول کے وزن پر) جس کی محبت میں سرشار اور جس کی عظمت کے معترف ہوتے ہوئے اس کی بندگی کی جائے۔“ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَهُكُمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ (البقرہ: ۱۶۳)۔ ”اور تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں، وہ بہت زیادہ رحم کرنے والا مہربان ہے۔“.....

اور سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾  
”اللہ نے خود بھی اس بات کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔“ (آل عمران: ۱۸)

لہذا ہر وہ چیز، جسے اللہ جل شانہ کے ساتھ معبود مان کر اس کی عبادت کی جائے، تو اس کی وہ الوہیت (کی صفت) باطل قرار پائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ذَلِكِ بَأْسَ اللَّهِ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ﴾  
”یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ذات ہے، اور اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ سب کچھ باطل ہے اور اللہ ہی عالی شان اور کبریائی والا ہے۔“ (الحج: ۶۲)

اور اسی طرح اللہ کے سوا عبادت کی جانے والی چیزوں کا نام آلہۃ (یعنی معبود) رکھنے سے ان کو اصل الوہیت کا حق نہیں مل سکتا، کیونکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا (مشرکین مکہ کے بتوں) لات، منات اور عززی کے بارے میں فرمان ہے: ﴿إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِيَّتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ (النجم: ۲۳)

”یہ تو بس ایسے نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ (تعالیٰ) نے تو ان کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری۔“

اور حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں، جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَتُجَدُّونَ نِیْیَ فِیْ أَسْمَاءٍ سَمِیَّتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ (الاعراف: ۷۱)

”کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے؟“

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں، جو بات انہوں نے اپنے دو قیدی ساتھیوں سے کہی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿هَؤُلَاءِ أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهِ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِیَّتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ (یوسف: ۳۹، ۴۰)

”کیا بہت سارے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ کی ذات، جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جس کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند (فرضی) نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ (تعالیٰ) نے ان کے لئے کوئی سند (دلیل) نہیں اتاری۔“

اور اسی وجہ سے ہی اللہ کے پیغمبروں علیہم السلام نے اپنی قوموں کو یہ کہتے ہوئے دعوت توحید دی (أَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ) ”کہ تم اللہ واحد کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں“ لیکن مشرکین نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی اس دعوت کو قبول کرنے سے

انکار کر دیا، اور اللہ کے سوا اور جھوٹے معبود پکڑ لئے، جن کی وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ عبادت کرتے، ان سے مدد طلب کرتے اور ان سے مشکلات و مصائب میں فریادیں کرتے تھے، جبکہ اللہ جل شانہ نے مشرکین کے ان معبودان باطلہ کو (اپنا حقیقی معبود) پکڑنے کے عمل کو دو عقلی دلیلوں سے باطل قرار دیا۔

## پہلی دلیل

کہ ان معبودان باطلہ میں، جن کو ان لوگوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے، الوہیت نام کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی، وہ خود عاجز و بے بس مخلوق ہیں، جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور نہ اپنے عبادت گزاروں کو کوئی فائدہ بہم پہنچا سکتے ہیں، نہ ان سے کوئی دکھ یا تکلیف دور کر سکتے ہیں، نہ ان کے لئے ان کی زندگی اور موت کے مالک بن سکتے ہیں، نہ آسمانوں میں کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ ہی (ملکیت سے ہٹ کر) کسی چیز میں حصے دار ہیں، بطور دلیل اللہ جل شانہ کے درج ذیل فرامین کافی ہوں گے:

① ﴿وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ وَلَا يَمْلِكُونَ

لَا أَنْفُسَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا﴾ (الفرقان: ۳)

”اور لوگوں نے اللہ کے سوا کئی اور الہ (معبود) بنا ڈالے، جو کوئی چیز پیدا تو کیا خاک کریں گے وہ تو خود پیدا کئے گئے ہیں، انہیں خود اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ اختیار نہیں اور نہ ہی انہیں کسی کو مارنے، زندہ کرنے اور مردہ کو اٹھا سکنے کا کچھ اختیار ہے۔“

② ﴿قُلِ ادْعُوا إِلَٰهَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ

وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍَ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ وَلَا تَنْفَعُ

الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ﴾ (سبا: ۲۲، ۲۳)

”(اے نبی!) ان سے کہئے، کہ جن کو تم اللہ کے سوا الہ (معبود) سمجھ رہے ہو، انہیں پکار کر

دیکھ لو، وہ تو آسمانوں اور زمین کے مابین و درمیان میں ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے، نہ ہی ان

موجودات میں ان کی کچھ شرکت ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی اللہ (تعالیٰ) کا مددگار ہے، اس کے ہاں صرف اس کی سفارش فائدہ دے سکتی ہے، جس کے لئے وہ خود اجازت دے۔“

﴿۳﴾ اَيُّشِرْ كُونْ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ وَلَا يَسْتَعِيضُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿ (الاعراف: ۱۹۱، ۱۹۲)

”(کیسے نادان ہیں) یہ لوگ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں، جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد پر ہی قدرت رکھتے ہیں۔“

تو جب ان معبودان باطلہ کا (عاجزی و بے بسی میں) یہ حال ہے (جو کہ آیات میں ذکر ہوا ہے) تو ان کو اپنا معبود و معبود پکڑ لینا غایت درجہ کی بے وقوفی اور سب سے بڑا بطلان ہوگا۔

## دوسری دلیل

یہ ہے کہ مشرک لوگ اس بات کا اقرار کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ ہی کی وہ یکتا ذات ہے جو جہانوں کا پروردگار اور ان کو پیدا کرنے والا ہے، اسی کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہی ذات ہے، جو پناہ دیتی ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دی جاسکتی، تو ان کا یہ اقرار اس بات کو لازم ٹھہراتا ہے کہ جس طرح وہ اللہ جل شانہ کو اس کی ربوبیت میں یکتا مانتے ہیں، بعینہ اس کو الوہیت میں بھی ایک تسلیم کریں۔ نیز اس بات کی وضاحت اللہ جل شانہ کے درج ذیل ارشادات سے بخوبی ہو جاتی ہے:

﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَخَرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لَهُ آندَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿

”اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی (اور اس کی عبادت اس لئے کرو) تاکہ تم پر ہیزگار بن سکے، اس (اللہ) کی عبادت کرو، جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش (بچھوٹا) اور آسمان کو چھت بنا دیا اور آسمان سے

پانی برسا یا، جس سے تمہارے کھانے پینے کو پھل پیدا کئے، لہذا دوسروں کو اللہ کا شریک نہ بناؤ اور یہ باتیں تم جانتے بھی ہو۔“ (البقرہ: ۲۲، ۲۱)

② ﴿وَلَيْسَ سَاءَ لَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لِيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾ (الزخرف: ۸۷)  
”اور اگر آپ انہیں پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے، تو یقیناً کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے، پھر انہیں کہاں سے دھوکا لگ جاتا ہے۔“

③ ﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ قَدْ لَكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّى تُصِرُّوْنَ﴾ (یونس: ۳۱، ۳۲)

”ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور کون جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالی کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ کہو، پھر تم (مخالفت سے) کیوں نہیں بچتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟“

چوتھا: اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیاء پر ایمان: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان اسمائے حسنیٰ اور صفات علیاء کو ماننا اور ثابت شدہ تسلیم کرنا، جن کو اس ذات باری تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن حکیم) اور سنت رسول (حدیث شریف) میں ذکر فرمایا ہے، اسی انداز پر، جو کہ اس ذات کے شایان شان ہے، بغیر کسی تحریف (کہ نام اور صفت کو اس کے اصل معنی سے ہٹا دینا جس کے لئے اس کو وضع کیا گیا ہو) اور تعطیل (کہ نام اور صفت سرے سے معطل ہی کر دینا) اور بغیر تکلیف (کہ نام اور صفت کی کوئی اختراعی صورت تشکیل دینا) اور تمثیل (کہ نام اور صفت کے لفظی اشتراک کی بناء پر ایک ذات کو دوسری ذات کی مانند قرار دینا) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي



أَسْمَائِهِ سُبُجُزُونَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿الاعراف: ۱۸۰﴾

”اور اللہ کے (سارے) نام اچھے ہیں، تو اُس کو اُن اچھے ناموں سے پکارو، اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے نام رکھنے میں راسی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔“

اور سورۃ الروم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

”اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی شان بالاتر ہے (یعنی اس ذات کی بلند مثال ہے) اور وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔“ (الروم: ۲۷)

اور سورۃ الشوریٰ میں یہ ارشاد ہوا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (آیت: ۱۱)

”اس ذات کی مانند کوئی چیز نہیں سننے والا، دیکھنے والا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کے (اسماء و صفات کے) اس مسئلہ میں دو گروہ گمراہ ہوئے ہیں:

### پہلا گروہ: الْمُعْطَلَة

جنہوں نے یہ گمان کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات یا ان میں سے بعض کا سرے سے انکار ہی کر دیا، کہ ان کو ماننا یا ان کا اثبات ’تشبیہ‘ کو لازم قرار دیتا ہے اور ’تشبیہ‘ سے وہ یہ مراد لیتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کی مخلوق کے مشابہہ قرار دینا اور ان کا یہ گمان درج ذیل وجوہات کی بناء پر باطل اور لغو ہے:

**پہلی وجہ:** کہ ایسا گمان کرنا جھوٹے لوازمات کو لازم قرار دیتا ہے، جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اپنے کلام میں تناقض و تضاد وغیرہ اور تفصیل اس کی یہ ہے: کہ اللہ جل شانہ نے اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں اپنے اسماء و صفات کا اثبات فرمایا ہے اور اس بات کی نفی کی ہے کہ مخلوق میں سے کوئی چیز اس کی مانند ہو سکتی ہے۔“ تو اگر اب اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے اثبات سے ’تشبیہ‘ لازم آتی ہے، تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے کلام میں تناقض بھی لازم آئے گا اور

یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا کچھ حصہ دوسرے حصے کی تکذیب کرتا ہے، (العیاذ باللہ)

❖ **دوسری وجہ:** کہ کسی دو چیزوں کے نام اور صفت میں متفق ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب وہ حقیقت میں بھی ایک جیسی ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ دو شخصوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس اعتبار سے ایک دوسرے سے متفق ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک انسان ہے، سننے والا، دیکھنے والا اور بولنے والا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اب انسانی معانی (یعنی خدوخال اور حرکات و سکنات وغیرہ) اور سننے، دیکھنے، اور بولنے کی کیفیات میں بھی بالکل ایک جیسے ہیں، اسی طرح آپ مختلف (جنسوں کے) جانوروں کو دیکھتے ہیں کہ ان سب کے ہاتھ بھی ہیں، پاؤں بھی ہیں اور آنکھیں بھی، مگر ان کے (محض ناموں کے اتفاق سے) یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اب ان کے ہاتھ، ٹانگیں، آنکھیں (اور دیگر اعضاء وغیرہ) کیفیات میں بھی ایک جیسے ہیں۔

تو جب یہ اختلاف مخلوقات کی ان اشیاء میں ظاہر اور واضح ہے جو ناموں اور صفتوں کی حد تک آپس میں متفق ہیں تو خالق اور مخلوق کے اسماء و صفات میں لفظی اتفاق کے باوجود کیفیات کا اختلاف زیادہ بڑا اور واضح ہوگا۔“

### دوسرا گروہ: الْمُشَبَّهَة

یہ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کی مخلوق کے مشابہہ قرار دیتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا اثبات کیا ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں یہ عقیدہ، کتاب و سنت کی نصوص کی دلالت کا تقاضا ہے، جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے الفاظ سے خطاب کرتا ہے، جس کو وہ سمجھ سکتے ہوں، تو ان کا یہ گمان کئی وجوہات کی بناء پر باطل ہے، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

❖ **پہلی وجہ:** اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ مشابہت 'امر باطل ہے'، جسے عقل اور

شریعت دونوں باطل قرار دیتی ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ کتاب و سنت کی نصوص ایک باطل اور لغو بات کا تقاضا کریں۔“

دوسری وجہ: یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس انداز سے خطاب فرماتا ہے کہ جسے وہ بخوبی سمجھ سکیں، لیکن یہ خطاب کسی چیز پر دلالت کرنے والے لفظ کے اصل معنی کے اعتبار سے ہوتا ہے (نہ کہ اس کی حقیقت یا کنہہ کے اعتبار سے) اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء و صفات کا تعلق ہے، تو یہ ان امور سے متعلقہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق سے اوجھل رکھا ہے، اور یہ مخلوق کی سمجھ و عمل سے باہر ہیں..... تو

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے سننے کی صفت کا اثبات فرمایا ہے کہ وہ سَمِیعٌ ہے، تو معنی کے اصل کے اعتبار سے یہ بات معلوم ہے کہ سماعت سے مراد ”آوازوں کا ادراک ہے“، لیکن اس ’سماعت‘ کی حقیقت خاص طور پر جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، معلوم نہیں ہو سکتی، کیونکہ ’صفت سماعت‘ کی کیفیات کی حقیقت، مخلوقات تک میں بھی مختلف ہوتی ہیں اور یہ اختلاف خالق و مخلوق کے درمیان تو بہت ہی واضح اور بڑا ہوگا..... اسی طرح جب اللہ جل شانہ نے اپنی ذات کے بارے میں یہ خبر دی ہے کہ وہ اپنے عرش پر ’مستوی‘ ہے، تو یہ ’استواء‘ اپنے اصل معنی کے اعتبار سے تو معلوم اور واضح ہے، مگر اس ’استواء‘ کی حقیقت اور اصل کیفیت خاص طور پر اللہ جل جلالہ کا اپنے عرش پر مستوی ہونا غیر معلوم (یعنی مجہول) ہے، اور اس لئے بھی کہ ’استواء‘ کی حقیقت مخلوق کے درمیان میں بھی تو مختلف ہے، مثلاً: ایک جگہ پر مستقل رکھی گئی کرسی پر ’استواء‘ کسی اونٹ کی پشت (کوہان) پر رکھے گئے، پُر مشقت اور ناپسندیدہ کچاوے پر استواء جیسا نہیں ہو سکتا..... تو جب یہ فرق مخلوق کے حق میں ثابت شدہ ہے، تو خالق اور مخلوق کے درمیان ’استواء‘ کی حقیقت میں اختلاف زیادہ واضح اور بڑا ہوگا۔

☆ اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس طرح سے ایمان جو ہم نے بیان کیا ہے، اہل ایمان کے لئے جلیل القدر ثمرات کا باعث ہے، جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

﴿ پہلا اثر: توحید باری تعالیٰ کی تحقیق اور اس پر عملدرآمد اس طرح سے کہ ایک مومن موجد شخص اس کی ذات کے سوا نہ کسی سے اُمید رکھتا ہے، نہ کسی سے خوف کھاتا ہے اور نہ اس کے علاوہ کسی کی بندگی کرتا ہے۔

﴿ دوسرا اثر: اللہ جل شانہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیاء کے تقاضا کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ادراک اور اس کی کمال محبت کا حصول۔

﴿ تیسرا اثر: اللہ جل شانہ کی بندگی کی تحقیق اور اس پر عملدرآمد اس طرح کہ جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو بجالانا اور جس چیز سے روکا ہے اس سے بچ جانا۔

وَمَلَأَ ثَلَاثَتَهُ ۖ ﴿ اور اس کے فرشتوں پر ایمان لانا ۖ

﴿ ۳۱ ﴾ اَلْمَلٰٓئِكَةُ: پوشیدہ جہان میں بسنے والی مخلوق، اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار اور اس کے تابع فرمان بندے ہیں، جن میں ربوبیت والوہیت کی خصوصیت نام کی کوئی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو نور سے پیدا کیا ہے اور انہیں اپنے حکم کی بجا آوری کی خصوصیت ودیعت فرمائی ہے اور اس حکم کو نافذ کرنے کی قوت و طاقت بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ﴾

”اور جو مخلوق (فرشتے) اس کے حضور میں ہیں وہ اس کی بندگی سے اکڑتے نہیں اور نہ ہی وہ اکتاتے ہیں، وہ دن رات اُس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور کبھی دم نہیں لیتے۔“ (الانبیاء: ۲۰، ۱۹)

ان فرشتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے انہیں کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی قصہ معراج کے حوالے سے ایک حدیث ذکر ہوئی ہے، جس میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کو آسمان میں بیعت معمر (فرشتوں کا قبلہ) دکھایا گیا، جس میں یومیہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں.....

تو جب وہ نماز سے فارغ ہو کر نکل جاتے ہیں تو دوبارہ اس کی طرف آنے کی (آج تک اُن کی) باری نہیں آئی۔“ (۴۰)

اور فرشتوں پر ایمان درج ذیل چار امور کو شامل ہے:

۱۔ پہلا: فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا

۲۔ دوسرا: جن فرشتوں کے اسماء (ناموں) کا علم ہو جائے، تو ان کو اُن کے انہی ناموں کے سمیت دل سے سچ مان لینا، جیسے حضرت جبریل علیہ السلام حضرت اسرافیل علیہ السلام وغیرہ ہیں اور جن کے ناموں کا علم نہ ہو سکے تو ان پر اجمالی ایمان لانا۔

۳۔ تیسرا: فرشتوں کی جن صفات کے بارے میں علم حاصل ہو جائے تو ان پر ان کی صفات سمیت ایمان لانا، جیسے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں تو ان کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے یہ خبر دی ہے کہ آپؐ نے ان کو اس صفت میں دیکھا ہے، جس پر وہ پیدا کئے گئے ہیں، کہ ان کے چھٹو پر تھے، جنہوں نے پورے اُفق کو بھر رکھا تھا۔“ (۴)

اور کبھی یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدمی کی شکل و صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں، جیسے حضرت جبریل الامین، نے جب ان کو اللہ تعالیٰ نے، حضرت مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا، تو انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی خاطر ایک واضح اور سیدھے بشر (آدمی) کی ہیئت (شکل و صورت) اختیار کر لی اور اسی طرح جب حضرت جبریل الامین علیہ السلام، اللہ کے نبیؐ کے پاس آئے اور آپؐ اس وقت اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما تھے، تو ایسے آدمی کے وصف میں آئے کہ ان کے انتہائی سفید کپڑے تھے، انتہائی سیاہ بال تھے اور ان پر سفر کی ٹکان وغیرہ کے آثار تک دکھائی نہ دیتے تھے اور نہ اُن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی پہچانتا تھا، تو حضرت جبریل علیہ السلام، اس انسانی صورت میں اللہ کے نبیؐ کی طرف رخ کر کے دو زانو بیٹھ گئے اور اپنی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنی دونوں رانوں پر رکھ لیں اور پھر اللہ کے نبیؐ سے اسلام، ایمان، احسان، قیامت اور اس کی علامات کے بارے میں سوالات کئے، جن کا جواب نبی محترم ﷺ نے دیا، بعد ازاں حضرت جبریل الامین علیہ السلام وہاں سے چلے گئے، تو پھر اللہ کے نبیؐ نے فرمایا: یہ جبریل امینؑ تھے جو تمہارے پاس، تمہیں دین کی تعلیم دینے

آئے تھے۔“ (۴۲)

اور اسی طرح وہ فرشتے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہ السلام کی جانب بھیجا تھا وہ بھی آدمیوں کی شکل میں آئے تھے۔

﴿ چوتھا: فرشتوں کے ان اعمال پر ایمان لانا، جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بجالاتے ہیں اور جن کی بابت ہمیں علم حاصل ہو، جیسے فرشتوں کی تسبیح و تقدیس اور ان کا اللہ جل شانہ کے حضورات اور دن بغیر کسی اکتاہٹ اور تھکاوٹ کے بندگی کرنا وغیرہ۔

اور ان فرشتوں میں سے بعض کے خاص اعمال ہیں، جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی ہدایت سے سرانجام دیتے ہیں: مثلاً:

① حضرت جبریل الامین علیہ السلام ’اللہ تعالیٰ کی وحی پر مامور ہیں‘ جنہیں وہ (اللہ تعالیٰ) اپنا پیغام وحی دے کر انبیاء اور رسولوں (علیہم السلام) کی طرف بھیجتا ہے۔

② حضرت میکائیل علیہ السلام کو بارش اور اس کے نتیجے میں اگنے والی نباتات پر مقرر کیا گیا ہے۔

③ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو قیامت پکا کرنے اور مخلوق کو دوبارہ اٹھانے کے وقت صور پھونکنے پر مقرر کیا گیا ہے۔

④ حضرت (عزرائیل علیہ السلام اور یہ نام فرضی ہے) مَلَكُ الْمَوْتِ موت کے فرشتے کو موت کے وقت، روحوں قبض کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔

’مالک‘ فرشتے کو آتش جہنم پر مقرر کیا گیا ہے اور یہ فرشتہ جہنم کا داروغہ بھی ہے۔

اور وہ فرشتے جو حکمِ مادر میں ارحام کے اندر محفوظ (مرحلہ وار) پرورش پانے والے بچوں پر متعین ہیں، خاص طور پر جب شکمِ مادر میں انسانی جنین کے چار ماہ پورے ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتے کو بھیجتا ہے اور اس کو اس پیدا ہونے والے انسان کے رزق، عمر، عمل اور اس کے شقی (بدبختی) اور سعید (سعادت مندی) کے لکھنے کا حکم دیتا ہے۔

⑥ اور وہ فرشتے بھی ہیں جو اولادِ آدمؑ میں سے ہر ایک شخص کے اعمال کی حفاظت کرنے اور ان کو لکھنے پر مامور کئے گئے ہیں یہ دو فرشتے ہیں، جن میں سے ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب ہوتا ہے۔ (انہیں کراما کا تین کا نام دیا گیا ہے)

⑦ اور اسی طرح وہ فرشتے بھی ہیں جو میت سے (جب مرنے والا شخص اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے) سوال کرنے پر مقرر کئے گئے ہیں یہ بھی دو فرشتے ہیں، جو میت کے پاس آ کر اس سے اس کے حقیقی رب، اس کے دین اور اس کے نبیؑ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ (انہیں منکر، نکیر کا نام دیا گیا ہے)

☆..... اور فرشتوں پر ایمان، اہل ایمان کے لئے جلیل القدر ثمرات کا سبب ہے، جن میں چند درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلا ثمرہ: اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کی قوت و سطوت، اور اس قدرت و سلطنت کی معرفت کا حصول، اور یہ اس لئے کہ مخلوق کی عظمت خالق کی عظمت سے ہے۔

۲۔ دوسرا ثمرہ: اللہ تعالیٰ کے حضور اظہارِ تشکر اور اس کی بے شمار نعمتوں کی قدردانی کے موقعہ کی فراہمی، جو کہ اس حقیقی منعم نے اولادِ آدمؑ کو عطاء فرمائی ہیں، جیسا کہ اس نے ان فرشتوں میں سے بعضوں کو اپنے بندوں کی حفاظت، ان کے اعمال لکھنے اور اس کے علاوہ ان کی دیگر مصلحتوں اور فوائد کے حصول پر متعین فرمایا ہے۔

۳۔ تیسرا ثمرہ: فرشتوں کی محبت کا حصول، اس اعتبار سے کہ وہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے نتیجے میں اس کے بندوں کے ہاں محبوب اور اپنے رب کے ہاں مقرب گردانے جاتے ہیں۔

اور صراطِ مستقیم سے بھٹکی ہوئی ایک قوم نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ فرشتے اپنا جسمانی وجود رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فرشتوں سے مراد ”مخلوقات میں ایک بھلائی کی (غیر مرئی) یعنی پوشیدہ قوت ہے“ اور یہ کہنا یا یہ عقیدہ رکھنا، اللہ تعالیٰ کی کتاب، اس کے رسول ﷺ

کی سنت اور تمام مسلم امہ کے اجماع (یعنی اتفاق) کو جھٹلا دینا ہے۔“  
اور فرشتوں کے جسمانی وجود کیا ثبات اور مذکورہ بالا قوم کے باطل عقیدہ کے رد میں اللہ جل شانہ کے درج ذیل فرامین کافی ہوں گے:

① ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ قَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اٰجِنَہٗ مَخْنٰی وَكُلَّتْ وُرُیْعٌ﴾ (فاطر:۱)

”سب تعریف اس اللہ کے لئے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے، جن کے دودو، تین تین اور چار چار بازو ہیں۔“

② ﴿وَلَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَفٰی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْہَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ﴾ (الانفال:۵۰)

”اور کاش کہ تم اس حالت کو دیکھ سکتے، جبکہ فرشتے مقتول کافروں کی رو میں قبض کر رہے تھے وہ ان کے چہروں اور کولہوں پر ضربیں لگاتے تھے۔“

③ ﴿وَلَوْ تَرٰی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوْا اَیْدِیْہِمْ اَخْرِجُوْا اَنْفُسَکُمْ﴾ (الانعام:۹۳)

”اور کاش آپ ان ظالموں کو دیکھیں، جب وہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور فرشتے ان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں لاؤ اپنی جانیں نکالو۔“

④ ﴿حَتّٰی اِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوْبِہِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ قَالُوْا الْحَقُّ وَہُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ﴾ (سبا:۲۳)

”حتیٰ کہ جب فرشتوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ (ایک دوسرے سے) پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا؟ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ عالیشان اور سب سے بڑا ہے۔“

اور اہل جنت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

⑤ ﴿وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْہِمْ مِنْ کُلِّ بَابٍ سَلَمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعَمَ



عُقَبِی الدَّارِ ﴿﴾ (الرعد: ۲۳، ۲۴)

”اور فرشتے ہر طرف سے ان (اہل جنت) کے استقبال کے لئے آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ٹھہرے ہو۔“

☆ اور صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی یہ روایت ہے، کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ (اپنے بندوں میں سے) کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ جبریلؑ کو خبر دیتا ہے کہ بے شک اللہ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے، تو تو بھی اس سے محبت کر، تو اس پر جبریلؑ بھی اس شخص سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر جبریلؑ تمام اہل آسمان میں اس بات کی منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو تم سب اس سے محبت کرو، اس پر تمام اہل آسمان بھی اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں، بعد ازاں اسکی محبت کی یہی قبولیت اہل زمین کی طرف پھیر دی جاتی ہے۔“ (۳۳)

☆..... اور صحیح بخاری ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ روایت ہے، کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب جمعہ کا دن ہو، (تو اس دن) مسجد کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازے پر فرشتے (کھڑے) ہوتے ہیں جو (مسجد میں) سب سے پہلے آنے والوں کے نام لکھتے ہیں، اور جب امام خطبہ کے لئے بیٹھتا ہے تو وہ صحیفوں کو لپیٹ کر (ایک طرف) رکھ دیتے ہیں اور پھر امام کا ذکر (خطبہ) سنتے ہیں۔“ (۳۴)

اور کتاب وسنت کی مذکورہ یہ واضح نصوص اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ: فرشتے اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں، وہ کوئی معنوی اور خیالی قوت ہرگز نہیں جیسا کہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے (مگراہ) لوگوں کا خیال ہے اور ان نصوص کی بناء پر امت کے مسلمانوں کا اس بات پر اجماع (اتفاق) ہے۔

وَكُتِبَہٗ ﴿﴾ ..... ”اور اس کی (آسمانی) کتابوں پر ایمان لانا“

﴿﴾ الکتب کتاب کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے ”کوئی لکھی ہوئی چیز“۔

اور یہاں ان کتابوں سے مراد وہ آسمانی کتابیں (اور صحیفے) ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر بطور رحمت اور ان کی ہدایت کے لئے اپنے پیغمبروں پر نازل فرمائیں، تاکہ اللہ کی مخلوق ان کی راہنمائی سے دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہمکنار ہو سکے۔

ان آسمانی کتابوں پر ایمان چار امور کو شامل ہے (یا ان کا تقاضا کرتا ہے)

﴿﴾ پہلا: یہ ایمان رکھنا کہ یہ کتابیں اللہ عزوجل کی طرف سے برحق نازل ہوئی ہیں۔

﴿﴾ دوسرا: جن کتابوں کے نام معلوم ہیں ان پر، ان کے ناموں سمیت ایمان لانا: جیسے

’قرآن حکیم‘ جو اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا، اور ’تورات‘ جو حضرت موسیٰ ﷺ پر اتاری گئی اور ’انجیل‘ حضرت عیسیٰ روح اللہ ﷺ پر اتاری گئی اور اسی طرح ’زبور‘ جو حضرت داؤد ﷺ کو دی گئی اور وہ آسمانی کتابیں جن کے نام ہمیں معلوم نہیں ہو سکے تو ان پر ہم ’اجمالی‘ ایمان لائیں گے۔“

﴿﴾ تیسرا: ان آسمانی کتابوں کی جو خبریں سچی (اور احکام و مسائل) تو اتر کے ساتھ ثابت

ہوں، ان کی دل و جان سے تصدیق کرنا، جیسے قرآن حکیم کی خبریں اور احکام و مسائل ہیں اور یا پھر سابقہ آسمانی کتابوں کی وہ خبریں اور وہ احکام، جو نہ بدلے ہوں اور نہ ان میں تحریف ہوئی ہو۔“

﴿﴾ چوتھا: وہ جملہ احکام جو منسوخ نہ ہوئے ہوں، ان پر عمل کرنا اور انہیں برضا و رغبت

درست تسلیم کرنا، خواہ ان کی مشروعیت کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اور یہ بھی یاد رہے کہ سابقہ تمام آسمانی کتابیں، آخری کتاب قرآن حکیم کے نازل ہونے پر منسوخ ہو چکی ہیں جس کی تائید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿﴾ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا

بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ ﴿ (المائدة: ۲۸)

”اور ہم نے آپ (ﷺ) پر سچی کتاب نازل کی ہے، جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی جامع و مکران بھی ہے۔“

لہذا اس فرمان باری تعالیٰ کی رو سے، سابقہ آسمانی کتابوں کے احکام میں سے کسی حکم پر عمل کرنا جائز نہیں، سوائے اُن احکام کے جو درست ثابت ہو جائیں اور قرآن و سنت نے ان کو باقی رکھا ہو نیز آسمانی کتابوں پر ایمان نہایت ہی بابرکت ثمرات کا موجب ہے: جن میں چند ایک یہ ہیں:

۱۔ پہلا ثمرہ: اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر عنایت اور کرم نوازی کی معرفت کا حصول، اس اعتبار سے کہ اس رحیم و کریم نے ہر قوم کے لئے کتاب ہدایت اُتاری، تاکہ وہ اس کے ذریعے راہ ہدایت پائیں۔“

۲۔ دوسرا ثمرہ: اللہ تعالیٰ کی اس شریعت طاہرہ میں حکمت کی معرفت کا حصول اس اعتبار سے کہ اس حکیم و علیم ذات نے ہر قوم کے احوال کے مناسب احکام مشروع فرمائے۔ جیسا کہ خود اس کا فرمان ہے: ﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ (المائدة: ۲۸)

”تم میں سے ہر امت کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے۔“

وَرُسُلُهُ ۝ ..... ”اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا۔“

□ (۴۶) الرُّسُلُ: رسول کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے بھیجا جانے والا، یعنی کسی چیز کا پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا جانے والا، رسول کہلاتا ہے اور ’رسول‘ سے مراد یہاں ’بشر‘ یعنی انسانوں میں سے وہ ہستی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی وحی کی جائے اور ساتھ ہی اسے اپنی اُمت کو پہنچانے کا حکم دیا جائے ..... اور سلسلہ انبیاء و رسل میں سے سب سے پہلے ”رسول“ حضرت نوح علیہ السلام اور سب سے آخری حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ (النساء: ۱۶۳)  
 ”(اے محمد!) ہم نے آپ کی طرف، اسی طرح وحی کی ہے، جیسے نوحؑ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء (علیہم السلام) کی طرف کی تھی۔“

☆..... اور صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی، حدیث شفاعت میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ذکر فرمایا: کہ (حساب و کتاب کے دن) لوگ آدم (علیہ السلام) کی طرف آئیں گے تاکہ وہ ان کے حق میں (جلدی حساب و کتاب لینے کی اللہ تعالیٰ کے حضور) سفارش کریں، لیکن حضرت آدم (علیہ السلام) ان کے آگے معذرت پیش کر دیں گے اور یہ کہیں گے کہ تم لوگ حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس جاؤ، کہ وہ پہلے رسول ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا تھا..... الحدیث“ (۳۵)

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾  
 ”محمد ﷺ تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔“ (الاحزاب: ۴۰)

(خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی رسول تو کیا، کوئی نبی بھی آنے والا نہیں) اور کوئی اُمت بھی اللہ کی جانب سے رسول کی نعمت سے محروم نہیں رہی، اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اس کی قوم کی طرف ایک مستقل شریعت کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے، یا پھر ان کی ہدایت کے لئے کسی نبی کو بھیج دیتا ہے، جس کی طرف سابقہ شریعت وحی کی جاتی ہے، تاکہ وہ اس کو نئے سرے سے اپنی قوم میں جاری و ساری کر سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾  
 ”اور ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ تم اللہ کی بندگی کرو، اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔“ (الاحقاف: ۲۶)

اور فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۳)

”اور کوئی امت ایسی نہیں گزری کہ جس میں کوئی نذیر (یعنی ڈرانے والا) نہ آیا ہو۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ

الَّذِينَ اسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا﴾ (المائدة: ۴۴)

”بلاشبہ ہم نے تورات اُتاری، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق اللہ کے

فرمانبردار نبی ان لوگوں کے فیصلے کیا کرتے تھے جو یہودی بن گئے تھے۔“

اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تمام پیغمبر علیہم السلام (اور آدمؑ کی اولاد سے ہیں، جو کہ مٹی سے

پیدا کئے گئے تھے) جن میں ربوبیت، اور الوہیت کے خصائص نام کی کوئی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ

نے اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، جو کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے سردار اور قدرومنزلت اور

مقام و مرتبہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑھ کر ہیں، کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ لَا

أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ

الْغَيْبِ وَمَا مَسْنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

”اے محمد! ان سے کہو، کہ میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ

ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا، تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے

حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری

سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے، جو ایمان لا کر میری بات مان لیں۔“

اور سورۃ الجن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ

أَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا﴾ (آیت: ۲۱، ۲۲)

”(اے نبی!) آپ ان سے کہئے، کہ میں تمہارے لئے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں

اور نہ کسی بھلائی کا، آپ کہئے، کہ مجھے اللہ سے ہرگز کوئی بچانہ سکے گا اور نہ ہی میں اس (اللہ

واحد) کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پاسکوں گا۔“

بلکہ ان (پیغمبروں علیہ السلام) کو بشری خصائص (اور دیگر حوائج و ضروریات) لاحق ہوتے اور حوادث درپیش ہوتے ہیں، جیسے بیماری، موت، کھانے پینے، پہننے اور آرام کرنے کی ضروریات وغیرہ، اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں، جو انہوں نے اپنے رب تعالیٰ کے وصف میں کہا، فرماتا ہے: ﴿وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِي، وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِي﴾ (اشعراء: ۸۱ تا ۸۹)

”وہی ذات تو ہے، جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار پڑتا ہوں، تو وہی مجھے شفاء دیتا ہے، نیز وہی مجھے مارے گا اور (پھر نئے سرے سے) زندہ کرے گا۔“

☆..... اور نبی رحمت ﷺ کا اس سلسلے میں ارشاد گرامی ہے:

﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَنَسَىٰ كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي﴾ (۳۶)

”کہ یقیناً میں تمہاری طرح ایک بشر (آدمی) ہوں، میں بھول جاتا ہوں، جس طرح تم

بھول جاتے ہو، تو جب میں بھول جایا کروں تو تم مجھ کو یاد دلادیا کرو۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنے ان برگزیدہ پیغمبروں کے وصفِ عبدیت (کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سب سے اعلیٰ اور مقرب بندے ہیں) کو ان کے اعلیٰ مقام اور مرتبے کے ضمن میں بیان فرمایا ہے، اور اس بارے میں ان کی ثنا (تعریف) فرمائی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے فرمایا: ﴿إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ (الاسراء: ۳) ”کہ بے شک وہ (نوح علیہ السلام) میرا شکر گزار بندہ تھا۔“ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (الفرقان: ۱)

”کہ بابرکت ہے وہ ذات، جس نے اپنے بندے پر فرقان (یعنی قرآن جو کہ حق و باطل

میں فرق کرتا ہے) اتارنا کہ وہ (اس کے ذریعے) تمام جہانوں کو ڈرانے والا ہو۔“

اور حضرات انبیاء کرام صلی اللہ علیہم اجمعین! کی ایک ہی مبارک لڑی، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے بارے میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے: ﴿وَإِذْ كُنَّا عِبَادًا لِّإِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولَى الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ

ذِكْرِي الدَّارِ وَالنَّهْمِ عِنْدَنَا لِمَنْ الْمُصْطَفَيْنِ الْآخِيَارِ (ص: ۳۷۵)

”اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کیجئے، جو بڑی قوت عمل رکھنے والے اور صاحبان بصیرت تھے، ہم نے انہیں ایک خاص صفت کی بناء پر برگزیدہ کیا تھا (اور) وہ دار آخرت کی یاد تھی، ہمارے ہاں وہ یقیناً نیک اور برگزیدہ لوگوں میں سے تھے۔“

اور عیسیٰ بیٹے مریم علیہما السلام کے بارے اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے:

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (الزمر: ۵۹)

”وہ (عیسیٰ) تو محض ایک (ہمارا) بندہ تھا، جس پر ہم نے انعام کیا، اور اسے بنی اسرائیل کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنادیا۔“

اور پیغمبروں علیہم السلام پر ایمان چار اُمور کو شامل (اور ان کا متقاضی) ہے۔

پہلا: یہ ایمان رکھنا کہ ان کی رسالت، اللہ جل شانہ کی طرف سے برحق ہے، تو جس شخص نے ان پیغمبروں میں سے کسی ایک کی رسالت کا انکار کیا، تو اس نے حقیقت میں تمام پیغمبروں کی رسالت کا انکار کیا، جیسا کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الشعراء: ۱۰۵)..... ”کہ قوم نوحؑ نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔“ تو آیت ہذا میں اللہ تعالیٰ نے قوم نوحؑ کو، تمام پیغمبروں کو جھٹلانے والا قرار دیا ہے باوجودیکہ جب انہوں نے اپنے رسول کو جھٹلایا، تو اس وقت سوائے حضرت نوح علیہ السلام کے اور کوئی رسول ان کے ہاں موجود نہیں تھا، تو صرف ان کا حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلانا، حقیقت میں سارے پیغمبروں کو جھٹلانا ہے اور اسی قاعدہ کی بناء پر ہی عیسائی، جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کی تکذیب کی ہے اور آپؐ کی شریعت طاہرہ کو تسلیم نہیں کیا، تو حقیقت میں انہوں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی تکذیب کی اور اپنے پیغمبر ﷺ کی اتباع سے منحرف ہوئے ہیں، خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو آنحضور ﷺ کی نبوت و رسالت کی بشارت دی ہے اور ان کی اس بشارت (خوشخبری) کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں ہو سکتا کہ وہ (حضرت محمد ﷺ) ان سب کی طرف آخری رسول بن

کر آئے ہیں، جن کے ذریعے اللہ عزوجل، ان کو گمراہی میں پڑنے سے بچائے گا اور ان کو سیدھی راہ پر گامزن کرے گا۔

﴿دوسرا: جن پیغمبروں (علیہم السلام) کے اسمائے مبارکہ کا ہمیں علم حاصل ہو جائے، اُن پر اُن کے اسمائے مبارکہ سمیت ایمان لانا، جیسے: حضرت محمدؐ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت نوحؑ علیہم السلام میں اور یہ پانچ اولوالعزم پیغمبرؑ ہیں، جن کا ایک ساتھ ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دو مقامات پر کیا ہے:

سورة الاحزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ (الاحزاب: ۷)  
 ”اور اس عہد کو یاد کرو، جو ہم نے سب نبیوں سے لیا اور آپؐ سے بھی اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بن مریمؑ (علیہم السلام) سے بھی۔“

اور سورہ الشوریٰ میں اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾  
 ”اس (اللہ) نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے، جس کا (اس نے) نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جو کچھ ہم نے آپؐ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (علیہم السلام) کو حکم دیا تھا، کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔“ (الشوری: ۱۳)

اور وہ پیغمبر علیہم السلام! جن کے اسمائے گرامی ہمارے علم میں نہ آسکیں تو ان پر ہم کو اجمالی ایمان لانا ہوگا۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ (غافر: ۷۸)

”اور تحقیق ہم نے آپؐ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں، ان میں سے وہ بھی ہیں جن کے قصے ہم نے آپؐ پر بیان کئے ہیں اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جن کے قصے ہم نے آپؐ پر بیان نہیں کئے۔“



تیسرا: جو سچی خبریں اور احکامات درست واسطوں سے ان پیغمبروں (ﷺ) سے ہم تک پہنچی ہیں، ان کی دل و جان سے تصدیق کرنا۔

چوتھا: ان پیغمبروں (ﷺ) میں سے، جو پیغمبر ہماری طرف مبعوث کیا گیا ہے، اس کی شریعت کو حرزِ جان بنا کر اس پر عمل پیرا ہونا اور وہ ہمارے آخر الزمان پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، جو تاقیام قیامت، تمام بنی نوع انسان کی طرف رسول بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا﴾ (النساء: ۶۵)

”(اے محمد!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے تنازعات میں آپ (ﷺ) کو حکم (فیصلہ کرنے والا) تسلیم نہ کر لیں، پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے متعلق اپنے دلوں میں گھٹن بھی محسوس نہ کریں اور اس فیصلہ پر پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔“

اور پیغمبروں (صلی اللہ علیہم وسلم) پر ایمان، جلیل القدر ثمرات کا موجب ہے، جن میں چند درج ذیل ہیں:

پہلا ثمرہ: اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے پایاں رحمت اور اس کے کرم کی بابت علم کا حصول، اس اعتبار سے کہ اس نے اپنے ان (بندوں) کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا، تاکہ وہ اُن کی اللہ تعالیٰ کی راہ کی جانب راہنمائی فرمائیں اور ان پر یہ واضح کریں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کیسے کی جائے، اس لئے کہ انسانی عقل (بغیر الہامی رہنمائی کے) درست طریقے سے عبادت کی ادائیگی سے نا آشنا ہے۔

دوسرا ثمرہ: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، اس نعمت عظمیٰ کا اظہارِ تشکر (کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے پاس ہدایت کی خاطر اپنے رسولوں کو بھیجا)

اُمت کے دلوں میں ان جلیل القدر پیغمبروں (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی محبت اور عظمت کا

جاگزیں ہونا اور امت کے ہر فرد کا ان کے شایان شان، ان کی مدح سرائی کرنا اور یہ اس لئے کہ وہ:

(۱) اللہ جل شانہ کے سچے اور برگزیدہ پیغمبر (ﷺ) ہیں۔

(ب) اللہ تعالیٰ کی بندگی (عبادت و اطاعت) ان کی زندگی کا حقیقی مشن اور نصب العین تھا۔

(ج) انہوں نے اللہ جل شانہ کی طرف سے تفویض کردہ منصب رسالت کا حق ادا کیا اور بنی نوع انسان تک من وعن اللہ کا پیغام پہنچایا۔

(د) انہوں نے منصب رسالت سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کی۔

☆..... اور امت میں، دین سے عناد اور بغض رکھنے والے لوگوں نے، اپنے پیغمبروں کو یہ

گمان رکھتے ہوئے جھٹلایا کہ اللہ کے رسول، بشر (اولاد آدمؑ میں سے) نہیں ہو سکتے،

اس باطل عقیدے کے جواب میں، اللہ تعالیٰ نے، اُن کے اس گمان کا رد اپنے اس

فرمان سے کیا: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا

أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا قُلْ لَوْ كَانَتْ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يُمِشُونَ مُطْمَئِنِّينَ

لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا﴾ (الاسراء: ۹۴)

”لوگوں کے سامنے، جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے، ان کو کسی چیز نے

نہیں روکا، مگر ان کے اسی قول نے کہ ”کیا اللہ نے بشر (آدمی) کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟ ان سے

کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے، تو ہم ضرور آسمان سے کسی

فرشتے ہی کو ان کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجتے“.....

تو اللہ جل شانہ نے اپنے اس فرمان سے، اس گمان کو باطل قرار دیا کہ رسول کا بشر (آدمی)

ہونا لا بدی امر ہے، اس لئے کہ اسے اہل زمین (اولاد آدمؑ) کی طرف رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے

اور وہ سب بشر (آدمی کی اولاد ہیں) اور اگر اہل زمین، فرشتے ہوتے، تو اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت

کے لئے آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتا، تاکہ وہ اُن (اپنے مدعوین) جیسا ہوتا (اور

فریضہ رسالت ادا کر سکتا)

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان پیغمبروں کو جھٹلانے والوں کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصْذَوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾

”انہوں نے کہا: ”تم کچھ نہیں ہو، مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں، تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو، جن کی بندگی ہمارے باپ دادا کرتے چلے آ رہے ہیں؟ اچھا تو پھر لاؤ کوئی واضح دلیل ہمارے پاس! ان کے رسولوں نے ان سے کہا: ”واقعی ہم کچھ نہیں ہیں، مگر تم ہی جیسے انسان، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم تمہارے پاس اللہ (تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر کوئی سند (یادلیل وغیرہ) لے آئیں۔“ (سورہ ابراہیم: ۱۰، ۱۱)

وَالْيَوْمَ الْآخِرِ ۝ ..... ”اور آخرت کے دن“ (یعنی حساب و کتاب کے دن) پر ایمان لانا۔“

□ ﴿۲۷﴾ یوم آخرت سے مراد قیامت کا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے لئے لوگوں کو اٹھائے گا، اور اسے ’یوم آخرت‘ کا نام اس لئے دیا گیا ہے، کیونکہ اس دن کے بعد اور کوئی دن نہ ہوگا، اس اعتبار سے کہ اہل جنت، جنت میں اپنے محللات میں جا بیس گئے اور اہل جہنم، دوزخ میں اپنے ٹھکانوں میں جا گریں گے۔

اور آخرت کے دن پر ایمان تین امور کو متضمن (شامل) ہے:

۱۔ پہلا: ایمان بالبعث (یعنی دوبارہ اٹھنے پر ایمان) اور یہ اللہ تعالیٰ کا مَرَدُوں کو زندہ کرنا ہے، جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا، تو لوگ اس آواز پر، ننگے پاؤں، ننگے جسم، اور بے ختنے، جہانوں کے پروردگار کے حضور حاضری کے لئے، اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعَدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا

﴿فَاعْلَمِينَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۴) ”جس طرح ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتداء کی تھی، اسی طرح ان کا اعادہ کریں گے، یہ ہمارے ذمہ ہے اور یہ ہم کر کے رہیں گے۔“

اور یہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا برحق اور ثابت شدہ ہے، جس پر کتاب و سنت اور مسلمانوں کا اجماع، دلالت کرتا ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ، ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ﴾ (المؤمنون: ۱۵، ۱۶) ”پھر اس کے بعد تمہیں ضرور مرنا ہوگا، پھر یقیناً تم قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔“

اور اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«يُخْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً غُرْلًا» (۴۷)

”کہ روز قیامت لوگ ننگے پاؤں اور بے ختنے اکٹھے کئے جائیں گے۔“

اور جہاں تک مسلمانوں کا اس بارے میں ’اجماع‘ کا تعلق ہے، تو تمام مسلمانوں نے اس کے ثبوت پر اتفاق کیا ہے اور یہ اللہ جل شانہ کی حکمت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ اپنی اس مخلوق کے لئے روز جزاء و سزا کو متعین کریں، جس میں وہ اُن کو اُن کے اعمال کا بدلہ دے، جن اعمال کا اُس (اللہ تعالیٰ نے) ان کو اپنے پیغمبروں (ﷺ) کی زبانوں پر مکلف ٹھہرایا تھا۔“ اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے: ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ ”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے، کہ ہم نے تمہیں بے کار ہی پیدا کر دیا اور تم ہمارے ہاں لوٹ کر نہ آؤ گے۔؟“ (المؤمنون: ۱۱۵)

اور اپنے نبی (ﷺ) کو شرف مخاطبت بخشتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَيْنَا مَعَادٍ﴾ (القصص: ۸۵)

”اے نبی! بلاشبہ جس (اللہ) نے آپؐ پر قرآن (پر عمل اور اس کی تبلیغ) کو فرض کیا ہے وہ آپؐ کو (بہترین) انجام کی طرف پہنچانے والا ہے۔“

❦ دوسرا: حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان: کہ ہر بندے کا اس کے عمل پر محاسبہ

ہوگا، اور اس عمل کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے گا، اس کے ثبوت اور برحق ہونے پر کتاب و سنت اور مسلمانوں کا اجماع دلالت کرتے ہیں:

فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ (الغافیہ: ۲۶، ۲۵)

”بلاشبہ انہیں ہماری طرف ہی واپس آنا ہے، پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔“

اور سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾

”جو کوئی اللہ کے ہاں کوئی نیکی لے کر آئے گا، تو اسے اس نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا، اور

جو برائی لے کر آئے گا اسے اتنی ہی سزا دی جائے گی جتنی اس نے بُرائی کی تھی، اور ان پر ظلم

نہیں کیا جائے گا۔“ (الانعام: ۱۶۰)

اور سورۃ الانبیاء میں فرمان الہی ہے:

﴿وَنَضْعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالُ

حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ﴾ (الانبیاء: ۴۷)

”اور ہم روز قیامت انصاف کے ترازو رکھیں گے، اور کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہوگی اور اگر کسی

کا رائی کے دانہ برابر بھی عمل ہوگا تو وہ بھی سامنے لائیں گے اور حساب کرنے کو ہم کافی ہیں۔“

☆..... اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کہ بے شک اللہ تعالیٰ (روز قیامت) بندہ مومن کو اپنی قربت سے ہمکنار فرمائے گا

اور اس کو اپنے بازوئے رحمت میں لے کر چھپالے گا اور فرمائے گا، کیا تو اپنے فلاں

گناہ کو پہچانتا ہے؟ کیا تجھے اپنے فلاں گناہ کے بارے میں علم ہے؟ تو وہ کہے گا: ہاں!

اے میرے پروردگار، یہاں تک کہ جب وہ اپنے گناہوں کا اقرار کر لے گا اور یہ سمجھ

لے گا کہ اب تو وہ یقیناً ہلاک ہو گیا، تو اللہ عزوجل فرمائیں گے: تو نے اپنے گناہوں کو

اپنے آپ پر دنیا میں پوشیدہ رکھا اور آج کے دن میں تیرے ان گناہوں کو معاف کرتا

ہوں، تو پھر اس کو اس کی اچھائیوں اور نیکیوں کا عمل نامہ دیا جائے گا۔ (لیکن اس کے

برعکس) جو کافر اور منافق لوگ ہوں گے، تو انہیں ساری مخلوق کے سامنے یہ کہہ کر پکارا جائے گا کہ یہ وہ (بد بخت) لوگ ہیں، جنہوں نے اپنے پروردگار کو جھٹلایا تھا، خبردار رہو! اللہ تعالیٰ کی لعنت ظالموں پر پڑتی ہے۔“ (۳۸) (متفق علیہ)

☆..... اور اللہ کے نبی ﷺ سے صحیح اسناد سے مروی ہے:

”کہ جس شخص نے نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا تو اس کے بدلے میں، اللہ تعالیٰ اپنے ہاں دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا اور پھر اس سے بھی کئی گنا زیادہ اجر لکھتا ہے۔ (یعنی انسان کی نیت، اس کے اخلاص اور اس کی محنت کے حساب سے اجر بڑھتا چلا جاتا ہے) اور (اس کے برعکس) جس شخص نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور پھر اُس پر عمل بھی کر گزرا (والعیاذ باللہ) تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ (صرف اس برائی کی مقدار کی برابر) ایک برائی لکھتا ہے۔“ (۳۹)

☆..... اور اعمال کے مطابق، حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے ثبوت پر، اُمتِ مسلمہ کا اجماع (اتفاق) ہے اور یہ حکمت کا تقاضا بھی ہے، کیونکہ اللہ عزوجل نے (اتمامِ حجت کے طور پر) کتابوں کو اتارا، رسولوں کو مبعوث فرمایا، اپنے بندوں پر ان پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کرنا لازم ٹھہرایا اور شریعتِ طاہرہ میں سے واجبات پر عمل کرنا فرض قرار دیا، نیز اس شریعتِ طاہرہ کے مخالفین کے خلاف لڑائی کو فرض قرار دیا اور ان کا خون بہانا، ان کی اولادوں کو غلام بنانا، ان کی عورتوں کو مالِ غنیمت کا حصہ بنانا اور ان کے اموال و اسباب کو لوٹنا بھی جائز قرار دیا ہے۔“

☆..... اب اگر حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا یہ سلسلہ نہ ہوتا تو (دنیا و آخرت کا) یہ معاملہ عبث (بے کار اور بے فائدہ) ہو کر رہ جاتا، اور یہ اس علیم و حکیم پروردگار کے حق میں ایک عیب ہے، جس سے وہ ہر اعتبار سے منزہ اور پاک ہے اور اسی بات کی طرف اللہ جل شانہ نے اپنے اس فرمان میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ فَلَنَقْصُنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا

كُنَّا غَائِبِينَ ﴿الاعراف: ۷۰﴾

”سو ہم اُن سے ضرور پوچھیں گے، جن کی طرف رسولؐ بھیجے گئے، اور ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے البتہ ہم اُن کو اپنے علم سے احوال سنا دیں گے، اور ہم غائب نہ تھے۔“

**تیسرا: جنت اور دوزخ پر ایمان:** یعنی یہ ایمان رکھنا، کہ بے شک جنت اور دوزخ ہی مخلوق کا ابدی (ہینگلی کا) ٹھکانہ ہے، ’جنت‘ تو نعمتوں اور آسائشوں کا گھر ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر ہیزگار، اہل ایمان کے لئے تیار کر رکھا ہے، جو ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں، جن پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ نے ان پر واجب (فرض) قرار دیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ جل شانہ کے لئے خالص ہو کر اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع (پیروی) کرتے ہوئے، ان کے احکام بجالاتے ہیں، نیز اس جنت میں لامحدود نعمتوں کی ایسی انواع و اقسام ہیں کہ جنہیں نہ کبھی اس سے پہلے کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کبھی کسی قلب بشر (آدمی کے دل) پر ان کا خیال ہی گزرا ہوگا۔ (سبحان اللہ)

اللہ تعالیٰ اس بارے میں فرماتا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ﴾

”بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، یہی لوگ بہترین مخلوق ہیں، ان کے پروردگار کے ہاں ان کا بدلہ ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ سب کچھ اس کے لئے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا رہا۔“ (البینۃ: ۷، ۸)

اور سورۃ السجدۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ

أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (السجدۃ: ۱۷)

”کوئی شخص یہ نہیں جانتا (اور نہ اس دنیا میں جان سکتا ہے) کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کی

کیا کچھ نعمتیں ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہیں، یہ ان کاموں کا بدلہ ہوگا جو وہ کیا کرتے تھے۔“

☆..... اور جہاں تک دوزخ کا تعلق ہے، تو وہ عذاب کا گھر ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کا عالم لوگوں کے لئے تیار کر رکھا ہے، جنہوں نے اللہ کی ذات کے ساتھ کفر کیا اور اس کے پیغمبروں (علیہم السلام) کی نافرمانی کی، اس میں عذاب اور سزا کے ایسے ایسے ہولناک طریقے ہیں، جو کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے ہوں گے (العیاذ باللہ) اللہ جل جلالہ اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾

”اور اس (ہولناک) آگ سے بچ جاؤ، جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔“

اور سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہوا ہے:

﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ (الکہف: ۲۹)

”بے شک ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لئے ایک آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی لپٹیں انہیں گھرے میں لے چکی ہوں گی، وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے، تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچٹ جیسا ہوگا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا، بدترین ہے وہ پینے کی چیز اور بہت بری ہے وہ آرام گاہ۔“

نیز سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيْتَنَّا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ﴾ (الاحزاب: ۶۳-۶۵)

”اللہ تعالیٰ نے یقیناً کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے بھڑکتی ہوئی دوزخ تیار رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کوئی اپنا حامی و مددگار نہ پائیں گے۔ جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے وہ کہیں گے ”اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔“

اور یوم آخرت پر ایمان کے ساتھ، مرنے کے بعد پیش آمدہ ہر چیز پر ایمان ملتی ہے۔



(مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد پیش آنے والی ہر چیز پر ایمان لانا، آخرت کے دن پر ایمان میں شامل ہے۔)

❶ **قنبرہ قبر..... قبر کا امتحان:** اور یہ میت سے دفن کے بعد اس کے رب، اس کے دین اور اس کے نبی کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سچے ایمان دار لوگوں کو قول ثابت (یعنی کلمہ توحید) کے ذریعے اس امتحان میں ثابت قدم رکھتا اور کامیاب فرماتا ہے، تو وہ (مرنے والا شخص سچا مؤمن) جواب میں کہتا ہے: ”میرا رب اللہ ہے، میرا دین، اسلام ہے اور میرا نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ جبکہ ظالم اور نافرمان لوگوں کو اس امتحان میں ناکام اور نامراد رکھتا ہے، تو کافر جواب میں کہتا ہے: ہائے ہائے میں نہیں جانتا، اور اسی طرح منافق اور دین میں شک کرنے والا آگے سے یہ کہتا ہے: میں کچھ نہیں جانتا، میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے سنا وہی کچھ میں نے بھی کہا۔

❷ **عذاب قبر اور اس کی نعمتیں اور آسائشیں:** اور یہ عذاب قبر ظالم، منافق اور کافر لوگوں کو ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴾

”کاش آپ ان ظالموں کو دیکھیں، جب وہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور (موت کے) فرشتے ان کی طرف اپنے ہاتھ پھلائے ہوتے ہیں (اور کہتے ہیں) لاؤ اپنی جانیں نکالو، آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، کیونکہ تم ناحق باتیں اللہ تعالیٰ کے ذمے لگاتے تھے اور اس کی آیتوں (کو ماننے کے بجائے ان) سے تکبر کرتے تھے۔“ (الانعام: ۲۳)

اور آل فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾

”وہ (کافر) صبح و شام آتش جہنم پر پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (تو حکم ہوگا) کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔“ (غافر: ۴۶)

☆..... اور صحیح مسلم میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے وہ اللہ کے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: ”اگر مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ تم اپنے مردوں کو دفن کرنے سے رک جاؤ گے“ تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعاء کرتا کہ وہ تم کو عذاب قبر (کی چیخ و پکار) سنا دے، جو کہ میں سنتا ہوں، پھر آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: «تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ» کہ ”تم لوگ، آگ کے عذاب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو، اس پر صحابہ کرامؓ نے کہا: کہ ہم آگ کے عذاب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔“ پھر آپؐ نے فرمایا: «تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ» کہ ”تم عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو!“ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہنے لگے: ”کہ ہم عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔“

پھر آپؐ نے فرمایا: «تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتْنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ»  
 ”کہ تم لوگ ہر ظاہری اور پوشیدہ فتنوں اور آزمائشوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو۔“  
 اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ”کہ ہم ہر ظاہری اور پوشیدہ فتنے اور آزمائش سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔“ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: «تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَالِ»  
 ”کہ تم لوگ دجال کذاب کے فتنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو۔“  
 تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب میں کہا: ”کہ ہم دجال کے فتنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔“ (۵۰)

اور جہاں تک قبر کی نعمتوں اور آسائشوں کا تعلق ہے تو یہ سچے اور مخلص اہل ایمان کے لئے ہیں..... اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾  
 (فصلت: ۳۰)

”بے شک جن لوگوں نے کہا: کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان پر (اللہ کی طرف سے) فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: ”نہ ڈرو اور نہ غمگین ہو،

اور اس جنت (کے حصول) کی خوشی مناؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔“

اور سورۃ الواقعہ میں حق تعالیٰ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿قُلُوا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ وَأَنْتُمْ حَيِّئِينَ تَنْظُرُونَ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ قُلُوا لَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقْرَبِينَ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتْ نَعِيمٌ﴾ (الواقعہ: ۸۹۳۸۳)

”پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب جان ہنسی کو پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس وقت تم سے بھی زیادہ اس جان کے نزدیک ہوتے ہیں، لیکن تم (ہمیں) دیکھ نہیں سکتے، پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں اور اگر تم (اپنی بات میں) سچے ہو، تو اس جان کو لوٹا کیوں نہیں لیتے؟ ہاں اگر وہ مرنے والا مقربین سے ہو تو اس کے لئے راحت، عمدہ رزق اور نعمتوں والی جنت ہوگی۔“

☆..... اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس بندہ مؤمن کے بارے میں، جب وہ اپنی قبر میں دو فرشتوں (مسکر وکیر) کے سوالوں کے صحیح جواب دیتا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: کہ آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے: ”کہ میرے بندے نے سچ کہا ہے، لہذا اس کے لئے جنت میں سے بچھوتا بچھا دو اور اس کو جنت میں سے پوشاک پہنا دو اور اس کی خاطر جنت کی جانب ایک دروازہ کھول دو، پھر آپؐ نے فرمایا (اس حکم کی تعمیل کی جاتی ہے) اور اس میت کے پاس قبر میں جنت کی تازہ ہوا اور خوشبو آتی رہتی ہے اور اس کی قبر کو حد نگاہ تک کشادہ کر دیا جاتا ہے۔“ (۵۱) اسے امام احمدؒ نے اپنی ’مسند‘ میں روایت کیا ہے نیز امام ابو داؤدؒ نے بھی ایک طویل حدیث (کے ضمن) میں اسے ذکر کیا ہے۔“

اور آخرت کے دن پر ایمان کے بڑے عمدہ اور بابرکت ثمرات ہیں:

ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلا ثمرہ: حساب و کتاب کے دن اجر و ثواب کی اُمید پر نیکی کے کاموں میں رغبت اور

اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری میں حد درجہ حرص کرنا۔

❖ دوسرا ثمرہ: حساب و کتاب کے دن کے خوف سے، نافرمانی کے کاموں میں رضا و رغبت سے لرزہ بر اندام ہونا اور ان سے ممکنہ حد تک بچنا۔

❖ تیسرا ثمرہ: مؤمن کے لئے ان چیزوں کے بارے میں تسلی و تشفی کا سامان، جو اس دنیوی زندگی میں ان سے چھین جاتی ہیں اور جن کے بدلے وہ آخرت کی نعمتوں اور اس کے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہے۔

☆..... اور کفار نے موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیا ہے، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، لیکن ان کا یہ گمان اور دعویٰ باطل ہے، جس کے بطلان پر شریعت طاہرہ، انسانی حس اور عقل سلیم تینوں ایک ساتھ دلالت کرتی ہیں۔

(۱) شرعی اعتبار سے دلالت: تو اس بارے میں اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿وَزَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (التغابن: ۷)

” (آخرت کا) انکار کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ قطعاً اٹھائے نہیں جائیں گے، آپ ان سے کہئے، کیوں نہیں، میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر جو کچھ تم کرتے رہے اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا، اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہے۔“

نیز تمام آسانی کتابیں اس بات پر متفق ہیں۔

(ب) حسی اعتبار سے دلالت: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس دنیا میں ہی مُردوں کو زندہ کرنا دکھا دیا ہے، صرف سورۃ البقرہ میں اس کی پانچ مثالیں موجود ہیں، جو ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

❖ پہلی مثال: حضرت موسیٰؑ کی قوم کی ہے، جس وقت انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے یہ کہا: ﴿لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَرَىٰ اللَّهَ جَهَنَّمَ﴾ (البقرہ: ۵۵) ”ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ

لائیں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو واضح طور پر دیکھ نہ لیں گے۔..... تو اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دے دی، پھر ان کو زندہ کیا۔..... اور اسی واقعہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے: ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّيْقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (البقرة: ۵۵، ۵۶)

”اور (وہ واقعہ بھی یاد کرو!) جب تم نے موسیٰ سے کہا: کہ ہم تو جب تک اللہ کو علانیہ دیکھ نہ لیں، تمہاری بات نہیں مانیں گے، پھر تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے تم پر بجلی گری (جس نے تمہیں ختم کر دیا) پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں زندہ کراٹھایا کہ شاید اب ہی تم شکر گزار بن جاؤ۔“

❖ **دوسری مثال:** اس مقتول شخص کا قصہ ہے، جس کے بارے میں بنی اسرائیل نے آپس میں جھگڑا کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جھگڑے کو نمٹانے کے لئے ان کو حکم دیا کہ وہ کوئی ایک گائے ذبح کریں، پھر اس کا کوئی حصہ لے کر اس مقتول کو ماریں، تاکہ وہ ان کو اپنے قاتل کی بابت خبر دے سکے، اس بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَرَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾

”اور (اے بنی اسرائیل! وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا، پھر تم یہ الزام ایک دوسرے کے سر تھوپ کر جھگڑا کر رہے تھے اور جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا، سو ہم نے حکم دیا کہ اس ذبح شدہ گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مار دو (چنانچہ مقتول نے بول کر اپنے قاتل کا پتہ بتلا دیا) اللہ تعالیٰ اسی طرح سے مردوں کو زندہ کرے گا اور تمہیں وہ اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ تم (حقیقت کو) سمجھو۔“

(البقرة: ۷۳، ۷۴)

❖ **تیسری مثال:** قوم یہود کا قصہ ہے، جو موت سے بھاگتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور ان کی تعداد ہزاروں تھی، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہیں پر موت سے دوچار کر دیا، پھر

ان کو زندہ کیا اسی واقعہ کے بارے میں حق تعالیٰ جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أَلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ﴾ (البقرة: ۲۴۳)

”کیا آپ نے ان لوگوں کے حال پر بھی غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل گئے تھے، حالانکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ مر جاؤ (چنانچہ وہ راستہ ہی میں مر گئے) پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں (بغیر مگر کی دعاء کی وجہ سے زندہ کر دیا) اور اللہ تو یقیناً لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، لیکن لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو اللہ کا شکر ادا نہیں کرتی۔“

﴿چوتھی مثال: اس شخص کا قصہ ہے، جو ایک تباہ شدہ کھنڈر نما (اور ویران) بستی کے قریب سے گزرا اور اس بات کو بہت بعید (بلکہ ناممکن) خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ اس اُجاڑ اور ویران بستی کو دوبارہ بسائے گا، تو اللہ جل شانہ نے اسی جگہ اس کو ایک سو سال تک کے لئے موت دے دی، بعد ازاں اس کو زندہ کیا، اس بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَى جِمَازِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (البقرة: ۲۵۹)

”یا (آپ نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا؟) جو ایک بستی کے قریب سے گزرا، اور وہ بستی اپنی چھتوں پر گر رہی پڑی تھی، وہ کہنے لگا: ”اس بستی کی موت کے بعد دوبارہ اللہ اسے کیسے زندہ کر دے گا؟ (یعنی کیسے آباد کرے گا؟) اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے سو سال تک موت کی نیند سلا دیا، پھر اسے زندہ کر کے اس سے پوچھا: ”بھلا کتنی مدت تم یہاں پڑے رہے؟ وہ بولا کہ ”یہی بس ایک دن یا اس کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بات یوں نہیں، بلکہ

تم یہاں سو سال تک پڑے رہے ہو، اچھا اب اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو تو دیکھو، یہ ابھی تک باسی نہیں ہوئیں، اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو (اس کا پیچر تک بوسیدہ ہو چکا ہے) اور ہم نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تجھے لوگوں کے لئے ایک معجزہ بنا دیں (کہ جو شخص سو برس پیشتر مر چکا تھا وہ دوبارہ زندہ ہو کر آ گیا) اور اب گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم کیسے انہیں جوڑتے، اٹھاتے اور اس پر گوشت چڑھا دیتے ہیں۔ جب یہ سب باتیں واضح ہو گئیں تو وہ کہنے لگا: اب مجھے خوب معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

**پانچویں مثال:** حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے قصہ میں ہے، جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کی کہ وہ انہیں یہ مشاہدہ کرائیں کہ وہ (اللہ تعالیٰ) مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو حکم دیا کہ چار (مختلف اقسام کے) پرندے لے کر انہیں ذبح کرو، پھر ان کے گوشت کے ٹکڑوں کو آپس میں ملا کر اپنے قریب کے پہاڑ پر الگ الگ حصوں میں رکھ دو، پھر ان میں سے ہر ایک کا باری باری نام لے کر انہیں بلاؤ، وہ مختلف گوشت کے اجزاء آپس میں مل کر اور پھر ایک مکمل اور زندہ پرندہ بن کر دوڑتا ہوا آپ کے پاس آئے گا، اسی قصہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُنْخِی الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوْ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبُی قَالَ فَعُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِیزٌ حَكِیمٌ﴾ (البقرة: ۲۶۰)

”اور جب حضرت ابراہیم نے کہا تھا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا تجھے اس کا یقین نہیں؟ ابراہیمؑ نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ لیکن میں اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا تو چار پرندے لو اور انہیں اپنے ساتھ مانوس کرلو، پھر ان کا ایک ایک جزء ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب اور حکمت والا ہے۔“

تو یہ وہ حسی، شعوری اور حقیقت پر مبنی مثالیں ہیں، جو مردوں کو زندہ کرنے پر واضح دلالت کرتی ہیں اور اسی طرح قبل ازیں، حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کے معجزات کے ضمن میں یہ معجزہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے اور انہیں ان کی قبروں سے نکال باہر کرتے تھے۔“

اور مردوں کو زندہ کرنے پر عقلی اعتبار سے دو طرح کی دلیلیں ہیں:

۱۔ پہلی دلیل: بلاشبہ اللہ تعالیٰ آسمانوں، زمینوں اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کا خالق (پیدا کرنے والا ہے) اور اس نے یہ سب کچھ ابتداء سے پیدا کیا ہے (جس کی سابقہ کوئی مثال نہ تھی) تو مخلوق کی پیدائش پر، بغیر کسی سابقہ مثال کے قدرت رکھنے والی ذات، اسی مخلوق کو دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز نہیں آسکتی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿كَمَآ بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعَدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ (الانبياء: ۱۰۴) ”جس طرح ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتداء کی تھی، اسی طرح اس کا اعادہ کریں گے، یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے اور ہم یہ کر کے رہیں گے۔“

سورۃ الروم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (آیت: ۲۷)

”اور وہی ذات ہے، جو خلقت کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ (دوسری بار کی پیدائش) اس پر زیادہ آسان ہے۔“

☆ اور اللہ جل شانہ نے اپنے پیغمبرؐ کو اس کافر کی تردید کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: جس کافر نے بوسیدہ اور جلی ہوئی ہڈی کے دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کر دیا تھا۔ ﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ (طہ: ۷۹) ”(اے نبی!) آپؐ اسے کہیں کہ: اسے وہی زندہ کرے گا، جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے۔“



﴿ دوسری دلیل: کہ زمین ایک وقت میں بالکل مردہ (نجر اور بے آباد) سیاہ اور خشک ہوتی ہے، نہ اس میں کوئی پودا ہوتا ہے نہ سبزہ، کہ اس پر ایسی حالت میں بارانِ رحمت برسی ہے، تو ناگہاں وہ زمین ہر قسم کے پھولوں، پھولوں اور سرسبزی و شادابی میں لہلہانے لگتی ہے، تو اس مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر مطلق ذات، مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْتَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُخِي الْمَوْتِ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (فصلت: ۳۹)

”اور اس (اللہ تعالیٰ) کی نشانیں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین سونی (بے آباد) پڑی ہوئی ہے، پھر ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آتی ہے اور پھول جاتی ہے، جس (اللہ) نے اس زمین کو زندہ کیا وہ یقیناً مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اور سورۃ ق میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيِّتًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ﴾ (ق ۱۱۹)

”اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا، جس سے ہم نے باغات اگائے اور اناج بھی جو کاٹا جاتا ہے، اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی، جن پر تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں۔ یہ بندوں کے لئے رزق ہے، اور اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین زندہ کر دیتے ہیں، (تمہارا زمین سے دوبارہ) نکلتا بھی اسی طرح سے ہوگا۔“

اور حقیقی راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ایک گمراہ قوم نے عذابِ قبر اور اس کی راحتوں اور آسائشوں کا یہ گمان کرتے ہوئے سرے سے انکار ہی کر دیا ہے کہ یہ واقعی و مشاہداتی امور کے خلاف ہونے کی بناء پر ایسا ہونا ناممکن ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں: ”کہ اگر قبر میں مدفون میت کو کھولا جائے تو وہ اسی حالت میں ملے گی جیسے وہ تدفین کے وقت تھی اور قبر بھی

نہ پہلے سے کشادہ دکھائی دیتی ہے اور نہ تنگ۔“ لیکن ان لوگوں کا یہ گمان شرعی، حسی اور عقلی ہر اعتبار سے باطل ہے۔

**شرعی اعتبار سے:** تو اس کے رد میں قبل ازیں چند نصوص ذکر ہو چکی ہیں جو عذاب قبر اور اس کی راحتوں اور نعمتوں پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ (۵۲)

”یوم آخرت پر ایمان“ کے ضمن میں بیان سے ملتی تحریر ملاحظہ کریں۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے وہ کہتے ہیں: کہ اللہ کے نبی ﷺ مدینہ کے کسی قبرستان سے نکلے، تو آپؐ نے (دفعاً) دو انسانوں کی دلدوز آواز سنی، جو اپنی اپنی قبروں میں عذاب دیئے جا رہے تھے..... اور پھر (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے) پوری حدیث بیان کی جس میں یہ بھی ہے کہ ان دونوں شخصوں میں سے ایک تو پیشاب کرتے وقت (پیشاب سے نہیں بچتا تھا) (یعنی احتیاط نہیں کرتا تھا) مختلف روایات میں مختلف الفاظ ہیں، مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ اور دوسرا شخص چغلی کرتے ہوئے پھرا کرتا تھا۔“ (۵۳)

**حسی اعتبار سے بطلان:** ایک سونے والا شخص اپنے خواب میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ ایک کشادہ، پر بہار اور نعمتوں اور راحتوں سے بھرپور جگہ میں ہے یا پھر نیند کی ہی حالت میں وہ اپنے آپ کو ایک انتہائی تنگ و تاریک اور بھیاںک جگہ میں کھڑا پاتا ہے، جس منظر سے وہ تکلیف بھی محسوس کرتا ہے اور بسا اوقات وہ ایک دم خوف سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بستر پر اور اپنے اسی کمرے میں ہوتا ہے، جس میں وہ کچھ دیر پہلے سویا تھا اور اس نیند کو موت کی بہن کہا گیا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس نیند کو وفات سے موسوم کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فِيمِمْسِكُ الَّتِي قَفَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الزمر: ۴۲)

”اللہ ہی ہے، جو موت کے وقت روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو شخص مرانہ ہو، اس کی روح نیند

کی حالت میں قبض کر لیتا ہے، پھر جس کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہو، اس کی رُوح کو تو روک لیتا ہے اور دوسری رُوحیں ایک مقررہ وقت تک کے لئے واپس بھیج دیتا ہے۔“

﴿ عقلی اعتبار سے بطلان: بلاشبہ ایک سونے والا شخص اپنی نیند میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے مطابق سچا خواب دیکھتا ہے اور بعض اوقات تو وہ اللہ کے نبی ﷺ کو ان کے حقیقی اوصاف کے ساتھ دیکھتا ہے، اس لئے کہ جس شخص نے آپؐ کو آپؐ کے اصلی اوصاف پر دیکھا، تو اس نے آپؐ کو حقیقت میں دیکھا۔“ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود سونے والا شخص اپنے ہی کمرے میں اور اپنے بستر پر درازِ احوال سے بہت دور ہوتا ہے، جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا ہوتا ہے اور اگر یہ سب کچھ اس فانی دنیا میں ممکن ہے تو احوالِ آخرت میں یہ کیسے ممکن نہیں ہو سکتا!؟

اور ان راہِ گم گشتہ کی یہ دلیل، جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے کہ اگر قبر میں مدفون مردہ کو کھولا جائے تو وہ اسی حالت میں پایا جاتا ہے، جس حالت پر وہ بوقتِ دفن تھا اور یہ بھی کہ قبر نہ وسیع نظر آتی ہے اور نہ تنگ، تو ان کے اس شبہ کا جواب درج ذیل چند صورتوں میں رقم کیا جاتا ہے:

﴿ پہلی صورت: تو یہ ہے کہ اس قسم کے بھونڈے شبہات کو ان ٹھوس اور واضح دلائل کے مد مقابل لانا ہی جائز نہیں، جنہیں شریعت طاہرہ لائی ہے اور اگر ان میں تقابل کرنے والا شخص، سچائی پر مبنی غور و فکر کرے تو ان شبہات کا واضح بطلان، بخوبی جان لے گا اور کیا ہی خوب ہے جو یہ کہا گیا ہے۔ ج

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلًا صَحِيحًا  
وَأَفْتُهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيمِ

”اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں، جو درست بات کو عیب دار بنا دیتے ہیں اور ان پر یہ آفت ان کی کج فہمی کی بناء پر ٹوٹی ہے۔“

﴿ دوسری صورت: یہ ہے کہ عالمِ برزخ کے ’احوال‘ غیبی امور سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی حقیقت انسان کے حواس نہیں پاسکتے اور اگر یہ غیبی امور انسانی حواس کے بس کی بات ہوتی

تو ایمان بالغیب کا سرے سے فائدہ ہی نہ رہتا اور پھر ان غیبی امور پر ایمان رکھنے والے اور ان کا انکار کرنے والے سب ایمان میں برابر ہوتے۔

﴿ تیسری صورت: عذاب قبر، اس کی نعمتیں اور آسائشیں، اس کی وسعت اور تنگی یہ سب چیزیں تو صرف میت پا سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی محسوس نہیں کر پاتا اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک سونے والا شخص اپنے آپ کو اپنی نیند کے دوران (خواب میں) کسی انتہائی تنگ و تاریک اور وحشت ناک جگہ میں پاتا ہے اور یا پھر انتہائی کشادہ اور پر رونق مقام پر، جبکہ اپنے علاوہ کسی دوسرے کے لئے وہ اسی مقام پر ہی ہوتا ہے، جہاں وہ (اپنے اہل خانہ یا دوست احباب کے درمیان) اپنے ہی کمرے میں اور اپنے ہی بستر پر پڑا سو رہا ہوتا ہے۔“

اور اللہ کے نبی ﷺ کو (بعض اوقات) جب وحی کی جاتی تو آپؐ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما ہوتے، آپؐ پوری وحی کو سنتے اور بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی سناتے مگر وحی کی ان تمام کیفیات کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین خود نہیں سن سکتے تھے، اور بسا اوقات ایسے ہوتا کہ فرشتہ (حضرت جبریلؑ روح الامین) آپؐ کے پاس آدمی کی شکل میں وحی لے کر آتا اور آپؐ سے ہم کلام ہوتا اور پاس بیٹھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نہ تو اس فرشتے کو دیکھ سکتے تھے اور نہ اس کی گفتگو سن سکتے تھے۔

﴿ چوتھی صورت: مخلوق کا علم و فہم اس حد تک محدود ہے، جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اس کو رکھا ہے، لہذا کائنات میں موجود ہر چیز کی حقیقت اور کنہہ تک رسائی پانا اس کے لئے ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور پھر جو کچھ ان کے اندر ہے سب کچھ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی حمد (تعریف) کے ساتھ اس کی تسبیح و تقدیس کر رہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی مخلوق میں سے ان کی یہ تسبیح و تقدیس اسے سنا بھی دیتا ہے، مگر اس کے باوجود یہ ہم سے پردے میں ہے، جسے نہ ہم سن سکتے ہیں اور نہ اس کی کیفیت اور حقیقت کو پاسکتے ہیں اور یہی وہ حقیقت، جس کے ادراک سے ہم عاجز ہیں، کے بارے میں

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا تَسْبِيحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (الاسراء: ۴۴)

”اس ذات کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو ان (آسمانوں و زمین) میں ہیں، کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد (تعریف) کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔“

اور اسی طرح شیاطین اور جنات جو کہ ہمہ وقت زمین میں آتے جاتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں اور جنوں کا وہ گروہ جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ سے قرآن حکیم کو پورے انہماک اور غور و فکر سے سنا اور بعد ازاں وہ (مشرق باسلام ہو کر) اپنی قوم کو ہدایت دیتے ہوئے انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرانے لگے۔ یہ سب کچھ حقیقت میں ہوا، مگر وہ عالم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخفی اور پردے میں رہا۔ اس حقیقت کے بارے میں اللہ جل شانہ کا یہ ارشاد ہوا: ﴿يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوَاتِهِمَا إِنَّهُ يَرُكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (الاعراف: ۲۷)

”اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے، جس طرح اُس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوا یا تھا اور اُن کے لباس تک ان پر سے اتروا دیئے تھے، تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے، وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں، جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، ان شیطانوں کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔“

☆ اور جب مخلوق کی بے بسی اور لاچارگی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر موجود چیز کی حقیقت کو پانے سے قاصر ہے، تو اس کے لئے یہ (ہرگز) جائز نہیں کہ وہ ان غیبی امور جو کہ (شرعی اعتبار سے) موجود اور ثابت شدہ ہیں، لیکن ان کے فہم کے دائرے سے باہر ہیں، کا سرے سے انکار کر دیں۔“

وَتُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِمْ وَشَرِّهِ ۖ وَالذَّلِيلُ عَلَى هَذِهِ الْأَرْكَانِ السَّيِّئَةُ : قَوْلُهُ تَعَالَى : ﴿لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ﴾ (البقرة: ۱۷۷) وَذَلِيلُ الْقَدَرِ قَوْلُهُ تَعَالَى : ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (القدر: ۴۹)

”اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانا“ اور ایمان کے ان چھ ارکان میں سے پہلے پانچ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”نیکی (محض) یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے، کہ آدمی اللہ پر، اور یوم آخرت پر اور ملائکہ (فرشتوں) پر اور اللہ کی نازل کی ہوئی، کتاب اور اس کے پیغمبروں پر ایمان و یقین رکھے۔“ ..... اور چھٹے رکن تقدیر خیر و شر (یعنی اچھی اور بری تقدیر) کی دلیل یہ فرمان الہی ہے: ”بے شک ہم نے ہر چیز ایک تقدیر (اندازے) کے ساتھ پیدا کی ہے۔“

□ ﴿۸﴾ کلمۃ (القدر) قاف کے فتح، یعنی زیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس سے مراد اللہ تعالیٰ کی، کائنات کے لئے، اپنے کامل اور سبقت لے جانے والے علم کے مطابق، تقدیر (فیصلے اور احکام کا نفاذ) ہے، جس کا اس (حق تعالیٰ) کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔

تقدیر پر ایمان چار امور کو متضمن (یعنی شامل ہے اور ان کا تقاضا کرتی) ہے۔

□ پہلی بات: یہ ہے کہ یہ ایمان رکھنا کہ بلا شک و شبہ اللہ تعالیٰ کائنات میں موجود ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے اور اس کا یہ کامل علم ازلی و ابدی ہر اعتبار سے ہے، خواہ اس علم کا تعلق اس ذات کے اپنے افعال سے ہو یا اس کے بندوں کے افعال سے (یا پھر دیگر تمام مخلوقات کے امور سے)

□ دوسری بات: یہ ایمان رکھنا کہ اللہ جل شانہ نے یہ سب کچھ (پہلے سے ہی) ”لوح محفوظ“ میں لکھ رکھا ہے اور ان دونوں باتوں کی تائید میں یہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۚ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (الحج: ۷۰)

”کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے، جو آسمانوں اور زمین میں ہے، بلاشبہ یہ سب کچھ ایک کتاب (لوح محفوظ) میں درج ہے، اللہ کے لئے یہ بات بالکل آسان ہے۔“

☆..... اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کی تقدیریں، آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے لکھ دی تھیں۔“ (۵۴)

﴿ تیسری بات: اس بات پر ایمان کہ پوری کائنات اللہ جل شانہ کی مشیت اور مرضی سے معرض وجود میں آئی ہے، خواہ اس کے وجود میں آنے کا تعلق اللہ جل شانہ کے اپنے فعل سے ہو یا پھر اس ذات باری تعالیٰ کی مخلوق کے فعل سے۔“

اس ذات باری تعالیٰ کے اپنے فعل سے متعلق وجود میں آنے والی مخلوق کے بارے میں اسکا ارشاد ہے: ﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ﴾ (قصص: ۶۸) ”اور آپ کا پروردگار جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہے (اپنے کام کے لئے) منتخب کر لیتا ہے۔“

اور سورہ ابراہیم میں یہ ارشاد ہوا ہے: ﴿وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ﴾ (آیت: ۲۷)

”اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

اور سورہ آل عمران میں یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (آل عمران: ۶)

”وہی اللہ، جیسے چاہتا ہے، تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں بناتا ہے۔“..... اور سورہ النساء میں اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ﴾ ”اور اگر اللہ (تعالیٰ) چاہتا تو انہیں (یعنی تمہارے مخالفین کو) تم پر مسلط کر دیتا، پھر وہ تمہارے خلاف لڑائی کرتے۔“ (آیت: ۹۰)

سورہ الانعام میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا

يَقْتَرُونَ﴾ (آیت: ۱۱۳) ”اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، سو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور ان باتوں کو بھی جو وہ افتراء کرتے ہیں۔“

﴿ چوتھی بات: یہ ہے کہ انسان یہ ایمان رکھے کہ ساری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے اپنی ذوات، صفات اور حرکات سمیت اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾ (الزمر: ۶۲)

”کہ اللہ ہر چیز کا خالق (پیدا کرنے والا) ہے اور وہ ہر چیز پر وکیل (کارساز) ہے۔“

اور سورۃ الفرقان میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرًا تَقْدِيرًا﴾ (الفرقان: ۲) ”اور اس (اللہ) نے ہر چیز کو پیدا کیا (اور پھر) ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کیا۔“

☆ اللہ کے نبی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں، جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا، ارشاد فرمایا: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الصافات: ۹۶) ”اور اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اس کو بھی (اس نے پیدا کیا ہے) اور تقدیر پر ایمان کا وصف جو ہم نے بیان کیا ہے وہ اس بات کے منافی نہیں کہ بندہ ..... اپنے اختیاری کاموں میں اپنی مرضی اور قدرت رکھتا ہے، اس لئے کہ شرعی اور واقعاتی ہر دو اعتبار سے دلائل اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ انسان کو اس کے اختیاری کاموں میں مرضی اور قدرت تفویض کئے گئے ہیں۔“

## ① شرعی دلائل

انسان کی مشیت (مرضی) کے اثبات میں حق تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿قَمِنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَا يَبْهَىٰ﴾ (النبا: ۳۹)

”تو جو شخص چاہے، اپنے پروردگار کی طرف واپس جانے کی راہ اختیار کرے۔“

اور سورۃ البقرۃ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ﴿فَاتُوا حَوْكُهُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ﴾ (آیت: ۲۲۳)

”پس تم اپنی کھیتوں (یعنی عورتوں) کو جہاں سے چاہو آؤ۔“



(اپنی عورتوں سے مجامعت کی طرف اشارہ ہے)

اور انسان کو عطا کردہ قدرت (واختیار) کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا﴾ (التعاون: ۱۶)

”پس تم اپنی استطاعت (طاقت) کے مطابق اللہ (تعالیٰ) کی نافرمانی سے بچو (یا اللہ کی سزا سے ڈرو) جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔“

اور سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

”اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، اگر کوئی شخص اچھا کام کرے گا تو اسے اس کا اجر ملے گا، اور اگر کوئی بُرا کام کرے گا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔“

## ② واقعیاتی دلالت

ہر انسان یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ انسان کی اپنی مرضی اور قدرت (اختیار) ہے، انہی کے ساتھ وہ کام سرانجام دیتا ہے اور انہی کی بدولت وہ کسی کام کو ترک کرتا ہے اور ان دو قسم کے امور میں واضح فرق کیا جاتا ہے کہ ایک وہ کام جو انسان کے ذاتی ارادے سے واقع ہوتا ہے جیسے چلنا، اٹھنا اور بیٹھنا وغیرہ اور دوسرا وہ جو بغیر اس کے ارادے اور مرضی کے واقع ہو جاتا ہے، جیسے اچانک اس پر لرزہ طاری ہو جانا وغیرہ، مگر یہ بات ضرور ہے کہ بندے کی مرضی اور اس کا اختیار یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت (مرضی) اور قدرت کے تابع ہیں اور اسی کی مرضی و قدرت سے ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿لَئِنْ شَاءَ

مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ، وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (التکویر: ۲۸، ۲۹)

”اور ہر اس شخص کے لئے بھی (قرآن ایک نصیحت ہے) جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہتا ہو، اور تم چاہ نہیں سکتے، مگر وہی کچھ، جو اللہ رب العالمین (سارے جہانوں کا پروردگار) چاہتا ہو۔“

اور یہ اس لئے بھی کہ چونکہ کائنات ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی چیز اس کی ملکیت میں ہوتے ہوئے اس کے علم اور مشیت (مرضی) سے باہر ہو۔

☆..... اور تقدیر پر ایمان کا جو وصف ہم نے بیان کیا ہے وہ بندے کو واجبات (فرائض) چھوڑنے اور گناہوں اور نافرمانیوں کے ارتکاب کا قطعی حق نہیں دیتا (کہ ایسے ایمان سے ایک گناہ گار انسان گناہ کے حق میں کوئی حجت اور دلیل پکڑ سکے) کیونکہ اگر وہ ایمان بالقدر کی اس مذکورہ تعریف کی روشنی میں فرائض کو ترک کرنے اور نافرمانیوں کے ارتکاب پر حجت پکڑے گا، تو اس کا یہ احتجاج (دلیل پکڑنا) کئی اعتبار سے باطل ہوگا، جو درج ذیل ہیں:

﴿پہلی وجہ: اللہ جل شانہ، ارشاد فرماتا ہے: ﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّى ذَاقُوا بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ﴾ (الانعام: ۱۲۸)

”عقرب یہ مشرک لوگ جواب میں کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا، جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزا چکھ لیا۔ آپ ان سے کہئے: کہ اگر تمہارے پاس علم کی کوئی بات ہے تو لاؤ وہ ہمیں دکھلاؤ، تم تو محض ظن (گمان) کے پیچھے پڑے ہو اور جو بات کرتے ہو بلا دلیل کرتے ہو۔“.....

اس آیت کریمہ کی رو سے اگر ان کا اللہ کی تقدیر سے حجت (دلیل) پکڑنا درست ہوتا تو اللہ ان کو اپنے عذاب کا مزہ نہ چکھاتے۔

﴿دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لَعَلَّكُمْ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (النساء: ۱۶۵)

”یہ سب رسول (لوگوں کو) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تھے تاکہ ان رسولوں

کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ بڑا زبردست اور حکمت والا ہے۔“

☆ اور اگر اللہ کی تقدیر مخالفین، گناہگار لوگوں کے لئے حجت (دلیل) ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس (حجت) کی، پیغمبروں کو بھیجنے کے بعد نفی نہ کرتا، اس لئے کہ پیغمبروں ﷺ کو بھیجنے کے بعد ان کی مخالفت، اللہ تعالیٰ کی قدر (تقدیر) کے نتیجے میں ہی واقع ہوئی ہے۔

تیسری وجہ: حدیث رسولؐ میں ہے، جسے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ! نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور صحیح بخاری کے الفاظ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”کہ تم میں سے ہر ایک شخص کا اصل ٹھکانہ اللہ تعالیٰ نے جہنم میں لکھ دیا ہے یا جنت میں، تو قوم میں سے ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ”تو کیا ہم توکل کر کے نہ بیٹھ جائیں اے اللہ کے رسول؟“ آپؐ نے فرمایا: نہیں تم عمل کرو ہر چیز آسان کر دی گئی ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنِيسِرُّهُ لِيُيسِّرَ﴾ (اللیل: ۵ تا ۷) پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور بھلی باتوں کی تصدیق کی، تو ہم اسے آسان راہ پر چلنے کی سہولت دیں گے، ..... آخر تک (اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں: ﴿فَكُلُّ مِّنْسَرٍّ لِّمَا خُلِقَ لَهُ﴾) کہ ”ہر شخص کے لئے ہر وہ چیز آسان اور میسر ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔“ تو اللہ کے نبی ﷺ نے یہاں عمل کا حکم دیا ہے اور محض تقدیر پر توکل اور بھروسہ کرنے سے روکا ہے۔“

چوتھی وجہ: بلاشبہ اللہ جل شانہ نے اپنے بندوں کو اطاعت کا حکم دیا ہے اور نافرمانی سے روکا ہے اور انہیں ان کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کیا۔ اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ۱۶) ”پس تم اللہ کی نافرمانی سے بچو، جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔“ نیز فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: ۲۸۶) ”کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس (شخص) کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں ٹھہراتے۔“ تو اگر بندہ اپنے فعل

پر مجبور محض ہو تو وہ ہر اس عمل کا بھی مکلف اور پابند ٹھہرے گا، جو اس کی دسترس سے باہر ہے یا اس سے خلاصی پانے کی اس میں طاقت نہیں، تو یہ سراسر اس آیت کریمہ کے منافی ہے، لہذا یہ عقیدہ بھی باطل قرار پائے گا اور اسی بناء پر ہی تو جب کبھی انسان سے جہالت، بھول چوک یا جبری طور پر معصیت اور نافرمانی کا فعل سرزد ہو تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ معذور ہے۔

﴿پانچویں وجہ﴾ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ایک ایسی پوشیدہ اور مخفی چیز ہے، جس کا 'مقدور چیز کے واقع ہونے سے پہلے علم نہیں ہو سکتا اور بندے کا ارادہ اس کام سے، جسے وہ انجام دینا چاہتا ہے سبقت لے جانے والا ہوتا ہے (مطلب یہ کہ ارادہ پہلے ہوتا ہے اور کام کی انجام دہی بعد میں) تو اس صورت میں بندے کا ارادہ اس کے کام کے واقع ہونے سے پہلے ہوا کرتا ہے (تو اس بنا پر انسان کا اس کام کے بارے میں ارادہ کرنا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے بارے میں علم پر مبنی (اور منحصر) نہیں ہوگا (یعنی اس کے کام کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلہ جانے بغیر ہوگا) تو اس وقت، اس انسان کے ہاں اللہ تعالیٰ کی تقدیر حجت (یا دلیل وغیرہ) پکڑنے کی بھی نفی ہو جائے گی، اس لئے کہ کسی ایسی چیز میں آدمی کے لئے کوئی حجت (یا دلیل) نہیں ہو سکتی، جس کا سرے سے اسے علم ہی نہ ہو۔

﴿چھٹی وجہ﴾ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان (عام حالات میں) دنیوی معاملات میں سے کسی موزوں اور مناسب چیز کی حرص کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے پا بھی لیتا ہے اور کبھی بھی وہ اس مناسب چیز کو چھوڑ کر ایک غیر موزوں چیز کے پیچھے نہیں پڑا کہ پھر وہ یہ نامناسب کام کر کے اپنے دشمن اور مخالف کے خلاف تقدیر کا سہارا بھی لے، تو پھر وہ اپنے دینی معاملات میں ایک منفعت بخش چیز کو چھوڑ کر ایک بالکل نامناسب اور تکلیف دہ چیز کی طرف کیوں لپکتا ہے اور ساتھ ہی (اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بطور حجت (دلیل) پکڑتا ہے کیا یہ دونوں معاملات ایک جیسے نہیں ہیں؟!

☆..... آپ ایک مثال پر غور کیجئے جو اس (مسئلہ قدر) کو مزید واضح کر دے گی، کہ انسان کے

سامنے دو راستے ہیں، ان میں سے ایک راستہ ایک ایسے شہر کو جاملتا ہے جہاں سراسر فساد اور بگاڑ کا دور دورہ ہے۔ قتل، لوٹ مار، عزتوں کی پامالی، خوف و ہراس، بھوک و افلاس عروج پر ہے، جبکہ دوسرے راستے کا اختتام ایک ایسے منظم اور پروقار شہر میں ہوتا ہے، جہاں ہر طرف امن و استحکام، خوشحالی اور پرسکون زندگی ہے، احترام آدمیت، جان و مال اور عزتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ تو آپ بتائیے کہ وہ ذی شعور انسان ان دونوں راستوں میں سے کس راستے پر چلے گا؟ یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ دوسرے راستے کا ہی انتخاب کرے گا، جس کی انتہاء ایک منظم باوقار اور امن و آشتی والی زندگی کے شہر میں ہوتی ہے..... جبکہ کسی عقلمند آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ فساد و انتشار اور خوف و ہراس سے بھرے شہر کی جانب جانے والے راستے پر چلے اور پھر وہاں کے تکلیف دہ حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے تقدیر کا سہارا لینا شروع کر دے اور اگر یہ ممکن نہیں اور واقعی ایسا ہونا ناممکن ہے، تو پھر وہ آخرت کے معاملے میں شاہراہ بہشت کو چھوڑ کر دوزخ کی جانب جانے والے مہیب اور خطرناک راستے پر کیوں چل پڑتا ہے اور پھر ساتھ ہی (اپنی تسلی اور تشریفی کے لئے) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا سہارا لیتا (اور اسے حجت پکڑتا) ہے؟..... چہ معنی دارد؟

ایک اور مثال: [اس مسئلہ قدر کی وضاحت کے لئے ہدیہ قارئین ہے]

ہم ایک مریض کو دیکھتے ہیں، جسے ڈاکٹر کی جانب سے دواء پینے کا حکم ہوتا ہے، جبکہ اس کا جی وہ دوا پینے کو نہیں چاہتا اور وہ کھانا کھانے سے اسے روک دیتا ہے، جو اس کے لئے مضر ثابت ہو سکتا ہے، جبکہ کھانا کھانے کو اس کا جی بے حد چاہ رہا ہوتا ہے، یہ ساری کی ساری احتیاط اور پرہیز اس کی مرض سے شفاء اور سلامتی کے لئے ہوتی ہے، تو ایسے حالات میں یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بیمار شخص اس تجویز کردہ دواء کو استعمال میں نہ لائے یا پھر وہ صحت کے مضر کھانا کھالے اور پھر وہ اللہ کی تقدیر سے حجت (دلیل) پکڑنا شروع کر دے (کہ میں نے یہ

کام تو اللہ کے فیصلے اور تقدیر سے کیا ہے) اگر یہ بات یہاں ناممکن ہے، تو انسان ان کاموں کو کیوں چھوڑ دیتا ہے، جن کی ادائیگی کا اسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے اور وہ کام کیوں کرتا ہے، جن سے اللہ جل جلالہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے پھر وہ (یہ الٹ پالیسی اپنا کر) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا سہارا لیتا ہے؟؟

❦ ساتویں وجہ: فرائض کو چھوڑنے اور نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے پر اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے حجت (دلیل) پکڑنے والے شخص پر اگر کوئی دوسرا شخص ظلم و زیادتی کر بیٹھے یا اس کا مال ناجائز ہڑپ کر لے، یا اس کی عزت پامال کر دے اور پھر وہ اپنے اس کئے ہوئے پر تقدیر کا سہارا لے (یعنی یہ کہے کہ بھائی صبر کرو، میں نے یہ کام اللہ کی تقدیر پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کیا ہے تم پر کوئی زیادتی نہیں کی) تو وہ پہلا شخص اس کی یہ حجت اور عذر قطعاً قبول نہ کرے گا، تو پھر وہ شخص اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کے حق میں پکڑی جانے والی قضاء و قدر کی حجت کو قبول کیوں نہیں کرتا، جبکہ وہ اپنے لئے اللہ جل شانہ کا حق بھی پامال کرتے ہوئے، اسی قضاء و قدر کا سہارا لیتا ہے؟! ❧

بہ بین تفاوت از کجا است تا بہ کجا!

☆ اور بیان کیا جاتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک چور لایا گیا، جو کہ چوری کی حد لگائے جانے کا مستحق تھا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے جب اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس نے کہا: ٹھہر جائیے یا امیر المؤمنین! میں نے تو چوری اللہ تعالیٰ کی تقدیر (اور اس کے فیصلے) کے مطابق کی ہے، تو یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ ہم بھی (تیرا ہاتھ) اللہ تعالیٰ کی تقدیر (اور اس کے فیصلے) کے مطابق کاٹ رہے ہیں۔“

تقدیر پر ایمان کے جلیل القدر ثمرات ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

❦ پہلا ثمرہ: اسباب کے نتائج میں وقوع پذیر ہونے والے افعال کے وقت اللہ تعالیٰ کی ذات پر کلی اعتماد اور توکل، اس اعتبار سے کہ بذات خود کسی بھی سبب پر اعتماد و انحصار نہیں کیا

جاتا، بلکہ ان اسباب کو پیدا کرنے والی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے، اس لئے کہ ہر چیز کا ظہور و وجود اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہوتا ہے۔

**دوسرا اثر:** کہ انسان اپنا مقصد پا کر مغرور اور متکبر نہیں ہوتا، اس لئے کہ نصب العین کا پالینا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ اس کے لئے بھلائی اور کامیابی کے اسباب سے مقدر کرتا ہے، جبکہ کسی نعمت کے حصول کے موقع پر غرور اور تکبر اس نعمت کے بدلے اظہارِ تشکر کو فراموش کر دیتا ہے۔ (انقیاض باللہ)

[یعنی اس نعمت پر اللہ کے حضور شکر کرنے کو بھلا دیتا ہے]

**تیسرا اثر:** انتہا درجہ کی دلی راحت، اطمینان اور سکون، جو کہ اللہ تعالیٰ کی اقدار اور اس کے فیصلوں کو برضا و رغبت قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے، تو نہ وہ شخص اپنی کوئی پیاری چیز چھین جانے سے پریشان اور بے چین ہوتا ہے، اور نہ کسی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیز کے حاصل ہونے پر غمگین اور افسردہ ہوتا ہے، اس لئے کہ (وہ بخوبی جانتا ہوتا ہے کہ) یہ سب کچھ اس اللہ وحدہ لا شریک لہ کی 'تقدیر' کی وجہ سے ہوا ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک و خالق ہے، اور یہ کام لامحالہ ہو کر رہنا تھا، نیز اسی بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكُمْ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (الحمدید: ۲۲، ۲۳)

”کوئی بھی مصیبت جو زمین میں آتی ہے یا خود تمہارے نفوس کو پہنچتی ہے، وہ ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے (اور) یہ بات بلاشبہ اللہ کے لئے آسان کام ہے، یہ اس لئے کہ جو کچھ تمہیں نہ مل سکے، اس پر غم نہ کیا کرو، اور جو کچھ اللہ تمہیں دے دے، اس پر اترا یا نہ کرو، اور اللہ کسی بھی خود پسند اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“

☆ اور اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”کہ مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے (اور) بے شک اس کا ہر معاملہ (اور ہر حالت) ہی اس کے حق میں بہتر اور بھلائی ہے اور یہ خصوصیت سوائے مومن کے اور کسی کو حاصل نہیں، اگر تو اسے کوئی راحت و آسائش پہنچے، تو اس کے بدلے اللہ کا شکر بجالاتا ہے اور یہ اس کے لئے بہتر ہی بہتر ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت یا تکلیف پہنچے تو وہ صبر سے کام لیتا ہے اور یہ بھی اس کے لئے بھلائی اور بہتری ہے۔“ (۵۷)

اس حدیث کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

اور تقدیر کے مسئلہ میں دو گروہ گمراہ ہوئے ہیں:

- ① ان میں سے ایک جَبَرِیَّة کا ٹولہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں، جو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے ہر کام میں ’مجبورِ محض‘ ہے اور اس کے کسی کام میں بندے کے اپنے ارادے یا قدرت و اختیار کو کوئی دخل نہیں (یعنی بندہ اپنے ہر کام کے کرنے میں مجبور ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا)
- ② اور دوسرا ٹولہ قَدَرِیَّة کا ہے، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ بندہ اپنے ہر عمل میں مستقل (یعنی با اختیار اور آزاد ہے) اور اس کے عمل کی انجام دہی میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور قدرت کا کوئی اثر و رسوخ نہیں۔

پہلے گروہ جَبَرِیَّة کا شرعی اور واقعاتی اعتبار سے رد

- ① شرعی اعتبار سے رد: بلا شک و شبہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے ارادے اور مشیت (مرضی) کا اثبات کیا ہے اور مزید یہ کہ عمل کی بھی اس کی جانب اضافت (اور نسبت) کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾
- ”تم میں سے کچھ تو وہ تھے، جو دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے۔“ (آل عمران: ۱۵۲)

اور سورۃ الکہف میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ (الکہف: ۲۹)



”اور (اے نبی!) صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے، تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے، ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لئے ایک آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی لپٹیں انہیں گھرے میں لے چکی ہیں۔“  
اور سورۃ فصلت میں حق تعالیٰ یوں ارشاد فرماتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ﴾

”جس شخص نے کوئی نیک عمل کیا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو کوئی بُرائی کرے گا، اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔“ (فصلت: ۴۷)

② واقعائی اعتبار سے رب: ہر انسان اپنے ان اختیاری کاموں، جنہیں وہ اپنے ارادے

اور چاہت سے انجام دیتا ہے، جیسے کھانا، پینا، خرید و فروخت وغیرہ اور ان کے درمیان جو اس پر بغیر اس کے ارادے اور چاہت کے واقع ہوتے ہیں، جیسے: بخار کی شدت سے اس پر لرزہ اور کچکی طاری ہونا اور اونچی چھت سے نیچے گر پڑنا وغیرہ کے درمیان، بخوبی فرق جانتا ہے، تو وہ پہلی نوعیت کے کاموں میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے خود مختار اور انہیں اپنے ارادے سے سرانجام دیتا ہے، جبکہ دوسری قسم کے کاموں میں وہ بے بس ہے اور اپنے اوپر طاری ہونے والے ایسے حوادث میں اس کے ارادے اور چاہت کا کوئی عمل دخل نہیں۔“

اور جہاں تک دوسرے گمراہ فرقے قدسِ ربّہ کا تعلق ہے، تو اس کا ردّ شرعی اور عقلی ہر دو طرح سے کیا جاتا ہے۔

① شرعی اعتبار سے رب: بلا شک و شبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق (پیدا کرنے والا) ہے، اور اس کائنات میں ہر چیز اس حقیقی خالق و مالک کی مرضی سے ہی وجود میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں یہ بات بیان فرمادی ہے کہ بندوں کے جملہ افعال (کام) اس کی مشیت (اور مرضی) سے ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا

فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿البقرة: ۲۵۳﴾

”اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا، تو ان رسولوں کے بعد لوگ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرتے، جبکہ ان کے پاس واضح احکام بھی آپکے تھے، لیکن انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، پھر کوئی تو ان احکام پر ایمان لایا اور کسی نے انکار کر دیا اور اگر اللہ چاہتا، تو وہ آپس میں لڑائی جھگڑے نہ کرتے، لیکن اللہ تو وہی کچھ کرتا ہے، جو وہ چاہتا ہے۔“

اور سورۃ السجدۃ میں حق تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىٰ وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (السجدۃ: ۱۳) ”اور اگر ہم چاہتے تو (پہلے ہی) ہر شخص کو ہدایت دے دیتے، لیکن میری یہ بات پوری ہو کے رہی کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔“

۲) عقلی اعتبار سے رد: یہ بات عین حقیقت ہے کہ کائنات ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کے تصرف میں ہے، لہذا اس کائنات میں بسنے والا انسان بھی اسی حقیقی خالق و مالک کا مملوک (یعنی ملکیت) ہے اور کسی بھی ’مملوک‘ کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی کہ وہ حقیقی مالک کے ملک میں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کسی قسم کا کوئی تصرف کرے، (اور اپنی مرضی سے ہی جو چاہے کرتا پھرے)

الْمَرْتَبَةُ الثَّالِثَةُ: الْإِحْسَانُ، رُكْنٌ وَاحِدٌ وَهُوَ: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ» وَالِدَلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ﴾ (النحل: ۱۲۸) وَقَوْلُهُ: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ﴾ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ، وَتَقْلِبُكَ فِي السَّجْدَيْنِ، إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (الشعراء: ۲۱۷-۲۲۰) وَقَوْلُهُ: ﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ﴾ (يونس: ۶۱)

”تیسرا درجہ ’احسان‘ ہے اور احسان کا ایک ہی رکن ہے کہ آپ اللہ عزوجل کی عبادت (اس

غایت درجے کے خشوع و خضوع اور انابت و رجوع سے) کریں کہ گویا آپ اسے پچشم خود دیکھ رہے ہیں اور اگر آپ (دوران عبادت) اس درجہ کو نہیں پاسکتے کہ آپ (اس معبود برحق کو) دیکھ رہے ہیں) تو کم از کم یہ عالم تو ضرور ہی ہونا چاہئے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) آپ کو دیکھ رہا ہے۔“

اور اس ذکر کردہ 'احسان' کے دلائل قرآن حکیم کی یہ آیات مہار کہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ”بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ (پرہیزگاری)

سے کام لیتے ہیں اور وہ جو عبادات کو اچھے انداز سے ادا کرتے ہیں۔“

(ب) ایک اور مقام پر فرمان الہی ہے: ترجمہ: ”اور اس زبردست اور انتہائی مہربان ذات

پر بھروسہ رکھئے جو آپ کو اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے، جب آپ اٹھتے ہیں اور سجدہ گزار

لوگوں میں آپ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

(ج) مزید ارشاد ربانی ہے: ”اے نبی! آپ جس حال میں بھی ہوتے ہوں اور قرآن میں

سے جو کچھ بھی سناتے ہوں اور لوگو! تم بھی جو کچھ عمل کرتے ہو، ان سب (حالات)

کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں..... آخر تک“

❏ کلمہ إحسان، إساءة (کسی سے برا رویہ رکھنا) کا متضاد ہے، اور 'احسان' یہ

ہے کہ انسان نیکی و بھلائی کے فروغ کے لئے اور دوسروں سے تکالیف و مصائب کو روکنے

کیلئے (اپنی توانائیاں) خرچ کر دے، نیز اللہ کے بندوں کی خاطر، اپنا مال، اپنا جاہ (اثرو رسوخ)

اپنا علم اور اپنی جسمانی صلاحیتیں سب کچھ (نیکی اور خیر خواہی کے جذبہ سے سرشار ہو) کر بہا

دے۔“

☆..... اللہ کے بندوں کی خاطر مال کی قربانی کی صورت یہ ہے کہ وہ بطور 'احسان' لوگوں

پر مال خرچ کرے، صدقہ دے، اور زکوٰۃ ادا کرے اور مال کے ساتھ "احسان" کی سب سے

افضل قسم، زکوٰۃ کی باقاعدگی سے ادائیگی ہے اس لئے کہ زکوٰۃ "ارکان اسلام" میں سے ایک

رکن اور اسلام کی بڑی عمارتوں میں سے ایک عمارت بھی ہے، جس کے بغیر آدمی کا اسلام ہی پورا نہیں ہوتا، نیز خرچ کی مدات میں سے اللہ عزوجل کے ہاں سب سے محبوب زکوٰۃ کی رقم کا خرچ کرنا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نفقات ہیں، جو انسان پر حقوق العباد کے ضمن میں عائد ہوتے ہیں، جیسا کہ انسان پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی پر خرچ کرے اور اسی طرح دیگر حقداروں پر بھی، جیسے اس کی ماں ہے، اس کا باپ ہے، اس کی اولاد ہے، اس کے بہن بھائی ہیں، اس کے بھتیجے اور بھانجے ہیں، اس کے چچے اور ماموں ہیں اور پھر اس کی پھوپھیوں اور خالائیں ہیں..... آخر تک، پھر ان کے علاوہ اس کے صدقہ کے مساکین وغیرہ اور وہ طالب علم بھی، جو صدقہ لینے کے مستحق ہیں، حقدار ٹھہرتے ہیں۔

اور اپنی جاہ (ذاتی اثر رسوخ) کو بطور 'احسان' خرچ کرنے کی صورت یہ ہے، کہ لوگوں کے ذات کے اعتبار سے مختلف مقام اور مرتبے ہوتے ہیں (اور ہر انسان کی جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے) ان میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو حاکم وقت اور سلطان کے مصاحبوں کے ہاں اپنا خاص اثر و رسوخ رکھتے ہیں، تو ایسا انسان اپنی ذاتی حیثیت کو نیکی اور بھلائی کے لئے اس طرح استعمال میں لاسکتا ہے کہ مثلاً: اس کے پاس کوئی ایسا ضرورت مند آدمی آجاتا ہے جو اس سے سلطان کے کسی قریبی آدمی کی سفارش کا طلب گار ہوتا ہے اور یہ سفارش (عام حالات میں) یا تو کسی تکلیف یا دکھ کے مداوے کے لئے ہوتی ہے اور یا پھر کسی قسم کی بھلائی یا فائدے کے حصول کی خاطر..... (تو ایسے میں انسان کو چاہئے کہ از روئے 'احسان' کے وہ اپنی ذاتی حیثیت اور مرتبے کو اس بھائی کی بھلائی کی خاطر کھپائے)

☆..... اور اپنے علم کے ذریعے کسی پر 'احسان' کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ: وہ اللہ کے بندوں کی رشد و ہدایت کے لئے اپنے علم کو خرچ کرے، عام اور خاص ہر قسم کے عوامی حلقوں اور مجلسوں میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے، یہاں تک کہ آپ کسی قبوہ خانہ کی مجلس میں بیٹھے ہوں تو تب بھی یہ بھلائی اور 'احسان' میں سے ہے کہ آپ وہاں بیٹھے لوگوں کو بھی دینی

تعلیم سے روشناس کرائیں، مگر ایسی مجالس میں حکمت و مصلحت کو ضرور استعمال میں لائیں کہ کہیں آپ لوگوں پر ایک بوجھ اور کراہت کا باعث نہ بن جائیں کہ جہاں کہیں بھی آپ چند لوگوں میں بیٹھیں ان کو وعظ و نصیحت کرنا اور ان سے اسی موضوع پر گفتگو کرنا شروع کر دیں، اس لئے کہ اللہ کے نبی ﷺ لوگوں کو نصیحت کرتے وقت ان کی بہتری و بھلائی کا خوب لحاظ رکھتے تھے، مگر آپ کی یہ نصیحت نہایت مبنی بر حکمت ہوتی، نہ بہت زیادہ اور نہ بہت طویل، کیونکہ انسانی نفوس (دل) کسی چیز سے جلدی ملول کھا جاتے اور اکتا جاتے ہیں اور جب وہ پُر ملول ہو جائیں تو جلدی تھک جاتے اور پھر کمزور ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات کسی معلم یا داعی کی کثرت سے وعظ و نصیحت اور گفتگو کے باعث وہ نیکی اور بھلائی کو بھی ناپسند کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

☆ اور لوگوں پر اپنے جسم و جان کے ذریعے 'احسان' کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے: ”..... اور یہ کہ تو آدمی کی، اس کی سواری کے سلسلے میں اعانت (مدد) کرے اور اس کو اس کی سواری پر بٹھائے، یا اس کے سامان کو اس پر لاد لے، تو یہ بھی صدقہ (اور نیکی) ہے۔“ (۵۸)

تو یہ آدمی، جس کی تو مدد کرے گا، اس کو اس کے سامان سمیت اٹھائے گا یا اس کی صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرے گا یا اسی طرح کا کوئی اور تعاون و اعانت کرے گا، تو یہ سب صورتیں، 'احسان' میں سے ہیں اور احسان کی یہ جملہ (مذکورہ) صورتیں بندوں کے، اللہ کے بندوں پر (احسان) کرنے کی ہیں۔

☆..... اور جہاں تک اللہ جل جلالہ کی 'عبادت و ریاضت' میں 'احسان' کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ آپ اللہ جل شانہ کی عبادت اس خشوع، خضوع اور انابت و رجوع اور عاجزی و انکساری سے کریں کہ گویا آپ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ”اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ تَعَالٰی کَاَنْكَ تَرَاهُ“..... ”کہ آپ اللہ تعالیٰ کی

اس طرح سے عبادت کریں کہ گویا آپ اسے پچشم خود دیکھ رہے ہیں..... اور یہ عبادت، یعنی انسان کی اپنے پروردگار کی اس انداز سے عبادت کرنا کہ گویا وہ اسے پچشم خود دیکھ رہا ہے شوق و طلب اور رغبت کی عبادت ہے، جس میں انسان اپنے آپ کو اس عبادت پر ابھارتے ہوئے اپنے نفس کو اس میں رغبت اور شوق رکھتے ہوئے پاتا ہے، اس لئے کہ اس دوران وہ، وہ چیز طلب کر رہا ہوتا ہے، جس سے وہ محبت کرتا ہے، تو اس طرح سے وہ اس (محبوب) کی عبادت کرتا ہے کہ گویا وہ اسے اپنے سامنے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہا ہے، لہذا وہ اس کا قصد (ارادہ) کرتا، اسی کی طرف رجوع کرتا اور اسی ذات سبحانہ و تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے.....

اور آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد: «فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ» اور اگر آپ دوران عبادت اس درجہ میں نہیں کہ آپ دیکھ رہے ہیں، تو یہ (کم از کم) کیفیت ضرور ہونی چاہئے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) آپ کو (عبادت کرتے) دیکھ رہا ہے۔“ اور اسے عبادتِ ہرب، اور خوف (یعنی راہ فرار اختیار کرنے اور خوف کھا جانے) کی عبادت کہا گیا ہے اور اسی لئے احسان میں اس عبادت کا دوسرا درجہ ہے۔

جب آپ اللہ عزوجل کی عبادت اس جذبے اور کیفیت سے نہ کریں کہ آپ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کی طلب میں منہمک ہیں اور نہ ہی نفس آپ کو اس ذات (معبود) برحق کی جانب وصال (ملاقات) پر انگخت دلاتا ہے تو (کم از کم) اس جذبے اور کیفیت سے سرشار ہو کر اس کی عبادت کریں کہ گویا وہ ذات برحق آپ کو دیکھ رہی ہے، تو ایسی حالت میں آپ اس معبود حقیقی کی بارگاہ میں کھڑے عبادت کریں گے تو یہ عبادت لرزہ برآندام کردینے والی ہوگی کہ وہ ذات آپ پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہے اور آپ اس کی کبریائی و جلالت سے خائف، اس کے تیار کردہ عذاب و عقاب سے بھاگ رہے ہیں اور آپ پر دوران عبادت کچکی طاری ہے، تو عبادت کا یہ درجہ ارباب سلوک (مشائخ طریقت) کے نزدیک پہلے درجے سے کم تر درجہ ہے۔“

اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت کی تعریف امام ابن القیمؒ نے اپنے (سلسلہ اشعار) ’قصیدہ‘  
نونیہ میں یوں فرمائی ہے:

وَعِبَادَةُ الرَّحْمَنِ غَايَةُ حُبِّهِ  
مَعَ ذَلِكَ عَابِدِهِ هُمَا رُكْنَانِ

”کہ عبادتِ رحمنؑ ان دو ارکان پر مبنی ہے: ایک عبادت گزار بندے کی، اپنے معبودِ برحق سے انتہاء درجے کی محبت اور دوسرے اس (عبادت گزار بندے) کی اپنے معبودِ برحق کے حضور انتہاء درجے کی عاجزی و انکساری۔“

تو معلوم ہوا کہ عبادت انہی دو امور پر مشتمل ہے، ایک انتہاء درجے کی معبود کے ساتھ محبت ہو، اور دوسرے انتہاء درجے کی محبوب کی بارگاہ میں عاجزی و انکساری کا اظہار ہو، اس محبت کے ورے ’طلب‘ یعنی محبوب مطلوب ہوتا ہے، جبکہ عاجزی و انکساری اور ذلت میں محبوب سے خوف اور اس سے بھاگ کر بچنے کا تصور کارفرما ہوتا ہے، تو اللہ عز و جل کی عبادت میں یہی ’احسان‘ ہے۔

☆..... اگر انسان اللہ عز و جل کی اس جذبے اور کیفیت سے عبادت کرے تو وہ شتاب اللہ جل شانہ کے لئے مخلص ہو کر اس کی عبادت کرے گا اور اس عبادت سے اس کا مقصود نہ دکھلا دیا ہوگا اور نہ شہرت اور نہ ہی لوگوں کے ہاں اپنی خوشامد خواہ لوگ اس کے احوال پر مطلع ہوں یا نہ ہوں، سب اس کے ہاں برابر متصور ہوں گے، وہ ہر حال میں اپنی عبادت میں ’احسان‘ پر عمل پیرا ہے، بلکہ یہ بات ’کمال اخلاص‘ میں سے ہے کہ انسان اس بات کا حریص ہو کہ لوگ اسے عبادت کرتے ہوئے نہ دیکھ پائیں اور اس کی عبادت اس کے پروردگار اور اس کے درمیان ایک بھید ہو، سوائے اس کے کہ اس کے اظہار اور تشہیر میں اسلام اور اہل اسلام کی مصلحت ہو، مثال کے طور پر ایک آدمی معاشرے میں امام اور مقتدا ہو اور وہ اس بات کو پسند کرے کہ وہ عامۃ الناس کے لئے اپنے طریقہ عبادت کو واضح طور پر بیان کرے، تاکہ لوگ اپنی عبادات کی ادائیگی

میں اسے مشعل راہ بنا کر اس پر عمل پیرا ہو سکیں، یا وہ اسے علی الاعلان ادا کرنا اس لئے پسند کرتا ہو، تاکہ اس کے دوست، احباب اور ساتھی اس کی پیروی کر سکیں تو اس میں سراسر خیر اور بھلائی ہے، بلکہ اس جیسی مصلحت، جسے وہ پیش نظر رکھتے ہوئے عبادات کو کھلے عام ادا کرتا ہے، بسا اوقات اسے مخفی اور چھپ کر ادا کرنے کی مصلحت سے زیادہ افضل و اعلیٰ ہوتی ہے..... اسی لئے تو اللہ عزوجل نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں پوشیدہ اور علانیہ ہر دو طرح سے خرچ کرتے ہیں..... تو جب یہ عمل پوشیدہ اور مخفی رکھنا قلبی اصلاح کے لئے زیادہ درست اور نفع بخش ہو، نیز اللہ جل جلالہ کی طرف رجوع کرنے کے اعتبار سے زیادہ مدد اور باعث خشوع و خضوع ہو تو وہ اس عمل کو پوشیدہ رکھتے ہیں، مگر جب عبادات کے اعلان اور اظہار میں اسلام کی کوئی مصلحت پنہاں ہو اور عام مسلمان ان کے طریقہ عبادت کی پیروی کرتے ہوں، تو پھر وہ اسے کھلے عام ادا کرتے ہیں اور ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ عمل کی جانب دیکھتا ہے کہ کون سا عمل کس طرح کی ادائیگی سے زیادہ درست اور صحیح ہے؟ تو عبادت میں جو سا طریقہ بھی زیادہ درست اور زیادہ منفعت بخش ہوگا، وہی عمل زیادہ کامل اور افضل ہوگا۔

”وَالدَّلِيلُ مِنَ السَّنَةِ الْمُطَهَّرَةِ: حَدِيثُ جَبْرِائِيلَ الْمَشْهُورُ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخْذَيْهِ وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ «الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا» قَالَ: صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ، قَالَ: «أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ



وَمَلَأْنِيهِ، وَكَتَبَهُ وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمَ الْآخِرِ، وَتَوَمَّنَ بِالْقَدْرِ خَيْرُهُ وَشَرُّهُ»  
 قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ، قَالَ: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ  
 فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ، قَالَ: «مَا الْمَسْئُولُ  
 عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ»، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا، قَالَ: «أَنْ تِلْدَ الْأُمَّةُ  
 رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحَفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبَنِيَانِ»  
 قَالَ: فَمَضَى فَلَبِثْنَا مَلِيًّا فَقَالَ: (يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مِنَ السَّائِلِ)؟ قُلْتُ: اللَّهُ  
 وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: هَذَا جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ أَمْرَ دِينِكُمْ ﴿۵۹﴾

”اور دین کے ان تین درجات پر سنت مطہرہ سے دلیل نبی رحمت ﷺ کی یہ مشہور حدیث ہے جو حدیث جبرائیل علیہ السلام کے نام سے معروف ہے ”حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: ”اس حال میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک (اجنبی) آدمی ہماری مجلس میں وارد ہوا، جس کا لباس نہایت سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے اس پر سفر کے کوئی آثار (گردوغبار وغیرہ) بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی ان کو جانتا تھا، تب وہ (اجنبی آدمی) رسول اللہ ﷺ کے سامنے آپ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھتے ہوئے دوزانوں ہو کر (بادب طریقہ سے) بیٹھ گیا، اور کہا: اے محمد! ﷺ مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: اسلام یہ ہے کہ آپ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے (بچے) رسول ہیں اور یہ کہ آپ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، رمضان المبارک کے روزے رکھیں اور اگر زاوراہ کی توفیق ہو تو بیت اللہ شریف کا حج کریں۔“ اس نووارد (مسافر) نے (یہ سن کر) کہا: آپ ﷺ نے سچ فرمایا ہے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) ہم نے اس کی اس بات پر تعجب کیا کہ پہلے تو آپ (ﷺ) سے سوال کرتا ہے، پھر خود ہی تصدیق بھی کر رہا ہے، اس کے بعد اس نے کہا: مجھے بتائیے کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، روز قیامت اور اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان رکھیں، یہ جواب سن کر اس اجنبی مسافر نے پھر کہا: آپ ﷺ نے سچ فرمایا ہے۔“

پھر اس نے کہا (اے محمد ﷺ) مجھے بتائیے کہ ”احسان“ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”احسان“ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت (اس خشوع و خضوع، انابت، تدلل اور تضرع سے) کریں کہ گویا آپ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور اگر آپ عبادت میں اس بلند درجہ کو نہیں پاسکتے تو (کم از کم) یہ کیفیت ضرور ہونی چاہئے کہ وہ (حقیقی معبود) آپ کو دیکھ رہا ہے، تو پھر اس نے کہا: مجھے آپ ﷺ قیامت کے بارے میں بتائیں کہ کب آنے والی ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: کہ قیامت پہا ہونے کے بارے میں مسئول (جس سے سوال کیا جا رہا ہے) سائل (سوال کرنے والے) سے زیادہ نہیں جانتا، تو اس پر اس (اجنبی مسافر) نے کہا: کہ اس قیامت کی علامات ہی بتادیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قرب قیامت) حالات یہ ہو جائیں گے کہ لوٹنی اپنے آقا کو جنم دے گی (مطلب یہ کہ اولاد اپنی ماں کو اپنی زرخیز نوکرانی تصور کرے گی۔ العیاذ باللہ) اور آپ دیکھیں گے کہ ننگے پاؤں، ننگے جسم، بھیڑ بکریاں چرانے والے (چرواہے) لوگ بڑی بڑی (بلند و بالا) عمارتیں کھڑی کرنے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ وہ اجنبی مسافر اتنی بات کرنے اور سن لینے کے بعد وہاں سے تو چلا گیا، مگر ہم تھوڑی دیر تک (سراسیمہ و خاموش) بیٹھے رہے، تب رسول اللہ ﷺ نے (ہم سے مخاطب ہو کر) فرمایا: اے عمر! (رضی اللہ عنہ) کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ سوال کرنے والا نوادہ کون تھا؟ ہم نے کہا: ”اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ جبریل امین (علیہ السلام) تھے، جو ایک اجنبی شخص کی صورت میں تمہیں، تمہارے اُمور دین کی تعلیم دینے آئے تھے۔“ (متفق علیہ)

□۵۵۵ اسے امام مسلم نے کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام میں روایت کیا ہے، نیز اس حدیث کے زیادہ تر حصے کی شرح پہلے گزر چکی ہے اور اس حدیث پر ہماری (مراد شیخ صالح العثیمینؒ) مبسوط شرح ”مجموع الفتاویٰ والرسائل“ ج ۳، ص ۱۴۳ میں موجود ہے۔

## معرفۃ نبیکم ﷺ

(نبی ﷺ کی پہچان)

الْأَصْلُ الثَّالِثُ ①: مَعْرِفَةُ نَبِيِّكُمْ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهُوَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ هَاشِمٍ وَهَاشِمٌ مِنْ قُرَيْشٍ وَقُرَيْشٌ مِنَ الْعَرَبِ وَالْعَرَبُ مِنْ ذُرِّيَةِ إِسْمَاعِيلَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ الْخَلِيلِ عَلَيْهِ وَعَلَى نَبِينَا أَفْضَلُ الصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ وَلَهُ مِنَ الْعُمُرِ: ثَلَاثٌ وَسِتُّونَ سَنَةً مِنْهَا أَرْبَعُونَ قَبْلَ النُّبُوَّةِ، وَثَلَاثٌ وَعِشْرُونَ نَبِيًّا وَرَسُولًا نَبِيٌّ يَأْقُرُ، وَأُرْسِلَ بِالْمُدَّثِرِ وَبَلَدُهُ مَكَّةَ وَهَاجَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ

”تیسرا اصول: تمہارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی معرفت ہے“ اور آپ ﷺ کا نام و نسب یہ ہے: محمد (ﷺ) بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف ..... بنو ہاشم قبیلہ قریش سے اور قبیلہ قریش، عرب سے اور عرب، حضرت اسماعیل بن سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہما و علیٰ مینا افضل الصلاۃ والسلام کی اولاد سے ہیں۔ آپ (ﷺ) نے کل تریسٹھ برس عمر پائی، جن میں سے چالیس برس بعثت و نبوت سے پہلے اور بقیہ تیس سال بحیثیت نبی و رسول گزارے، آپ ﷺ کو: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ یعنی ”سورہ علق“ کی ابتدائی پانچ آیات مبارکہ کے نزول کے ساتھ نبوت کے پاکیزہ خلعت سے نوازا گیا اور ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ﴾ ..... الآية ﴿یعنی ”سورہ المدثر“ کے نزول کے ساتھ باور رسالت سے مشرف ہوئے، آپ (ﷺ) کی جائے پیدائش مکہ مکرمہ ہے اور مدینہ طیبہ کی جانب آپ (ﷺ) نے ہجرت فرمائی۔“

① یعنی ان تین اصولوں میں سے تیسرا اصول جن کی معرفت حاصل کرنا انسان پر

واجب ہے اور وہ یہ ہیں:

بندے کا اپنے رب کی، اپنے دین کی اور اپنے نبی (ﷺ) کی معرفت حاصل کرنا اور جہاں تک بندے کی اپنے رب (پروردگار) اور اپنے دین کی معرفت کی بات ہے، تو اس بارے میں کلام (گفتگو قبل ازیں) گزر چکی ہے اور بندے کی اپنی نبی (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی معرفت کا جہاں تک تعلق ہے تو (اس معرفت کا حصول) پانچ امور کو متضمن (یعنی شامل) ہے:

۱۔ پہلا امر: کہ آپ ﷺ کے سلسلہ نسب کی پہچان کی جائے۔ آپ ﷺ نسب کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے اعلیٰ اور معزز تھے، آپ ﷺ خاندانی لحاظ سے ہاشمی، قریشی اور خالص عربی ہیں اور (جیسا کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے) آپ محمد (ﷺ) بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم..... آخر تک ہیں۔

۲۔ دوسرا امر: آپ (ﷺ) کی عمر، آپ (ﷺ) کی جائے ولادت اور آپ (ﷺ) کی جائے ہجرت وغیرہ تفصیل سمیت معلوم کی جائیں، جیسا کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ نے ان امور کا تذکرہ اپنے اس بیان میں کیا ہے: وَلَهُ مِنَ الْعُمْرِ ثَلَاثٌ وَسِتُّونَ سَنَةً وَبَلَدُهُ مَكَّةَ وَهَاجَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ..... ”اور آپ (ﷺ) کی پوری عمر تریسٹھ برس تھی، آپ (ﷺ) کی جائے پیدائش مکہ شہر ہے اور آپ (ﷺ) نے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی۔“

مطلب یہ ہے کہ آپ (ﷺ) مکہ المکرمہ میں پیدا ہوئے اور وہاں آپ (ﷺ) نے اپنی عمر مبارک کے تین (۵۳) سال گزارے، پھر آپ (ﷺ) نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں آپ (ﷺ) نے بقیہ دس برس بسر کئے، تو اس طرح آپ (ﷺ) نے پورے تریسٹھ (۶۳) برس مکمل ہو جانے پر بعد از ہجرت گیارہویں سال ربیع الاول کے مہینے میں مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی۔

۳۔ تیسرا امر: آپ (ﷺ) کے عرصہ نبوت و رسالت کی معرفت حاصل کرنا اور یہ

پورے تیس برس کی مدت ہے اور جب آپ (ﷺ) کی طرف وحی کا آغاز ہوا، تو اس وقت آپ (ﷺ) کی عمر مبارک چالیس برس تھی، جیسا کہ آپ (ﷺ) کے شعرائے کرامؓ میں سے کسی ایک کا شعر ہے:

وَأَنْتَ عَلَيْهِ أَزْبَعُونَ فَأَشْرَقَتْ  
شَمْسُ النُّبُوءَةِ مِنْهُ فِي رَمَضَانَ

”اور جب آپ (ﷺ) کی عمر مبارک کے چالیس برس پورے ہوئے تو رمضان المبارک (کے بابرکت) مہینے میں آپ (ﷺ) کی ذات اطہر سے خورشید نبوت جگمگانے لگا۔“

چوتھا امر: کس دلیل کی بناء پر آپ (ﷺ) ’نبی‘ تھے اور کس دلیل کی بناء پر آپ (ﷺ) ’رسول‘ تھے؟ آپ (ﷺ) اللہ جل شانہ کے اس فرمان کے نازل ہونے پر نبوت سے سرفراز کئے گئے: ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (علق: ۱-۵)

”اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھئے، جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا (اور) انسان کو خون کے قطرے سے پیدا کیا، پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا (اور) انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جو وہ (سرے سے) جانتا ہی نہ تھا۔“

پھر آپ (ﷺ) منصب رسالت سے بہرہ ور فرمائے گئے، جب اللہ جل مجدہ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبُّكَ فَكْبَرُ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالْزُجْجَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ (الدثر: ۱-۷)

”اے محمد (ﷺ) جو کھیل اوڑھے سو رہے ہو، اٹھئے! اور (لوگوں کو بُرے انجام سے) ڈرائیے اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے کپڑے پاک، صاف رکھئے اور گندگی سے دور رہئے اور زیادہ حاصل کرنے کے لئے احسان نہ کیجئے اور اپنے پروردگار کی خاطر صبر کیجئے۔“

تب آپ (ﷺ) اس آیت کریمہ کے نزول پر، منصب رسالت کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمر بستہ ہو گئے، آپ (ﷺ) نے اپنی قوم کو (عذاب الہی سے) ڈرایا اور اللہ عز وجل کے

حکم کی بجا آوری کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

☆ اور نبیؐ اور رسولؐ میں فرق کے بارے میں اللہ علم حضرات کہتے ہیں: ”کہ نبیؐ وہ ہے جس کی جانب شریعت (بذریعہ وحی) نازل کی جائے، مگر وہ اس شریعت طاہرہ کی تبلیغ کا پابند نہ بنایا جائے اور رسولؐ وہ ہستی ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ شریعت (بذریعہ وحی) نازل فرمائے اور اسے اس کی تبلیغ اور اس پر عمل کرنے کا بھی حکم فرمائے، تو علمائے کرامؒ کے اس قول کی بناء پر ہر رسولؐ نبیؐ ہوتا ہے جبکہ ہر نبیؐ رسولؐ نہیں ہوتا۔

﴿پانچواں امر﴾ آپ (ﷺ) کو کون سا بنیادی پیغام دے کر بھیجا گیا اور کیوں؟ آپ (ﷺ) کو (تمام بنی نوع انسان کی طرف) اللہ عزوجل کی توحید کا پیغام دے کر اور اس (جل جلالہ) کی شریعت طاہرہ دے کر، جو ہر امر معروف (نیکی) کی بجا آوری اور ہر امر منکر (برائی) کو ترک کرنے پر مشتمل ہے، بھیجا گیا ہے، نیز آپ تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں، تاکہ آپ (ﷺ) دنیا کے باسیوں کو، کفر و شرک اور جہالت کی ظلمتوں (اندھیروں) سے نکال کر، علم و عرفان اور ایمان و توحید کی روشنی سے بہرہ ور کر دیں، یہاں تک کہ وہ آپ (ﷺ) کی اس ہدایت و رحمت کے ذریعے، اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضا و خوشنودی سے مشرف ہو کر، اس کی تیار کردہ سزا اور نافرمانگی سے بھی بچ سکیں۔

بَعَثَهُ اللَّهُ بِالْإِنذَارَةِ عَنِ الشِّرْكِ، وَيَدْعُو إِلَى التَّوْحِيدِ ۖ وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْبِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ (المدثر: ۱-۷) وَمَعْنَى ﴿قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ يُنْذِرُ عَنِ الشِّرْكِ وَيَدْعُو إِلَى التَّوْحِيدِ (وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ أَيْ عَظِّمُهُ بِالتَّوْحِيدِ) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ أَيْ طَهِّرْ أَعْمَالَكَ عَنِ الشِّرْكِ (وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ الرُّجْزُ: الْأَصْنَامُ وَهَجْرُهَا: تَرْكُهَا، وَالْبَرَاءَةُ مِنْهَا وَأَهْلِهَا، أَخَذَ عَلَى هَذَا عَشْرَ سِنِينَ يَدْعُو إِلَى التَّوْحِيدِ ۖ وَبَعْدَ الْعَشْرِ عُرِجَ بِهِ إِلَى السَّمَاءِ ۖ

”اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو شرک سے ڈرانے، اور توحید کی دعوت دینے کے لئے

مبعوث فرمایا۔ اس بات کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے۔ ”اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے اٹھو، اور خبردار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو، اور گندگی سے دور رہو اور زیادہ حاصل کرنے کے لئے احسان نہ کرو اور اپنے پروردگار کی خاطر صبر سے کام لو۔“

مفردات کی شرح: ﴿قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ آپ (ﷺ) ان لوگوں کو شرک سے ڈرائیں اور توحید کی طرف دعوت دیں۔

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾: توحید کے ساتھ ساتھ اپنے پروردگار کی عظمت اور کبریائی بیان کریں۔  
﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾: اپنے اعمال کو شرک سے پاک رکھیں۔

﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾: الرُّجْز کا معنی اصنام (بت) اور فاهجُر کا مطلب یہ ہے، کہ جس طرح، اب آپ (ﷺ) ان سے دور رہے ہیں، اسی طرح انکے بنانے والوں اور پوجنے والوں سے دور رہیں، اور ان بتوں اور ان کے پجاری مشرکوں سے بیزاری اور براءت کا اظہار کریں..... آپ (ﷺ) نے اس بنیادی نھط (توحید) پر دس سال صرف کئے اور لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف دعوت دیتے رہے، دس سال کے بعد آپ (ﷺ) کو آسمانوں کی سیر (معراج) کرائی گئی۔“

□ ﴿۱﴾ مطلب یہ کہ دنیا والوں کو شرک سے ڈرائے اور بچائے اور اللہ عزوجل کی توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید اسماء و صفات کی طرف دعوت دے۔

□ ﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿يَا أَيُّهَا الْمَدْيَنِيُّ﴾ میں خطاب اور نداء اللہ کے رسول ﷺ کے لئے ہے۔

□ ﴿۳﴾ اللہ جل شانہ کے اس فرمان ﴿قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ میں، اللہ عزوجل، اپنے نبی (ﷺ) کو یہ حکم دے رہے ہیں کہ وہ اس فریضہ رسالت کو پوری محنت، جگ و دو اور جانفشانی سے ادا کریں، لوگوں کو شرک کے خوفناک انجام سے ڈرائیں اور اس میں واقع ہونے سے بچائیں، جیسا کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے بھی ان آیات مبارکہ کی تفسیر (اسی انداز

سے) کی ہے۔

□⑤ یعنی اللہ کے نبی ﷺ نے اس بنیادی نقطہ توحید پر دس سال صرف کئے اور اس دوران آپ ﷺ مسلسل لوگوں کو اللہ کی توحید طرف اور اسی یکتا ذات کی عبادت کی دعوت دیتے رہے۔

□⑥ کلمہ العُرُوج کا مطلب ہے الصُّعُودُ یعنی بلندی کی طرف چڑھنا اور اسی سے اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿تَعْرُجُ الْمَلَكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ﴾ (المعارج: ۳) ”جس (اللہ تعالیٰ) کی طرف روح اور فرشتے ایک دن میں چڑھتے ہیں“.....

اور یہ (معراج) اللہ کے نبی ﷺ کی بڑی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے قبل بہرہ ور فرمایا اور تفصیل اس واقعہ معراج کی یہ ہے: کہ آپ ﷺ (کعبہ مشرفہ میں حجر (یعنی حطیم مقام) میں سو رہے تھے کہ ایک آنے والے (فرشتے) نے آ کر آپ ﷺ کے سینہ اطہر کے اوپر ہنسی سے لے کر نیچے بطن اطہر تک پیٹ کھولا، آپ ﷺ کے قلب اطہر کو نکالا اور اس مبارک سفر (اسراء و معراج) کے لئے تیاری کے طور پر آپ ﷺ کے دل کو حکمت اور ایمان سے بھر دیا، پھر وہ فرشتہ اپنے ساتھ ایک سفید رنگ کا جانور (سواری کے لئے) لایا، جو قد و قامت میں خنجر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اور جس کا نام ’براق‘ تھا (اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ) وہ اپنی نگاہ کی مسافت کی حد تک اپنا ایک قدم رکھتا تھا، آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے اور (اس مبارک سفر میں) آپ ﷺ کے رفیق اور ساتھی حضرت جبریل روح الامین علیہ السلام تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ بیت المقدس پہنچے، وہاں اتر کر آپ ﷺ تمام انبیاء اور رسولوں (علیہم السلام) کے امام بنے، سب نے آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، تاکہ اس امامت سے آپ ﷺ کی فضیلت اور شرف و کمال عیاں ہو جائے اور یہ بھی کہ آپ ﷺ ہی سب کے امام اعظم اور مقتدی ہیں؟



بعد ازاں (سفر معراج میں) میں حضرت جبریل علیہ السلام کو لے کر آسمان دنیا (پہلے آسمان) کی طرف چڑھے اور آسمان میں داخلے کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس پر اندر سے کہا گیا کہ: کون ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ”جبریل ہوں، پھر پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر کہا گیا: کیا آپ (ﷺ) کو بلا بھیجا گیا ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں تب اندر سے کہا گیا، ’خوش آمدید‘ کتنا ہی مبارک اور راجھا ہے آنے والے کا آنا، پھر آپ (ﷺ) کے لئے (پہلے آسمان کا) دروازہ کھول دیا گیا، تو وہاں آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کھڑے پایا، حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ (ﷺ) سے کہا: یہ آپ کے باپ آدم ہیں، انہیں سلام کہئے تو آپ (ﷺ) نے ان کو سلام کہا تو انہوں نے سلام کا جواب دیا، اور پھر کہا: صالح (نیک) بیٹے اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو..... اور

وہاں ناگہاں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے سعادت مند لوگوں کی روحمیں ان کے دائیں طرف اور بُرے اور بد بخت لوگوں کی روحمیں ان کے بائیں طرف تھیں، تو جب حضرت آدم علیہ السلام دائیں جانب (نیک ارواح کو) دیکھتے تو خوش ہوتے اور ہنستے اور جب بائیں جانب (برے اور بد بخت لوگوں کی ارواح کو) دیکھتے تو رونے لگتے، پھر حضرت جبریل علیہ السلام آپ (ﷺ) کو لے کر دوسرے آسمان کی طرف چڑھے اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا..... اور وہی سوال و جواب ہوئے، جو پہلے آسمان پر ہوئے تھے، تو جب دروازہ کھولا گیا، تو آپ (ﷺ) نے وہاں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو موجود پایا، جو ایک دوسرے کے رشتے میں خالہ زاد بھائی ہیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ حضرت یحییٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) ہیں، ان کو سلام کہئے آپ (ﷺ) نے ان کو سلام کہا تو ان دونوں نے آپ (ﷺ) کے سلام کا جواب دیا، پھر ان دونوں نے کہا: ”صالح بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو“

پھر حضرت جبریل علیہ السلام آپ (ﷺ) کو لے کر تیسرے آسمان کی طرف چڑھے اور آسمان کا دروازہ کھٹکھٹایا..... اور وہی سوال و جواب ہوئے، جو پہلے اور دوسرے آسمان پر ہوئے تھے، جب دروازہ کھولا گیا، تو وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو پایا، حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ

یوسف (علیہ السلام) ہیں۔ ان کو سلام کہئے آپ (ﷺ) نے ان کو سلام کہا، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ”صالح بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔“..... پھر حضرت جبریل (علیہ السلام) آپ (ﷺ) کو لے کر چوتھے آسمان کی طرف چڑھے اور آسمان کا دروازہ کھٹکھٹایا..... اور لیجنم وہ سوال و جواب ہوئے جو پہلے تین آسمانوں کے دروازے کھلوانے پر ہوئے تھے، پھر جب یہ دروازہ بھی کھول دیا گیا، تو آپ (ﷺ) نے وہاں حضرت ادریس (علیہ السلام) کو پایا، حضرت جبریل (علیہ السلام) نے کہا یہ ادریس (علیہ السلام) ہیں، آپ ان کو سلام کہئے، آپ (ﷺ) نے حضرت ادریس (علیہ السلام) کو سلام کہا انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: صالح بھائی اور صالح نبی کا یہاں آنا مبارک ہو۔“.....

پھر حضرت جبریل (علیہ السلام)، آپ (ﷺ) کے لے کر پانچویں آسمان کی جانب چڑھے اور آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے دستک دی..... اور وہی سوال و جواب ہوئے جو پہلے آسمانوں پر ہوئے تھے۔ پھر جب دروازہ کھول دیا گیا، تو وہاں آپ (ﷺ) نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بھائی حضرت ہارون بن عمران (علیہ السلام) کو موجود پایا۔ حضرت جبریل (علیہ السلام) نے کہا یہ ہارون (علیہ السلام) ہیں، ان کو سلام کہئے، آپ (ﷺ) نے ان کو سلام کہا، انہوں نے سلام کا جواب دیا اور یہ بھی کہا: ”صالح بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔“.....

پھر حضرت جبریل (علیہ السلام) آپ (ﷺ) کو لے کر چھٹے آسمان کی طرف چڑھے اور دروازے پر دستک دی،..... اور دونوں طرف سے وہی سوال و جواب ہوئے، جو پہلے آسمانوں پر ہوئے تھے۔ دروازہ کھلنے پر، آپ (ﷺ) نے وہاں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پایا، حضرت جبریل (علیہ السلام) نے کہا: یہ موسیٰ (علیہ السلام) ہیں، آپ ان کو سلام کہئے، آپ (ﷺ) نے ان کو سلام کہا، تو انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہنے لگے: صالح بھائی اور صالح نبی کا یہاں آنا مبارک ہو۔“..... پھر جب آپ (ﷺ) وہاں سے چلے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے رونا شروع کر دیا، آپ (ﷺ) سے کہا گیا: کہ آپ کو کس چیز نے رلایا ہے؟ تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا: میں اس لئے روتا ہوں کہ ایک لڑکا میرے بعد نبی بنا کر بھیجا گیا، جس کی امت کے

لوگ، میری امت کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں جنت میں جائیں گے۔“

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ رونا، ان کی اپنی امت کا، ان فضائل سے محروم رہ جانے کے غم میں تھا (جس کی بناء پر وہ کثیر تعداد میں جنت میں جانے سے محروم ہو گئے) نہ کہ حضرت محمد (ﷺ) کی امت سے حسد کی بناء پر..... پھر حضرت جبریل علیہ السلام آپ (ﷺ) کو لے کر ساتویں آسمان کی طرف چڑھے اور دروازہ کھولنے کے لئے دستک دی، اندر سے آواز آنے پر وہی سوال و جواب ہوئے، جو قبل ازیں تمام آسمانوں پر ہوئے تھے..... پھر جب ساتویں آسمان کا دروازہ کھلا تو وہاں آپ (ﷺ) نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو پایا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ آپ کے باپ (جد امجد) ابراہیم علیہ السلام ہیں، آپ ان کو سلام کہئے، تو آپ (ﷺ) نے ان کو سلام کہا: انہوں نے آپ (ﷺ) کے سلام کا جواب دیا اور کہا: صالح بیٹے اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔“

اور حضرت جبریل الامین علیہ السلام نے، آپ (ﷺ) کی رفاقت میں، ان انبیاء علیہم السلام سے اس لئے ملاقات کی تاکہ (اس مبارک سفر میں) آپ (ﷺ) کا شرف و کمال اور عزت و تکریم ظاہر ہو جائے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ساتویں آسمان پر اس ”بیت معمور“ (فرشتوں کے قبلہ) کی طرف اپنی کمر کے سہارے ٹیک لگائے ہوئے تھے، جس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے (عبادت اور طواف کے لئے) داخل ہوتے ہیں، وہ نماز پڑھتے ہیں اور پھر باہر نکل آتے ہیں اور پھر وہ دوسرے دن واپس نہیں لوٹتے، بلکہ ان کے علاوہ اور فرشتوں کا گمروہ عبادت و طواف کے لئے آتا ہے، جن کو اللہ عز و جل کے سوا اور کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ بعد ازاں اللہ کے نبی (ﷺ) کو سِدْرۃُ الْمُنْتَهٰی کی طرف اٹھایا گیا اس سِدْرۃِ الْمُنْتَهٰی کو اللہ کے حکم سے جن دلفریب، پر رونق اور حسین و جمیل اشیاء نے ڈھانپ لیا ہے، ان کے حسن و جمال اور کمال کو بیان کرنا کسی کے بس میں نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ پر ہر دن اور رات میں پچاس نمازیں فرض کیں، جس پر

آپ (ﷺ) راضی ہوئے، (بارگاہ الہی میں) سر تسلیم خم کیا..... پھر آپ (ﷺ) واپس ہوئے، تو جب موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس سے گزرے، تو انہوں نے پوچھا: کہ آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا کچھ فرض کیا ہے؟ آپ (ﷺ) نے جواب دیا، ہر دن پچاس نمازیں، اس پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے، بلا شک آپ کی امت ان فرائض کی ادائیگی کی طاقت نہیں رکھے گی، میں نے آپ سے پہلے لوگوں کو خوب آزمایا ہے اور بنی اسرائیل کو (خاص طور پر) خوب جانچا پرکھا ہے، لہذا آپ اپنے پروردگار کی طرف جائیے اور اس سے اپنی امت کے لئے تخفیف (یعنی نمازوں کو کم کرنے) کی درخواست کیجئے..... تو اس پر اللہ کے نبی (ﷺ) نے فرمایا: ”میں اپنے رب کے پاس واپس گیا، تو میری درخواست پر میرے رب نے مجھ سے دس نمازیں کم کر دیں، اور اسی طرح میں بار بار (موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر) اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوتا رہا، اس سے کمی اور تخفیف کی درخواست کرتا رہا، یہاں تک فرض نمازیں صرف پانچ رہ گئیں، تو ایک منادی (آواز دینے والے) نے آواز دی: ”میں نے فریضہ عبادت جاری و نافذ کر دیا اور اپنے بندوں پر آسانی کر دی ہے۔“

اور اسی معراج کی شب، اللہ کے نبی (ﷺ) کو جنت کی سیر کرائی گئی، تو آپ (ﷺ) نے اس میں موتیوں کے بنے ہوئے قبہ نما (محلات) دیکھے، جن کی مٹی مسک (کستوری) تھی، پھر آپ (ﷺ) واپس زمین کی طرف اُترے، یہاں تک کہ آپ (ﷺ) رات کے وقت (صبح کے) گہرے اندھیرے میں مکہ مکرمہ تشریف لائے اور صبح (فجر) کی نماز وہاں (مکہ مکرمہ) میں ادا کی۔“ (۶۰)

وَفَرَضَتْ عَلَيْهِ الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَصَلَّى فِي مَكَّةَ ثَلَاثَ سِنِينَ ۖ وَبَعْدَهَا أَمْرًا بِالْهَجْرَةِ ۖ إِلَى الْمَدِينَةِ

”اور آپ (ﷺ) پر (ہر دن اور رات میں) نماز پنجگانہ فرض کی گئی، آپ (ﷺ) تین سال تک مکہ مکرمہ میں نماز ادا کرتے رہے، اس کے بعد آپ (ﷺ) کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم مل گیا۔“

□ ﴿۷﴾ اور آپ (ﷺ) مکہ مکرمہ میں رباعی نماز دو رکعت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ آپ (ﷺ) نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے، مدینہ منورہ نزول اجلال فرمایا، تو یہی دو رکعت، سفر کی نماز ٹھہری اور حضر (یعنی اقامت کی حالت میں پڑھی جانے والی) نمازیں بڑھادی گئیں۔

□ ﴿۸﴾ اللہ عزوجل نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم فرمایا، اس لئے کہ اہل مکہ نے آپ (ﷺ) کو دعوت حق سے (تختی) سے روکا اور بعثت نبوی کے تیرہویں سال، ربیع الاول کے مہینے میں اللہ کے نبی ﷺ ”وحی الہی“ کے پہلے مقدس شہر مکہ مکرمہ، جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک تمام مقامات میں سے سب سے بڑھ کر محبوب مقام ہے، سے (اللہ کی راہ میں) مہاجر کی حیثیت سے مدینہ منورہ پہنچے۔ آپ (ﷺ) اپنے پروردگار کے حکم سے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے لئے نکل کھڑے ہوئے، اس کے بعد کہ آپ (ﷺ) نے مسلسل تیرہ برس (وہاں کے باسیوں کو) پیغام حق پہنچایا۔ ان کو عَلٰی وَجْهِ الْبَصِيرَةِ دُعوتِ توحید دی، مگر قریش اور دیگر قبائل کے اکثر سرکردہ لوگوں کی جانب سے سوائے اس دعوت کے انکار و اعراض (منہ موڑنے) کے اور پھر رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو انتہائی کڑی تکالیف و مصائب سے دوچار کرنے کے، اور کچھ نہ پایا، یہاں تک کہ معاملے کی شدت نے ان مخالفین کو ایسے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرنے تک پہنچا دیا کہ انہوں نے مکہ دُورِ یب اور دھوکہ دہی سے اللہ کے نبی (ﷺ) کو (نعوذ باللہ) قتل تک کرنے کے لئے خفیہ سازشیں تیار کرنا شروع کر دیں اور وہ اس طرح کہ ان (دسیسہ کار کافروں) کے بڑے سرکردہ سرداران اپنے دارالندوة (ایوان پارلیمنٹ) میں یہ سازشی جال بننے کے لئے، آپس میں مشورہ کی غرض سے اکٹھے ہوئے کہ وہ ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کون سا رویہ اور طریقہ اختیار کریں؟، خصوصاً جب انہوں نے آپ (ﷺ) کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرتے ہوئے دیکھا، اس لئے کہ خود اللہ کے رسول بھی عنقریب مدینہ میں اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے، پھر وہ وہاں کے رہنے والوں (یعنی انصار) سے (اور ان مہاجرین سے) مدد اور نصرت

طلب کریں گے، اور مدینہ کے لوگ (انصار) تو وہ ہیں، جنہوں نے اللہ کے رسول (ﷺ) کے ہاتھ پر اس جذبے سے بیعت کی ہے کہ وہ رسول اللہ (ﷺ) کا ان کے مخالفین اور دشمنوں سے اسی طرح دفاع کریں گے، جس طرح وہ اپنے دشمنوں سے، اپنے بچوں اور اپنی عورتوں کا دفاع کرتے ہیں، اور انجام کار یہ ہوگا کہ اس (رسول اللہ ﷺ) کا قریش پر غلبہ ہوگا اور وہ خود اس مدینہ کی ریاست کا حکمران ہوگا۔

ان کی آپس کی گفتگو جب اس مرحلہ میں داخل ہوئی تو اللہ کے دشمن ابو جہل نے اپنی رائے پیش کی، کہ ہم قبائل عرب کے ہر قبیلہ سے ایک مضبوط اور توئمند جوان کا انتخاب کرتے ہیں، پھر ہم ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک قاطع (یعنی تیز دھار اور کاٹ رکھنے والی) تلوار دیتے ہیں، یہ سب نو جوان اکٹھے ہو کر محمد (ﷺ) کا گھیراؤ کر لیں پھر اس پر یکبار پل پڑیں اور ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیں، تو اس طرح ہم اس سے چھٹکارا پا کر سکھ کا سانس لیں گے، نیز محمد (ﷺ) کو قتل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرنے سے عرب کے تمام قبائل میں اس کا خون بٹ جائے گا اور بنو عبد مناف (یعنی نبی ﷺ) کا خاندان اپنی پوری قوم سے مکر لینے کی سکت نہیں رکھ سکے گا اور بالآخر وہ اس کی دیت لینے پر راضی ہو جائیں گے، تو ہم سب مل کر انہیں یہ دیت (آسانی سے) ادا کر دیں گے۔

کفار و مشرکین کی اس ناپاک سازش سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (ﷺ) کو آگاہ کر دیا، اور آپ (ﷺ) کو ہجرت کا حکم فرمایا، ہجرت مدینہ کے سلسلے میں (آپ کے یار غار) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے کہ اللہ کے نبی (ﷺ) نے ان سے فرمایا: اے ابوبکر ذرا ٹھہر جائیے، مجھے اُمید ہے کہ (عنقریب اللہ کی طرف سے) مجھے ہجرت کی اجازت مل جائے، اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت و رفاقت کی تربت میں رُک گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”اس وقت کہ جب نصف انہار کی چمکدار دوپہر کو ہم ابوبکرؓ (یعنی اپنے والد محترم) کے گھر پر تھے کہ اچانک رسول اللہ (ﷺ) خلاف معمول دروازے پر

تشریف لائے تو ابو بکرؓ (میرے والد محترم) نے کہا: ”میرے ماں باپ آپ (ﷺ) پر فدا (قربان) ہوں اللہ کی قسم! اس وقت آپ (ﷺ) کو کوئی نہایت اہم معاملہ یہاں تک لایا ہے۔“ تب اللہ کے نبی ﷺ اندر تشریف لائے اور (میرے والد محترم) ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) سے فرمایا: ”جو بھی اور فرد گھر پر ہے، اسے اپنے سے علیحدہ کر دو، تو انہوں نے کہا: اگر کوئی ہے تو وہ آپؐ کی اہلیہ (عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) ہی ہے۔ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں! تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ”مجھے مکہ مکرمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے لئے نکلنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا: آپؐ کی مصاحبت میں (میں بھی جاؤں گا؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اس پر حضرت ابو بکرؓ کہنے لگے: میری ان دو ساریوں میں سے ایک سواری کو (زاد راہ کے طور پر) قبول فرمائیے، تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: (مفت میں نہیں) قیمتاً لوں گا۔“

پھر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ گھر سے نکلے اور ”جبل ثور“ کی غار میں تین راتیں متواتر ٹھہرے رہے۔ آپؐ کے نزدیک حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ رات بسر کرتے تھے۔ جو ایک ذہن و فطین اور ہوشیار نوجوان تھے۔ وہ روزانہ رات کے آخری پہر مکہ پہنچ جایا کرتے اور صبح کے وقت قریش مکہ کے درمیان ہوتے وہ اللہ کے نبی (ﷺ) اور آپؐ کے ساتھیوں کے بارے میں، جو بھی کوئی نئی خبر سنتے، اسے فوراً ازبر کر لیتے اور جب رات کا اندھیرا چھانے لگتا، تو واپس غار ثور کے قریب (آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو) وہ خبر آ سنا تے، اب تو قریش مکہ نے اللہ کے نبی (ﷺ) اور آپؐ کے ساتھیوں کی تلاش اور جستجو میں ہر حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا، یہاں تک کہ انہوں نے آپ (ﷺ) اور آپؐ کے یار غار دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک کو پکڑ کر لانے والے کے لئے ایک سوانٹ انعام کا اعلان کر دیا، لیکن دشمنوں کی یہ سب کوششیں اکارت گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کے ساتھ تھا، اپنی عنایت سے ان دونوں کی حفاظت اور نگہبانی فرما رہا تھا، یہاں تک کہ قریش کا ایک (کھوج

لگانے والا) گروہ اسی غار ثور کے دھانے پر آکھڑا ہوا، لیکن وہ آپ ﷺ اور آپ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نہ دیکھ سکے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خود کہتے ہیں: ”میں نے اللہ کے نبی ﷺ سے کہا (اس وقت کہ جب ہم غار میں تھے) کہ ان (کفار) میں سے کوئی ایک اگر اپنے پاؤں کی طرف (یعنی نیچے) دیکھ لے، تو وہ ہم کو دیکھ لے گا، تو آپ ﷺ نے (کمال اطمینان اور سکون سے) فرمایا: «لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ يَا نَبِيَّ اللَّهِ ثَالِثَهُمَا» ”کہ اے ابوبکرؓ غم نہ کر، یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، تیرا ان دو شخصوں کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جن کا تیسرا اللہ ہے؟“، (۶۱)..... یہاں تک کہ جب ان دونوں ہستیوں کے بارے میں تلاش اور جستجو میں کچھ کمی ہوئی، تو یہ تین راتوں کے بعد غار سے نکلے، اور (اوپر سے لبا چکر کاٹ کر) سمندر کے ساحلی راستے کو اختیار کرتے ہوئے مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہوئے۔“

☆ اور اہل مدینہ کے مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم) نے جب سے یہ سنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہاں تشریف لانے کے لئے مکہ سے نکل چکے ہیں، تب سے وہ روزانہ صبح کے وقت آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے ورود مسعود کا حرمہ مقام تک آکر انتظار کرتے اور دھوپ کے شدت اختیار کرتے پر وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، پھر وہ (سہانا) دن بھی آگیا جس میں ماہتاب رسالت رسول اللہ ﷺ نے (اپنے ساتھیوں سمیت) مدینہ منورہ میں اجلال نزل فرمایا۔ حسب معمول دن کا خاصا حصہ آگے بڑھ گیا تھا اور گرمی میں تیزی آچکی تھی، مدینہ کے باسی طویل انتظار کے بعد (ماپوس ہو کر) آج بھی اپنے گھروں کی طرف پلٹ چکے تھے، کہ اچانک اہل یہود میں سے ایک آدمی مدینہ کے اونچے قلعوں (یعنی ٹیلوں) میں سے کسی ٹیلے پر اپنی ضرورت کی کوئی چیز دیکھنے کو چڑھا، تو اس کی نگاہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر پڑی، جو ریت کے سراب کو بھسم کرتے ہوئے مدینہ کی جانب آرہے تھے، تو اس آدمی سے نہ رہا گیا،



یہاں تک کہ اس نے بلند آواز سے پکارا: کہ عرب کی جماعت! یہ رہا تمہارا نصیبہ اور تمہاری عزت و شرف (کا نشان اعلیٰ) جس کے تم عرصہ سے منتظر تھے مسلمانوں نے یہ اعلان سنتے ہی (خوشی اور مسرت کے جذبات میں لبریز) رسول اللہ ﷺ کے استقبال کے لئے اور آپ ﷺ کی اس دن تعظیم و تکریم اور آپ ﷺ کی قوت و جلالت کے اظہار کے لئے، نیز آپ ﷺ کی ذات اور دین اسلام کے مخالفین، اور دشمنوں سے آپ کے دفاع اور حفاظت کے کئے گئے عہد کی تجدید کی غرض سے اپنے اوپر ہتھیار بھی سجالئے، اور حرۃ مقام پر جا کر آپ ﷺ (اور آپ کے دوسروں ساتھیوں سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ آپ ﷺ) اہل مدینہ کے مہاجرین و انصار کے جلو میں اپنی دائیں سمت چلے اور قباء مقام پر قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں قیام فرمایا۔ آپ وہاں ایک ہفتہ، عشرہ یا اس سے کم مدت ٹھہرے اور اسلام کی پہلی مسجد (مسجد قباء) کی بنیاد رکھی، بعد ازاں آپ ﷺ نے مدینہ کی جانب کوچ فرمایا اور لوگ اس وقت بھی آپ کے ساتھ تھے اور دیگر اہل مدینہ مختلف راستوں میں آپ ﷺ کی رفاقت کی سعادت پانے لگے۔“

☆ حضرت ابو بکر صدیقؓ خود فرماتے ہیں: جب ہم نے مدینہ میں قدم رکھا تو لوگ استقبال کے لئے مختلف راستوں اور گھروں کی چھتوں پر سے اُمد پڑے جبکہ مدینہ کے بچے اور خدام بلند آواز سے یہ کہہ رہے تھے:

”اللَّهُ أَكْبَرُ جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ، اللَّهُ أَكْبَرُ جَاءَ مُحَمَّدٌ ﷺ“

”اللہ بہت بڑا ہے، رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، اللہ بہت بڑا ہے، محمد ﷺ

تشریف لے آئے۔“

وَالْهَجْرَةُ: الْإِنْتِقَالُ مِنْ بَلَدِ الشِّرْكِ إِلَى بَلَدِ الْإِسْلَامِ ① وَالْهَجْرَةُ قَرِيبَةٌ عَلَى هَذِهِ الْأَمَّةِ مِنْ بَلَدِ الشِّرْكِ إِلَى بَلَدِ الْإِسْلَامِ ② وَهِيَ بَاقِيَةٌ إِلَى أَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَاهُمُ الْمَلَائِكَةُ خَالِبِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةً

فَتَهَاجَرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَا وَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَٰئِكَ عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفْوًا غَفُورًا ﴿۹۹﴾

”اور دارِ شرک سے دارِ اسلام کی طرف منتقل ہو جانے کا نام ہجرت ہے اور یہ شرکیہ علاقے یا شہر سے اسلامی علاقے یا شہر کی طرف ہجرت اور نقل مکانی کرنا اس اُمتِ محمدیہ (ﷺ) پر فرض ہے اور یہ فریضہ قیامت تک باقی رہے گا اس بات کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ”جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں، تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے، انہوں نے جواب دیا کہ زمین میں کمزور اور مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا اللہ (تعالیٰ) کی زمین وسیع نہ تھی، کہ تم اس میں ہجرت کرتے، یہ وہ لوگ ہیں، جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے، ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔“ (النساء: ۹۷-۹۹)

■ ﴿۹۹﴾ الہِجْرَةُ لغت میں الہِجْر سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب ’چھوڑ دینا‘ ہے، اور شریعت کی اصطلاح میں الہِجْرَة سے مراد جیسا کہ اس کی تعریف شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے کی ہے: ”الْاِتِّقَالُ مِنَ بَلَدِ الشِّرْكِ إِلَى بَلَدِ الْإِسْلَامِ“ ”بلد (شہر یا علاقہ) شرک سے بلدِ اسلام کی طرف منتقل ہونا۔“

اور بلدِ شرک وہ مقام ہے، جہاں کفر کے شعائر کھڑے کئے جائیں اور اسلام کے شعائر جیسے اذان، باجماعت، نماز، منجگانہ، عیدین کا انعقاد اور نماز جمعہ وغیرہ کا عام اور ہر جگہ اہتمام نہ کیا جائے اور ہم نے یہاں عام جو کہ ہر جگہ کو شامل ہے، کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی ہے، تاکہ اس کی قید سے وہ مقامات اور غیر مسلم ممالک نکل جائیں، جہاں مسلم اقلیت کی بناء پر اسلامی شعائر کا اہتمام تو کیا جاتا ہے مگر بہت ہی محدود دائرے میں رہ کر ان کی اجازت دی جاتی ہے، تو ایسے علاقے اور ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور بعض مخصوص جگہوں پر ہی محدود دائرے میں رہتے ہوئے ان اسلامی شعائر کا انعقاد کر سکتے ہوں، تو وہ اسلامی شہر یا اسلامی ممالک

نہیں ہیں، دیارِ اسلام وہی ہو سکتے ہیں، جہاں مکمل مذہبی آزادی ہو اور وہاں اسلامی شعائر عمومی طور پر اور ہر جگہ منعقد ہوتے ہوں۔

﴿ ۱۵ ﴾ یعنی یہ ہجرت ہر اس مومن پر واجب ہے، جو بلدِ کفر (دارالکفر) میں ہو اور اپنے دین اور اس کے شعائر کے اظہار کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو اگر وہ بغیر ہجرت کے اپنے دین کے اظہار کی طاقت نہ رکھے، تو اس کا ہجرت کے بغیر اسلام ہی مکمل نہ ہوگا، کیونکہ جس ’عمل‘ کو کئے بغیر، واجب (فرض) ادا نہ ہوتا ہو تو اس ’عمل‘ کو بجالانا واجب (یعنی فرض) ہو جاتا ہے۔

﴿ ۱۶ ﴾ قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيهِمْ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعِفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُسْتَضْعِفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُورًا ۝﴾

میں اس بات کی دلیل موجود ہے ”کہ وہ لوگ، جنہوں نے ہجرت کی قدرت و طاقت ہوتے ہوئے بھی ہجرت نہ کی تو موت کے فرشتوں نے ان کی روحمیں قبض کرتے ہوئے ان کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کی اور ان سے کہا کہ کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی، کہ تم اس میں کہیں ہجرت کر جاتے؟ مگر وہ کمزور اور بے بس لوگ، جو ہجرت کی طاقت نہیں رکھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے، ان کی ہجرت سے عاجزی اور بے بسی کی بناء پر ان سے درگزر فرمادی، اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ (رحیم و کریم) کسی بھی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا مکلف (یعنی پابند) نہیں کرتے۔“ (النساء: ۹۷-۹۹)

وَقَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿يُعَذِّبُ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا أَرْضِي وَاسِعَةً فَلَيَأَي قَاعُ عِبَادُونَ﴾ (العنکبوت: ۲۵) قَالَ الْبَغَوِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى: سَبَبُ نَزُولِ هَذِهِ الْآيَةِ فِي الْمُسْلِمِينَ الَّذِينَ بِمَكَّةَ لَمْ يُهَاجِرُوا، نَادَاهُمُ اللَّهُ بِاسْمِ الْإِيمَانِ ۝ وَالذَّلِيلُ عَلَى الْهَجْرَةِ مِنَ السُّنَّةِ قَوْلُهُ ﷺ: ﴿لَا تَنْقُطُ الْهَجْرَةُ حَتَّى تَنْقُطَ التَّوْبَةُ،

وَلَا تَنْقُطُ التَّوْبَةُ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا ﴿۱۵۸﴾

”اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ”اے میرے وہ بندو، جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی کرو۔“ امام بغویؒ، اس آیت کی شان نزول کے بارے میں کہتے ہیں: ”یہ آیت کریمہ ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے اور انہوں نے ہجرت نہ کی تھی اللہ جل مجدہ نے انہیں ایمان کے نام سے پکارا ہے۔ اور سنت مطہرہ سے ہجرت کی دلیل رسالت مآب ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”جب تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا تب تک ہجرت کا سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوگا اور توبہ کا دروازہ اس وقت تک بند نہ ہوگا، جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوتا (یعنی جب تک قیامت قائم نہیں ہوتی)“

﴿۱۵۸﴾ اس عبارت کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ نے اسے امام بغویؒ سے معنوی اعتبار سے اخذ کیا ہے اور اس کا امام موصوفؒ سے نقل کیا جاتا تب ہی درست ہوگا کہ اگر اسے اس آیت کریمہ کی محض تفسیر کے حوالے سے لیا جائے، وگرنہ امام بغویؒ کی آیت ہذا کی تفسیر کے تحت اس طرح کی اور ان الفاظ میں عبارت مذکور نہیں۔

﴿۱۵۹﴾ اور قرب قیامت، آفتاب مشرق کے بجائے، مغرب سے طلوع ہوگا اور یہی وہ گھڑی ہے، جب انسان کے نئے نیک اعمال اور توبہ کی قبولیت کا وقت ختم ہو جائے گا، اللہ جل شانہ اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا﴾ (الانعام: ۱۵۸)

”جس دن آپ کے پروردگار کی کوئی نشانی آگئی، تو اس وقت کسی کا ایمان لانا اسے کچھ فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پیشتر ابھی تک ایمان نہ لایا ہو، یا اپنے ایمان کی حالت میں نیکی کے کام نہ کئے ہوں۔“

اس آیت میں ﴿بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ﴾ سے مراد سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔

## تِمَمہ

[ہجرت کے حوالے سے ہم یہاں کفر و شرک والے علاقوں

اور ممالک کی طرف سفر کرنے کا حکم ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں]

تو ہم اس بارے میں یہ کہیں گے کہ کفار و مشرکین کے ممالک کی طرف سفر کرنا تین شرائط کے بغیر شرعاً جائز نہیں:

۱۔ پہلی شرط: کہ انسان کے پاس اتنا ٹھوس اور پختہ علم ہو، جس کے ذریعے وہ شکوک و شبہات کو دور کر سکے اور اپنے آپ کو بچا سکے۔

۲۔ دوسری شرط: وہ دینی اعتبار سے اتنا پختہ اور ثابت قدم ہو کہ شہوات اور حیوانی خواہشات میں پڑنے سے وہ بچ سکے۔

۳۔ تیسری شرط: کہ وہ ان ممالک کی طرف سفر کرنے کا محتاج اور ضرورت مند ہو۔

اگر یہ مذکورہ شروط پوری نہ ہوں، تو ایک مسلمان کے لئے کفار و مشرکین کے ممالک کی جانب سفر کرنا اس لئے جائز نہیں، کہ ایک تو اس کے فتنے میں واقع ہو جانے کا ڈر ہے اور دوسرے، سراسر نافرمانی کے اس سفر میں بہت سا مال بھی خرچ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ انسان ان جیسے سفروں میں بہت زیادہ مال و دولت بلا ضرورت خرچ کر بیٹھتا ہے۔

☆ اور اگر انسان کو کسی انتہائی اشد ضرورت کی بناء پر سفر کرنا پڑ جائے، جیسے علاج یا آپریشن کی غرض سے یا ایسے جدید منفعت بخش علوم کے حصول کے لئے، جو اس کے اپنے ملک میں ناپید ہوں، اور پھر اس کے پاس اس حد تک علم اور دینی و روحانی قوت بھی ہو، جیسا کہ ہم نے قبل ازیں بیان کیا ہے، تو ایسی صورت میں سفر کی ممانعت نہیں۔

لیکن اگر یہی سفر کفار و مشرکین کے ممالک کی محض سیر و سیاحت کے لئے ہو، کسی اور ضرورت و مصلحت کی بناء پر نہیں اور پھر اسی سیر و تفریح کی غرض سے کسی اسلامی ملک میں سفر

کرنا اس کے بس میں ہو، جہاں شعائر اسلام کی پاسداری کرنے والے کثرت سے ہوں، تو ایسے میں کافر ملک کی طرف جانا قطعاً جائز نہیں، جبکہ آج کے دور میں ہمارے مسلمانوں کے شہر (الحمد للہ) اور کئی ایک ممالک سیر و سیاحت کے اعتبار سے بہت ہی موزوں اور مناسب ہیں، لہذا ایک مسلمان کے لئے یہ بہت مناسب اور آسان ہے کہ وہ کچھ وقت کے لئے ایسے ممالک اور جگہوں کا رخ کرے، جہاں وہ ایام تعطیلات گزار کر اپنا جی بہلا سکے۔

اور جہاں تک ایک مسلمان کے لئے کفر و شرک کے ممالک میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا تعلق ہے، تو اس کے، مسلمان کے دین پر، اس کے آداب و اخلاق پر اور کردار پر بڑے خوفناک اور تباہ کن نتائج مرتب ہوتے ہیں، ہم نے خود اور ہمارے علاوہ دیگر لوگوں نے بہت سے اشخاص کو وہاں رہتے ہوئے، دین سے منحرف ہو کر، یافس و فجور میں لت پت اور یا پھر (العیاذ باللہ) اپنے دین سے مرتد ہو کر واپس لوٹتے دیکھا ہے، اور ان کی دین و مذہب سے نفرت کا یہ عالم ہوا کہ وہ اپنے دین سے ہاتھ دھونے کے ساتھ ساتھ بقیہ تمام ادیان و مذاہب کے نہ صرف منکر ہوئے، بلکہ اس دین سے وابستہ ہونے والی پاکیزہ ہستیاں (السَّابِقُونَ الْاَوَّلُونَ) اور متاخرین میں سے جو اسلام لائے، سب کے سب ان لمحوں اور مرتدوں کے استہزاء اور مذاق کا نشانہ بنے (اور اب بھی یہ صورت حال جاری ہے۔ العیاذ باللہ)..... اسی لئے، یہ بات از حد ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کے اخلاقی تحفظ اور دینی و ایمانی تشخص کی بقاء کے لئے ٹھوس اور مضبوط اقدامات ہونے چاہئیں اور قانونی اعتبار سے بھی ایسی شروط وضع کی جائیں، جو مسلمانوں کو ان ہلاکت خیزیوں اور تباہ کاریوں سے روک سکیں۔

### بلاد کفر و شرک میں اقامت (ٹھہرنے) کی دو بنیادی اور ضروری شرطیں

﴿ پہلی شرط: سکونت اختیار کرنے والے شخص کا دین و ایمان محفوظ و مانوں ہو، اس اعتبار سے کہ اس کے پاس اتنا مضبوط علم و ایمان اور عزیمت کی قوت و طاقت موجود ہو، جس کی بناء پر وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہ سکے اور انحراف و گمراہی سے بھی بچ سکے، اور ساتھ ہی

ساتھ اہل کفر کی محبت اور ان سے تعلقات سے دور رہتے ہوئے، ان سے نفرت اور عداوت کو اپنے دل میں سمائے رکھے، اس لئے کہ کفار و مشرکین سے محبت و عقیدت رکھنا اور ان سے تعلقات استوار رکھنا، ایمان کے منافی امور میں سے ہے۔

اللہ عز و جل ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ (البقرہ: ۲۳) ”تو جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں، آپ کبھی انہیں ایسا نہ پائیں گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی لگائیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا بیٹے ہوں، یا بھائی یا (سارے) کنبہ (قبیلہ) والے ہوں۔“

اور سورۃ المائدہ میں حق تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾، فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسْرِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسْرَوْا فِي أَنْفُسِهِمْ لَذِئِبِينَ﴾ (آیت: ۵۱، ۵۲)

”اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں، اگر تم میں سے کسی نے ان کو دوست بنایا، تو وہ بھی انہی میں سے ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ آپ دیکھیں گے کہ جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، وہ انہی (یہود و نصاریٰ) میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں، کہتے ہیں: کہ ہم ڈرتے ہیں کہ کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں، ہو سکتا ہے کہ جلد ہی اللہ (مومنوں کو) فتح عطا فرما دے، یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کر دے، تو جو کچھ یہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں، ان پر نادم ہو کر رہ جائیں گے۔“

اور صحیح حدیث میں نبی مکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«أَنَّ مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ، وَأَنَّ الْمَرْءَ مَعَ مَنْ أَحَبَّ» (۱۳)

”کہ جس شخص نے کسی قوم سے محبت کی تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا، اور بے شک آدمی اسی کے ساتھ (ہوگا) جس کے ساتھ اس نے محبت کی ہوگی۔“

اور اللہ کے دشمنوں سے محبت، ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑی خطرے کی چیز ہے، اس لئے کہ ان کی محبت اصل میں ان کی موافقت اور ان کی پیروی کو مستلزم ہے، (یعنی اسے لازم قرار دیتی ہے) یا پھر کم از کم ان کی (دین کے خلاف ہر) بات کو رد کرنے سے بھی روکتی ہے، اسی لئے اللہ کے نبی ﷺ نے یہ فرمایا ہے: «مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ»

”کہ جو شخص کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو وہ انہی میں سے شمار کیا جاتا ہے۔“

**دوسری شرط:** کہ سکونت پذیر شخص کے لئے وہاں (دار الکفر والشرك) میں اپنے دین و ایمان کا کھلے عام اظہار ممکن ہو، اس طرح سے کہ وہ بغیر کسی ممانعت کے دین کے شعائر کا اہتمام اور اس پر عمل پیرا ہونے کا ہر طرح سے مجاز ہو، مثلاً: فرض نماز کو باجماعت اور جمعۃ المبارک کی نماز کو ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اگر وہاں اس کے ساتھ اور لوگ ہوں جو اس کے ساتھ ان نمازوں اور جمعۃ المبارک کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہتے ہوں۔ اسی طرح اسے دیگر شعائر دین (اور ارکان دین) یعنی زکوٰۃ، روزے اور حج وغیرہ کی ادائیگی کی ممانعت نہ ہو، اگر ایسا ممکن نہیں تو ان حالات میں اس پر ہجرت واجب ہونے کی وجہ سے اس کا کفار و مشرکین کے ملک میں ٹھہرنا بھی جائز نہیں۔

صاحب المغنی نے اپنی کتاب کے ج ۸، ص ۴۵۷، پر، ہجرت کے ضمن میں، لوگوں کی مختلف اقسام ذکر کرتے ہوئے کہا: کہ ان میں سے لوگوں کی ایک تو وہ قسم ہے، جن پر ہجرت واجب ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو ہجرت کی طاقت تو رکھتے ہوں مگر بلاد کفار میں اپنے دین کا اظہار ان کے لئے ناممکن ہو، اور وہ کفار کے درمیان رہتے ہوئے اپنے دین کے واجبات پر بھی عمل پیرا نہ ہو سکتے ہوں، تو ایسے لوگوں پر اللہ عز و جل کے اس فرمان کی بناء پر ہجرت کرنا فرض ہو جاتی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعِفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ



مَا وَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿۹۷﴾ (النساء: ۹۷)

”جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے، جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے آتے ہیں، تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔“ تو فرشتے انہیں جواب میں کہتے ہیں: ”کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت بڑی بازگشت ہے۔“

آیت ہذا میں یہ شدید ترین وعید، ہجرت کے وجوب (فرض) پر دلالت کرتی ہے، اور اس لئے بھی کہ دین کے واجبات پر عمل ہر اس شخص پر واجب ہے، جو اس کی طاقت رکھتا ہو، اور دین اسلام میں ہجرت تو ”واجب کی ضرورت“ اور اس کے تتمہ (تحکیل) میں سے ہے، اور جس عمل کو ادا کئے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو، تو اس عمل کو بجالانا بھی واجب ہوتا ہے۔

☆..... اور ان مذکورہ دو بنیادی شرطوں کے بیان کے بعد دار کفر و شرک میں سکونت کئی ایک صورتوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور وہ اقسام درج ذیل ہیں:

**پہلی قسم:** کہ آدمی دار کفر میں لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے اور اس میں رغبت دلانے کے لئے رہائش اختیار کرے اور اس کی یہ کاوش، جہاد کی ایک قسم ہے اور جو اس پر قدرت رکھے، اس کے لئے یہ فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے اس بشرط کے ساتھ کہ اس کی وہاں یہ دعوت ایک تو بار آور ثابت ہو اور دوسرے یہ کہ نہ کوئی اس کو یہ دعوت دینے سے منع کرتا ہو، اور نہ اس دعوت کو بلیک کہنے (یعنی قبول کرنے) والے کی راہ میں کوئی روک لگاتا ہو، اس لئے کہ اسلام کی طرف دعوت دینا، دین کے واجبات میں سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں (علیہم السلام) کا طریقہ اور وظیفہ ہے، اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ نے بھی اپنی امت کے ہر فرد کو اور ہر جگہ پر اپنی شریعت طاہرہ کے احکامات و پیغامات پہنچانے کا حکم فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً“ (۱۳)..... ”مجھ سے لی ہوئی خواہ ایک ہی آیت (اور حدیث) ہو تو اس کو (آگے میری امت تک) پہنچا دو۔“

**دوسری قسم:** کہ وہ بلاد کفر و شرک میں رہتے ہوئے کافروں اور دشمنان دین کے احوال

کی بابت آگاہی رکھے، نیز ان کے عقائد کی خرابیوں، طریقہ عبادت کے بطلان، اخلاقی انحطاط اور ان کے کردار و گفتار کے بگاڑ پر کڑی نگاہ رکھتا ہو، تاکہ عام لوگوں کو (خاص طور پر جاہل مسلمانوں کو) ان کے دام فریب میں آنے سے ڈرا اور بچا سکے، اور ان کفار کی طرف رشک آلود نگاہوں سے دیکھنے والوں پر ان کی حقیقت آشکارا کر سکے، تو بلاؤ کفر میں ایسی اقامت (سکونت) جہاد ہی کی ایک قسم ہے اور یہ اس لئے کہ یہ دعوت اپنے نتائج و ثمرات کے اعتبار سے اہل اسلام کو، کفر اور اہل کفر سے بچانے اور عامۃ الناس کو اسلام کی طرف ہدایت پر مشتمل ہے، کیونکہ کفر کا بگاڑ و فساد اسلام کی اصلاح و فلاح کی دلیل ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ”وَبِضْطِهَا تَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ“ کہ اشیاء کی حقیقت، اپنی مخالف اشیاء سے نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔“

☆..... مگر یہاں اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے کہ داعی کی یہ دعوت، جس مقصد کے لئے ہو، وہ مقصد اپنے سے بڑھ کر کسی فساد کے رونما ہوئے بغیر برگ و بار لائے اور اگر اس داعی کو اس دعوت کا کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہ ہو سکے اور وہ اس طرح کہ وہاں کے کفار و مشرکین اس کو اپنے باطل عقائد اور بگاڑ کی اشاعت (اور ان کے رد) سے روک دیں تو تب اس شخص کے وہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں، اسی طرح اگر اس (داعی) کو اس دعوت کے مثبت نتائج تو مل رہے ہیں، مگر ساتھ ہی وہ دعوت اپنے فوائد اور مصالح سے بڑھ کر مفسد و مضرات کے سر اٹھانے کا سبب بن رہی ہے مثلاً: اس کی دعوت کے رد عمل میں مخالفین، اسلام، اہل اسلام، رسول اسلام اور دیگر ائمہ اسلام کو سب و شتم (گالی گلوچ) کا نشانہ بنانے لگے ہوں، تو ایسے حالات میں اس کا دعوت سے رُک جانا واجب ہے اور اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

”(اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالی نہ دو، ورنہ یہ لوگ

جہالت کی وجہ سے چڑ کر اللہ کو گالی دیں گے، اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، تو جو کچھ یہ کرتے رہے، اس کی انہیں وہ خبر دے دے گا۔“ (الانعام: ۱۰۸)

اور اسی کے مشابہ یہ بھی ہے کہ کوئی مسلمان شخص، کافروں کے کسی ملک میں محض اس غرض سے ٹھہرے کہ وہاں رہ کر وہ مسلمانوں کے حق میں کفار اور مسلمانوں کے دشمنوں کی جاسوسی کے فرائض انجام دے سکے اور ان کی تیار کردہ خفیہ سازشوں اور دیسہ کاریوں سے اہل اسلام کو متنبہ کر سکے، جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے غزوہ خندق میں، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو مشرکوں کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہ ان کی (جنگی چالوں اور) سرگرمیوں کی خبریں معلوم کر سکیں۔ (۶۵)

❖ تیسری قسم: کہ وہ شخص ’مسلمان ملک‘ یا اسلامی ریاست کی ضرورت یا اس کے کافر ملکوں کے ساتھ انتظامی امور کو منظم اور مربوط کرنے کی خاطر مقیم ہو، جیسے سفارتخانوں کے ملازمین یا عملہ ہے، تو ان کا حکم بھی اس شخص کے حکم جیسا ہے، جو اسلامی ملک کی مصلحت اور فائدے کے لئے کافر ملک میں ٹھہرا ہو، اسی طرح مثال کے طور پر ’اسلامی ثقافت‘ کا ترجمان اور ماہر ذمہ دار وہاں رہتے ہوئے، مسلمان طلباء کے حالات اور ان کی دن رات کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہوئے، اُن کی اخلاقی اقدار و روایات کی نگرانی کرتے ہوئے اور ہمہ وقت ان کو دین اسلام کی پاسداری کرنے اور دین کے اخلاق و آداب کو اپنائے رکھنے اور ہمہ وقت اور ہمہ جا اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ تو ایسے شخص کے وہاں رہنے سے ایک بڑی مصلحت اور منفعت کا حصول ممکن ہے اور ساتھ ہی ایک بڑے شر اور فساد کا خاتمہ بھی۔

❖ چوتھی قسم: کہ آدمی کسی خاص اور جائز ضرورت کی بناء پر وہاں ٹھہر جائے، جیسے تجارت (کاروبار) یا علاج وغیرہ ہے، تو ایسے حالات میں ضرورت پوری ہونے تک وہاں ٹھہرنا جائز ہے اور اہل علم حضرات (رحمہم اللہ!) نے کاروباری مقاصد کی غرض سے کافر ملک میں ٹھہرنے یا

اس کی طرف سفر کرنے پر مہر تصدیق ثبت کی ہے اور انہوں نے اس کی دلیل بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار و واقعات سے لی ہے۔

۱۱ پانچویں قسم: کہ آدمی کسی کافر ملک میں تحصیل علم اور کسی علمی شعبہ میں تحقیق و تدریس کے لئے ٹھہرے اور یہ صورت سابقہ ضرورت کی ہی ایک قسم ہے، کہ جہاں انسان کسی ضرورت کے پیش نظر مقیم ہو، لیکن یہ اس کی نسبت زیادہ خطرناک، اور ایک سکونت پذیر مسلمان شخص کے دینی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے اعتبار سے زیادہ سخت بھی ہے۔ (والعیاذ باللہ) تو بلاشبہ ایک طالب علم اپنے استادوں کے مرتبے کو جانتا اور ان کی شخصیت کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اور استادوں کی اپنے شاگرد کے ہاں قدر و منزلت براہ راست اس کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوتی اور پھر اس شاگرد کو ان کے افکار و آراء اور آداب سلوک کو اپنانے پر اکساتی اور انجنت دلاتی ہے اور اس میدان میں اکثر لوگ اپنے استادوں کی ہی سیرت و کردار کے اسیر ہوتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے، جن کو اللہ تعالیٰ بچائے رکھتا ہے اور وہ بہت ہی کم تعداد میں ہیں۔

پھر طالب علم اپنے استاد کے ہاں اپنی ضرورت سے بھی بخوبی آگاہ ہوتا ہے اور یہی ضرورت اس کے دل کو استاد کی محبت کی طرف مائل کرتی اور جس دینی انحراف اور گمراہی پر وہ گامزن ہوتا ہے، اس کے بارے میں شاگرد میں مدہمت کا سبب بنتی ہے اور پھر طالب علم جس تعلیمی ادارے میں مقیم ہوتا ہے، وہاں اس کے ساتھی اور دوست ہوتے ہیں، جن سے وہ محبت کرتا، ان سے لین دین رکھتا اور دیگر ضروریات پوری کرتا ہے، ان سب امور کے ہوتے ہوئے ایک نوخیز طالب علم کے اخلاق و کردار کے بگاڑ کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے، لہذا اس قسم کے لوگوں کے بارے میں حفاظی اقدامات دوسروں کی نسبت زیادہ ضروری ہیں۔ لہذا ”دیار کفر“ میں ان کے دین و ایمان اور اخلاق و کردار کے تحفظ کی خاطر ان دو بنیادی شرطوں (جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) کے علاوہ درج ذیل اضافی شروط کو اپنانا لازم ہوگا:

۱۲ پہلی شرط: کہ طالب علم عقل کی پختگی اور سوچ و بچار میں اتنی اونچے درجے کی

صلاحیت رکھتا ہو، کہ وہ آسانی سے منفعت بخش اور نقصان دہ چیز میں فرق کر سکتا ہو اور کسی بھی چیز کے نفع و نقصان کے بارے میں وہ 'مستقبل بعید' میں بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ اور جہاں تک چھوٹی عقل اور نا سنجھی کی عمر کے بچوں کو طلب علم اور پڑھائی کے لئے ایسی جگہوں میں بھیجنے کا تعلق ہے، تو یہ ان کے دین اور ان کے اخلاق و کردار کی بربادی کے لئے بہت بڑا اور سنگین خطرہ ہے، پھر یہ نونہال اپنی قوم و ملت کے لئے بھی بہت بڑے خطرے کا باعث ہوں گے، جن کی طرف انہوں نے پلٹ کر آنا ہے اور وہاں آ کر وہ ان کے دل و دماغ میں وہ زہر اتاریں گے، جو انہوں نے (دار کفر میں رہتے ہوئے) کفار سے بیاتھا، جیسا کہ اس قسم کے واقعات ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں اور ناقابل تردید حقائق بھی ایسے واقعات پر شاہد ہیں، کہ بہت سے ایسے لوگ جو تعلیم و تعلم کے لئے "دیار کفر و شرک" میں بھیجے گئے، اور وہاں ایسی پروہ کمزور ایمان کی پونجی سے بھی محروم تھے، وہ اپنے دینی شخص اور اچھے اخلاق و کردار سے بیگانہ اپنے ساتھ کفر و الحاد کو ساتھ لے کر آئے، اور خود اپنے لئے اور اپنی قوم و ملت کے لئے بھی فساد و بگاڑ کا سبب بنے۔ (والعیاذ باللہ من ذلک) اور یہاں یہ بات ہم (بیانگ دہل کہیں گے) کہ ان جیسے حالات میں کم عمر اور مذکورہ شرائط سے تہی دامن لوگوں کو دیار کفر بھیجنا، بھیڑ بکریوں کو، چیر پھاڑ کرنے والے لکڑوں کے آگے پھینک دینے کے مترادف ہے۔

**دوسری شرط:** کہ 'دیار کفر' میں مقیم طالب علم کے پاس اس حد تک شرعی علم ہو، جس کی وساطت سے وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکتا ہو، اور حق کی ضرب سے باطل کا قلع قمع کر سکتا ہو، تاکہ باطل کی جس روش پر اہل کفر جتے ہوئے ہیں، کہیں وہ ان سے متاثر ہو کر دھوکہ نہ کھا جائے، یا ان کے جھوٹ کو، سچ نہ سمجھ بیٹھے۔ یا حق اور باطل اس پر خلط ملط نہ ہو جائیں یا اس (باطل) سے بچنے سے وہ عاجز نہ آجائے اور پھر وہ حیران و ششدر باطل کی پیروی میں نہ لگ جائے..... اور دعائے مسنون میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

«اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنِي اتِّبَاعَهُ وَارْزُقْنِي الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنِي

اجْتَنَابُهُ، وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبَسًا عَلَيَّ فَأُضِلَّ»

”الہی! مجھے راہ حق دکھا دے اور (پھر) مجھے اس کی پیروی کی توفیق دے اور مجھے باطل رستے دکھا دے اور اس سے بچنے کی توفیق مرحمت فرما دے، اور اس (حق و باطل کی) راہ کو مجھ پر غلط ملط نہ کر، کہ میں راہ حق سے بھٹک کر گمراہ ہو جاؤں!“

**تیسری شرط:** کہ کفر و شرک کے ممالک میں سکونت پذیر طالب علم کے پاس اتنی دینی حمیت و جذبہ اور ایمانی غیرت ہو، جو اسے بے راہ روی سے بچا سکے اور کفر و فسق کی لعنتوں سے اسے محفوظ رکھ سکے، کیونکہ دینی اعتبار سے کمزور نوجوان، وہاں اقامت کے دوران کفر و فسق کے فتنہ و فساد سے محفوظ و مامون نہیں رہ سکتا، سوائے اس کے، جسے اللہ تعالیٰ بچائے رکھے، اور یہ اس معاشرے میں کفر و شرک کے طاقتور ہونے اور اس کے رد عمل میں دینی قوتوں کے انتہائی کمزور ہونے کی وجہ سے ہے، اور جب یہ الحادی اور طاغوتی قوتیں کسی بھی جگہ اپنی مخالف قوتوں کو کمزور اور ناتواں پاتی ہیں، فوراً اپنی تحریمی کارروائی کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

(وَالْعِمَاذُ بِاللّٰهِ)

**چوتھی شرط:** کہ طالب علم، اُس علم کی انتہائی زیادہ احتیاج رکھتا ہو، جس کے حصول کے لئے وہ وہاں ٹھہرا ہے اور یہ اس اعتبار سے کہ اس علم کے پانے میں عام مسلمانوں کی مصلحت کا رفرما ہو، اور پھر اس جیسی تعلیم، اس کے اپنے ملک کے کسی مدرسہ یا تعلیمی ادارے میں نہ پائی جاتی ہو، اور نہ اس قسم کا کوئی ادارہ ہی موجود ہو، لیکن اگر وہ کوئی ایسا بیکار اور بے فائدہ علم ہے، جس میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ بھی نہ ہو، یا اس جیسا تعلیمی ادارہ اس کے اپنے ملک یا کسی دوسرے اسلامی ملک میں موجود ہو، جہاں سے وہ تعلیم پانا اس کے لئے ممکن ہو، تو اس صورت میں اس کے لئے کفار و مشرکین کے درمیان رہ کر، اُن کے ملک میں تعلیم حاصل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ ایک تو اس کا ایسی جگہ پر ٹھہرنا اس کے دین اور اخلاقی اقدار کے لئے انتہائی خطرناک ہے اور دوسرا یہ کہ ایک بے فائدہ (بلکہ نقصان دہ) چیز کی طلب میں بہت زیادہ رقم خرچ ہوگی۔

**چھٹی قسم:** کہ کوئی شخص باقاعدہ کفار و مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کر لے (یا کوئی طالب علم، کفار و مشرکین کے ساتھ تعلیمی ادارے میں سکونت اختیار کرے) تو ایسی اقامت، پہلی ذکر کردہ صورتوں سے، اس لئے زیادہ خطرناک اور بڑی نقصان دہ ہے کہ اہل کفر کے ساتھ مکمل اختلاط سے بڑا فتنہ و فساد جنم لے گا، اور پھر اس شخص کا یہ تصور کہ یہ لوگ یہاں کے مقامی باشندے ہونے کے ساتھ ساتھ تعداد میں بھی زیادہ ہیں، اور ان کے ساتھ لین دین، مؤدت و محبت رکھنا اور ان کے رسم و رواج کو اپنانا، یہاں ان کے وطن میں رہنے کے لئے اُس کی ایک مجبوری ہے، اور ان کے درمیان اقامت کا تقاضا بھی۔ تو انجام کار یہ ہوگا کہ اس کے اہل خانہ کفار کے درمیان پروان چڑھیں گے، جہاں (نہ چاہتے ہوئے بھی) وہ ان کے طرز حیات، اخلاق و عادات اور غیر اسلامی رسومات کو اپنالیں گے، اور بسا اوقات تو دینی معاملات (اور خاص طور پر) عقائد و عبادات میں بھی (ان کی بدعات و خرافات میں) آنکھیں بند کئے پیروی کریں گے۔ (وَالْفِعَاذُ بِاللّٰهِ)

تو اس ضمن میں اللہ کے نبی ﷺ سے مروی حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

«مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَهُوَ مِثْلُهُ» (۶۶)

”جو مشرک کے ساتھ بیٹھا، اور اسکے ساتھ سکونت اختیار کی تو وہ اسی مشرک کی مانند ہے۔“

یہ حدیث اگرچہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن (حقیقت کے بیان میں) اس کی ایک حیثیت اور رائے ہے، ”کہ سکونت میں اختلاط (یعنی بعض قوم کا کسی دوسری قوم کے ساتھ مل جل کر رہنا ان کی) مشابہت اور موافقت کا پیش خیمہ ہے۔“

قیس بن حازم سے روایت ہے، وہ حضرت جریر بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں: کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں، جس نے مشرکوں کے درمیان اقامت اختیار کی، صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین!) نے کہا: اے اللہ کے رسول! کس وجہ سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لا تراءى نارھما» (۶۷) کہ: ”ان (اہل ایمان اور

مشرکین) کو تو ایک دوسرے کی جلائی ہوئی آگ بھی نہیں دکھائی دی جانی چاہئے۔ (یعنی ان کے درمیان کم از کم اتنا فاصلہ ضرور ہونا چاہئے)“

اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے اپنی اپنی ’سنن‘ میں روایت کیا ہے اور اکثر راویوں نے اسے قیس بن حازم رحمہ اللہ (اور قیسؒ نے اللہ کے نبی ﷺ سے) یعنی ’مرسل‘ روایت کیا ہے (مطلب یہ کہ حضرت قیس بن حازمؒ اور اللہ کے نبی ﷺ کے درمیان کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے واسطے کے بغیر یہ حدیث ’مرسل‘ ہوگی)

امام ابو یوسفؒ ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے محمد (یعنی امام بخاریؒ) سے سنا، وہ کہہ رہے تھے: ”کہ صحیح یہ ہے کہ قیس بن حازمؒ کی اللہ کے نبی ﷺ سے یہ حدیث ’مرسل‘ ہے“

اگر معاملہ اس حد تک خطرناک ہو..... تو ایک مومن اس بات کو کیونکر گوارا کر سکتا ہے، کہ وہ ’بلاؤ کفار‘ میں مستقل رہائش اختیار کرے، جہاں کھلے عام کفریہ شعائر کا پرچار ہوتا ہو اور اللہ جل جلالہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے علاوہ، طاغوتی شیطانوں کے احکام و قوانین نافذ ہوں اور وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہو، اپنے کانوں سے سنتا ہو اور اس پر راضی بھی ہو، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اپنے آپ کو انہی کافروں کے ملکوں اور اقوام کی طرف منسوب کرتا ہو، اور وہ، وہاں ’کافر معاشرے‘ میں اپنے اہل و عیال سمیت رہائش پذیر ہو، اور اس طرح مطمئن زندگی بسر کرتا ہو، جیسے وہ کسی مسلم معاشرے اور مسلمان ملک میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہے، اس کے باوجود کہ وہ اپنے اہل و عیال اور خاندان کے اخلاق و کردار اور دینی اقدار پر، اس کافر معاشرے کے بڑے خطرات اور زہریلے اثرات کے ہولناک اور تباہ کن نتائج سے بخوبی آگاہ بھی ہو۔

☆..... یہ ’بلاؤ کفار‘ میں مسلمانوں کی اقامت کے حکم کے بارے میں مختصر سا بیان ہے اور جس حد تک ممکن ہو سکا ہے، ہم نے اسے عامۃ الناس کے فائدے کے لئے رقم کر دیا ہے، اللہ عزوجل کے حضور دعاء ہے کہ وہ اس بیان کردہ حکم کو ’حق کے موافق‘ اور ’حقیقت کے مطابق‘ کرتے ہوئے، تمام مسلمانوں کو مستفید و مستفیض ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے!



فَلَمَّا اسْتَقَرَّ بِالْمَدِينَةِ أَمَرَ بِبَقِيَّةِ شَرَائِعِ الْإِسْلَامِ مِثْلَ: الزَّكَاةِ وَالصَّوْمِ، وَالْحَجِّ وَالْجِهَادِ وَالْأَذَانِ، وَالْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَغَيْرِ ذَلِكَ مِنْ شَرَائِعِ الْإِسْلَامِ ۖ

”جب آپ (ﷺ) نے مدینہ منورہ میں مکمل طور پر اقامت اختیار کر لی، تو آپ (ﷺ) کو دین کے بقیہ احکام و شرائع مثلاً زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، اذان، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا حکم دیا گیا.....“

□ ﴿۲۳﴾ کتاب کے مولف (شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب!) کہتے ہیں: ”جب اللہ کے نبی ﷺ پوری طرح، مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے، تو آپ کو دین اسلام کے بقیہ احکام و شرائع کا حکم دیا گیا، اور امر واقع یہ ہے کہ آپ (ﷺ) نے مکہ مکرمہ میں مسلسل دس برس تک لوگوں کو اللہ کی توحید کی دعوت دی، بعد ازاں آپ (ﷺ) پر مکہ مکرمہ ہی میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں، پھر جب آپ (ﷺ) نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی، تو اس وقت تک آپ (ﷺ) پر زکوٰۃ، روزے، حج اور ان کے علاوہ دیگر اسلام کے احکام و شعائر وغیرہ فرض نہیں ہوئے تھے، اور مولف رحمہ اللہ کے کلام سے تو یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ زکوٰۃ اصلی اور تفصیلی اعتبار سے مدینہ میں ہی فرض کی گئی۔

اور بعض اہل علم (رحمہم اللہ!) کا کہنا ہے: کہ شروع میں زکوٰۃ مکہ میں فرض کی گئی، لیکن وہاں (مکہ میں) اس کے انصاب (حصص اور مصارف وغیرہ) اور ان میں سے ادائیگی کی واجب مقدار مقرر نہیں کی گئی جبکہ مدینہ میں زکوٰۃ تفصیلی اعتبار سے اپنے تمام انصاب کی حدود کے تقرر اور ادائیگی کی واجب شرح سمیت فرض ہوئی..... یہ علماء اپنے اس قول کی موافقت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کو واجب قرار دینے والی آیات کا ذکر کی سورت میں ہوا ہے، جیسے سورۃ الانعام میں اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَاتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ﴾..... ”اور فصل اٹھاتے وقت اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرو۔“ (الانعام: ۱۳۱)

اور سورۃ المعارج میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ، لِلْسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (المعارج: ۲۳، ۲۴) ”اور وہ لوگ کہ جن کے اموال میں سوال کرنے والوں، اور (سوال سے بچنے کی بناء پر) محروم لوگوں کا ایک مقرر حق ہے۔“

علمائے کرام کی آراء و اقوال تو سر آنکھوں پر، بہر حال زکوٰۃ کی فرضیت اس کے انصاب، اس کی ادائیگی کی واجب حد اور اس کے مستحقین، یہ سب تفصیلی احکامات مدینہ منورہ میں نافذ کئے گئے، اور اسی طرح اذان اور جمعہ بھی مدینہ منورہ میں فرض ہوئے اور ظاہر سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نماز باجماعت بھی (مکہ مکرمہ کی بجائے) مدینہ میں فرض ہوئی، اس لئے کہ وہ اذان، جس میں ’نماز باجماعت‘ کی دعوت دی گئی ہے، ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں ہی فرض ہوئی تھی اور جہاں تک زکوٰۃ اور روزوں کا تعلق ہے تو وہ بھی ہجرت کے دوسرے سال فرض کئے گئے اور ’حج‘ اہل علم (رحمہم اللہ) کے اقوال میں سے رائج قول کے مطابق ہجرت کے نوین سال فرض ہوا اور یہ فرضیت اس وقت ہوئی، جب مکہ مکرمہ ہجرت کے آٹھویں سال فتح ہو جانے کے بعد ایک اسلامی شہر تھا۔

اور اسی طرح ’امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘ اور ان کے علاوہ دیگر اسلام کے ظاہری شعائر سب کے سب مدینہ منورہ میں، اللہ کے نبی ﷺ کے پوری طرح قیام پذیر ہو جانے اور وہاں ایک مستقل اور مضبوط بنیادوں پر اسلامی ریاست کے قائم کر لینے کے بعد فرض کئے گئے۔“

أَخَذَ عَلَىٰ هٰذَا عَشْرَ سِنِيْنَ وَبَعْدَهَا تُوُوْفَى صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ وَدِيْنُهُ  
باقی ﴿۱۵﴾ ”اور انہی امور کی تبلیغ پر آپ ﷺ نے دس برس گزار دیئے، تب آپ ﷺ نے وفات پائی، مگر آپ ﷺ کا دین تا قیام قیامت باقی رہے گا۔“

□ ﴿۱۵﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے بعد، دس برس وہاں گزارے، پھر جب اللہ عز و جل نے آپ ﷺ کی ذات گرامی کے

ذریعے اس دین حنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور آپ (ﷺ) کے ذریعے اپنی اس نعمت عظمیٰ کو اہل ایمان پر پورا فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دینے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور صدیقین، شہداء اور امت کے صالحین (نیوکار) پاکیزہ اور بلند و بالا شان و مقام والی ہستیوں کے ساتھ ملانے کے لئے پسند فرمایا، آپ (ﷺ) صَلَوَاتُ اللہِ وَسَلَامُہُ عَلَیْہِ کے مرض وفات کی ابتداء، ماہ صفر کے آخر اور ربیع الاول کے شروع میں ہوئی، تو آپ (ﷺ) حالت مرض میں اپنے سرمبارک کو لپیٹے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس تشریف لائے، منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور تشہد (یعنی اللہ کی تعریف کے ساتھ شہادتین) کے کلمات ادا فرمائے اور اس کے بعد سب سے پہلی گفتگو، جو آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمائی وہ ان شہداء کے لئے استغفار (اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا) تھا جو غزوہ اُحد میں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔

پھر آپ (ﷺ) نے فرمایا: «إِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللہِ خَیْرَہُ اللہُ بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَہُ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللہِ» ”بلاشبہ، اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے، تو اللہ نے اسے دنیا اور جو کچھ اس اللہ کے پاس ہے، کے درمیان (کسی ایک چیز کو پسند کرنے کا) اختیار دے دیا، تو اس بندے نے وہ چیز پسند کر لی، جو اللہ کے پاس ہے۔“ آپ (ﷺ) کے اس کلام کا مفہوم (رمز شناس نبوت) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سمجھ لیا اور آپؓ رو پڑے اور کہا: ”میرے ماں باپ آپؓ پر فدا ہوں! ہم سب آپؓ پر، اپنے آباؤ اجداد، اپنی ماؤں، بیٹوں اور اپنی جانوں اور مالوں تک کو قربان کر دیں گے، تب اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ذرا ٹھہر جائیے حوصلہ رکھئے اے ابوبکر! پھر ارشاد فرمایا: کہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر اپنے مال اور اپنی رفاقت کے اعتبار سے مجھ پر احسان کرنے والا ابوبکر ہے، اگر میں اپنے رب کے علاوہ (اس دنیا میں) کسی کو دوست بنانے والا ہوتا، تو ابوبکر کو اپنا دوست بناتا، لیکن میری اور اس کی دوستی و محبت کی بنیاد، دین اسلام کا رشتہ ہے۔“ (۶۸)

اور آپ (ﷺ) نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حکم فرمایا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، پھر ہجرت کے گیارہویں سال، ربیع الاول کی بارہویں یا تیرہویں تاریخ کو سوموار کا دن تھا کہ اللہ عزوجل نے آپ (ﷺ) کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دی۔ پھر جب آپ (ﷺ) کی ذات اقدس پر نزع کی گھڑی شروع ہوگئی، تو آپ (ﷺ) اپنا دست مبارک اپنے پاس رکھے ہوئے پانی کے برتن میں داخل کرتے اور اپنے چہرہ انور پر پھیر لیتے اور ساتھ ہی یہ الفاظ آپ (ﷺ) کی زبان فیضان ترجمان پر جاری تھے۔ «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ لِلَّهِ لَمَوْتٍ سَكْرَاتٍ» ”کہ اللہ واحد کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں، یقیناً موت کی بڑی سختیاں ہیں۔“ پھر اپنی نگاہوں سے آسمان کی وسعتوں کی جانب ٹٹکی باندھ کر دیکھا اور فرمایا: «اللَّهُمَّ فِي الرَّفِيقِ الْأَعْلَى» (۹۹) کہ ”اے اللہ! اے اعلیٰ شان والے رفیق، اپنی رفاقت عطا فرما!“..... اور اسی دن آپ (ﷺ) نے رحلت فرمائی اور تو لوگ آپ (ﷺ) کی جدائی اور صدمے سے بے قرار و غمگین ہو گئے، اور ان کا ایسا ہونا حق بجانب تھا، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ وہاں آئے، منبر رسول (ﷺ) پر چڑھے، اللہ تعالیٰ کی حمد (تعریف) و ثناء بیان کی، پھر فرمایا:

حمد و ثنائے رب و ذوالجلال کے بعد اے لوگو! ”تم میں جو شخص محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا، (تو وہ سن لے) کہ یقیناً محمد (ﷺ) فوت ہو گئے ہیں اور جو شخص اللہ واحد کی عبادت کرتا تھا، (تو وہ بھی سن لے) کہ بے شک اللہ جل شانہ (حی) ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، اسے کبھی موت لاحق نہیں ہو سکتی، پھر آپؐ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۴۳)

”اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید ہو جائیں، تو کیا تم اٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یعنی اسلام چھوڑ دو گے) اور یہ بھی آیت پڑھی: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ (الزمر: ۳۰) ”(اے نبی!) بلاشبہ آپؐ کو مرنا ہے اور یہ بھی (سب) مرنے والے ہیں۔“

یہ سن کر لوگ زار و قطار رونے لگے، ان کی گریہ زاری بڑھ گئی، جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ اللہ کے نبی (ﷺ) واقعی فوت ہو گئے ہیں، آپ (ﷺ) کو عزت و تکریم کی خاطر آپ کے کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا اور کچے دھاگے سے بنے ہوئے (بن سلع) سفید رنگ کے تین لفافہ نما کپڑوں کا، آپ (ﷺ) کو کفن پہنایا گیا، جس میں نہ قمیص تھی اور نہ پجڑی وغیرہ، بعد ازاں لوگوں نے آپ (ﷺ) پر بغیر امام کے، جنازہ (یعنی کثرت سے درود و سلام) پڑھا، پھر اس کے بعد جب آپ (ﷺ) کے خلیفہ (حضرت ابو بکر صدیق) کے ہاتھ پر بیعت کا مرحلہ اختتام کو پہنچا، تو بدھ کی رات کو (حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا) میں آپ کو دفن کر دیا گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی ذات گرامی پر آپ کے رب کی جانب سے ان گنت درود و سلام ہوں!“

وَلَهَذَا دِينُهُ، لَا خَيْرَ إِلَّا دَلَّ الْأَمَّةُ عَلَيْهِ، وَلَا شَرَّ إِلَّا حَذَرَهَا مِنْهُ، وَالْخَيْرُ الَّذِي دَلَّ عَلَيْهِ: التَّوْحِيدُ، وَجَمِيعُ مَا يُحِبُّهُ اللَّهُ وَيَرْضَاهُ، وَالشَّرُّ الَّذِي حَذَرَ مِنْهُ، الشِّرْكُ وَجَمِيعُ مَا يَكْرَهُهُ اللَّهُ وَيَبْأَاهُ، بَعَثَهُ اللَّهُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً ۖ وَافْتَرَضَ اللَّهُ طَاعَتَهُ عَلَى جَمِيعِ الثَّقَلَيْنِ: الْجِنِّ وَالْإِنْسِ، وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (الاعراف ۱۵۸)

”آپ (ﷺ) کے دین کا مختصر (مگر جامع و مانع خلاصہ) یہ ہے: کہ بھلائی اور نیکی کا کوئی کام ایسا نہیں کہ آپ (ﷺ) نے اپنی امت کو اس کی اطلاع نہ دی ہو اور بُرائی کا بھی کوئی کام ایسا نہیں کہ جس سے اپنی امت کو خبردار نہ کیا ہو، جس بھلائی کی طرف آپ (ﷺ) نے (اپنی امت کو) رہنمائی فرمائی ہے وہ توحید باری تعالیٰ اور ہر وہ کام، جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور جو اس کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور جس بُرائی سے آپ (ﷺ) نے (اپنی امت کو) روکا اور خبردار کیا ہے، وہ شرک اور ہر وہ کام ہے، جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا اور برا سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو پوری انسانیت (تمام لوگوں) کی طرف مبعوث فرمایا اور ہر وہ عالم جن و انس پر آپ (ﷺ) کی اطاعت و فرمانبرداری فرض قرار دی ہے، اور اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”(اے محمد ﷺ!) آپ کہہ دیجئے، کہ اے لوگو! میں تم سب (انسانوں) کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“

﴿۱۵﴾ (بَعَثَهُ اللَّهُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کو، تمام دنیا کے لوگوں کی طرف اور قیامت قائم ہونے تک کے لئے اپنا آخری رسول بنا کر بھیجا ہے۔

﴿۱۶﴾ اس آیت کریمہ میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمائے گئے اور جس ہستی نے آپ کو منصب رسالت دے کر دنیا والوں کی طرف بھیجا ہے، وہ آسمانوں، زمینوں اور جو کچھ ان کے مابین ہے، سب کا خالق و مالک ہے، زندہ کرنا اور مارنا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اور وہ پاک ذات، جس طرح اپنی صفت ربوبیت میں یکتا ہے، اسی طرح وہ اپنی صفت الوہیت میں بھی واحد اور یکتا ہے، (جس میں اس کا کوئی شریک یا سا جہی نہیں ہو سکتا)

پھر اسی آیت کریمہ کے آخر میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اس ”امی“ (جو پڑھ لکھ نہ سکتا ہو) نبی اور رسول (ﷺ) پر ایمان لائیں، اور اسی کی پیروی کریں اور یہی ایمان اور پیروی، علمی و عملی، ارشادی و توفیقی ہر طرح کی ہدایت کے حصول کا سبب ہیں اور آپ (ﷺ) کی ذات گرامی دو جہانوں کی ساری مخلوقات کی طرف اللہ کا پیغمبر بن کر آئی ہے اور یہ دونوں جہانوں کی مخلوق جن و انس ہیں، جنہیں ان کی کثرت تعداد کی بناء پر اس نام سے موسوم کیا گیا ہے (در نہ آپ کی رسالت و نبوت تو ہمہ گیر اور عالمگیر ہے) (صلی اللہ علیہ وسلم)

وَأَكْمَلَ اللَّهُ تَعَالَى بِهِ الدِّينَ، وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ ﴿المائدہ: ۵﴾

”اور اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کے ذریعے دین اسلام کو مکمل کیا، (یعنی دین و دنیا کے تمام مسائل کا حل پیش فرمایا، اور اس میں کسی قسم کی کوئی تفسی اور کمی باقی نہیں چھوڑی، لہذا اب اس کامل دین میں نہ کوئی نئی چیز گھسیڑی اور ٹھوٹی جاسکتی ہے اور نہ اس کی اصل سے کوئی چیز نکالی جاسکتی ہے) اور اس بات کی دلیل یہ فرمان الہی ہے: ”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے، اور تم پر اپنی اس نعمت کا اتمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔“

□ ۱۸) مطلب یہ ہے کہ آپ (ﷺ) کا لایا ہوا دین اسلام تاقیام قیامت باقی اور جاری و ساری رہے گا، اور آپ (ﷺ) نے اپنی وفات حسرت آیات سے پہلے اپنی امت (مرحومہ) کو ان تمام امور اور معاملات سے اچھی طرح مطلع فرما دیا تھا، جن کی امت کو احتیاج تھی، یہاں تک کہ صحابی رسول حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: «مَا تَرَكَ النَّبِيُّ ﷺ طَائِرًا يُقَلِّبُ جَنَاحَيْهِ فِي السَّمَاءِ إِلَّا ذَكَرْنَا مِنْهُ عِلْمًا» (۷۰) کہ اللہ کے نبی ﷺ نے آسمان کی وسعتوں میں اپنے پروں کو پھیلانے ہوئے کوئی پرندہ بھی نہیں چھوڑا کہ جس کی بابت آپ (ﷺ) نے ہمیں تعلیم نہ دی ہو۔“

اور مشرکین میں سے ایک آدمی نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا: «لَقَدْ عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ حَتَّى الْخِرَاءَةِ» ”کہ تمہارے نبیؐ نے تو تمہیں (سب کچھ سکھا دیا ہے) یہاں تک کہ خیراء یعنی قضاے حاجت کے آداب بھی بتا دیئے ہیں، یہ سن کر حضرت سلمان فارسیؓ کہنے لگے: ہاں آپ (ﷺ) نے ہمیں (قضاے حاجت کے دوران ان کاموں سے روکا ہے: ① ہم قبلہ رخ ہو کر پاخانہ یا پیشاب کریں۔

② یا ہم استنجاء کرتے وقت تین پتھروں (مٹی کے ڈھیلوں) سے کم کا استعمال کریں۔

③ یا ہم دائیں ہاتھ سے استنجاء کریں۔

④ یا ہم جانوروں کی لید (گوبر وغیرہ) اور ہڈی سے استنجاء کریں۔ (۷۱)

تو اس طرح نبی مکرم ﷺ نے، اپنے قول، فعل اور تقریر کے ذریعے، خواہ ابتداء آپ (ﷺ) کی ذات گرامی سے ہوئی یا کسی سوال کے جواب میں پورا دین (امت کے لئے کھول کھول کر) بیان فرما دیا اور دین کے سلسلے میں سب سے زیادہ وضاحت آپ (ﷺ) نے عقیدۂ توحید کے بارے میں فرمائی (صلی اللہ علیہ وسلم)

☆..... پھر آپ (ﷺ) نے جس بات کا بھی حکم دیا وہ امت (مرحومہ) کی معاد (آخرت) اور معاش (دنیا) ہر اعتبار سے بھلائی اور بہتری کا حکم تھا، اور اسی طرح جس چیز سے بھی آپ (ﷺ)

نے منع فرمایا، وہ امت کی معاد (آخرت) اور معاش (دنیا) ہر اعتبار سے شر اور برائی کا سبب تھا۔ اور دین کے ادا و نواہی کے بجالانے کے سلسلے میں بعض جاہل لوگ تنگی اور سختی کا شکوہ کرتے ہیں، تو یہ سراسر ان کی عقل و بصیرت میں خلل، صبر و استقامت کی کمی اور دینی کمزوری کے باعث ہوتا ہے، وگرنہ دین حنیف کے بارے میں یہ عام اور معروف قاعدہ ہے: کہ اللہ رحیم و کریم نے دین کے امور میں ہم پر کوئی تنگی یا سختی نہیں کی اور دین سارا کا سارا آسان ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرہ: ۱۸۵) ”کہ اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ (کسی) تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔“.....

سورۃ الحج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمُ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: ۷۸) ”اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تم پر دین (کے امور) میں کوئی سختی نہیں کی۔“..... سورۃ النائدۃ میں اللہ جل مجدہ کا فرمان ہے: ﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمُ مِنْ حَرَجٍ﴾ (النائدۃ: ۶) ”اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی (یا سختی) کا حکم نافذ کرے۔“ لہذا تمام تر تعریفات اس معبود برحق کو سزاوار ہیں کہ اس نے ہم پر اپنی نعمت دین کو پورا اور مکمل فرمایا۔“

وَالدَّلِيلُ عَلَى مَوْتِهِ ﷺ قَوْلُهُ: تَعَالَى: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾، ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ﴿١﴾ وَالنَّاسُ إِذَا مَاتُوا يَبْعَثُونَ ﴿٢﴾ وَالدَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ ﴿٣﴾ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ ﴿٤﴾ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى ﴿٥﴾﴾ وَقَوْلُهُ: تَعَالَى: ﴿وَاللَّهُ أَتَبَّكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا﴾، ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ﴿٦﴾ (نوح: ۱۷، ۱۸)

”اور آپ (ﷺ) کے اس دنیا سے وفات پا جانے کی دلیل قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”اے نبی (ﷺ)! آپ کو بھی مرنا ہے اور ان (سب) لوگوں کو بھی مرنا ہے، اور بالآخر قیامت کے روز تم سب اپنے پروردگار کے حضور اپنا اپنا مقدمہ پیش کرو گے۔“..... اور (اس طرح) تمام لوگ مرنے کے بعد (روز محشر، جزاء و سزاء کے لئے) دوبارہ اٹھائے جائیں گے، جس کی دلیل یہ فرمان الہی ہے: ”اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں



ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی (زمین) سے تم کو نکال باہر کریں گے۔“ اور یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی، موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کی ایک واضح دلیل ہے: ”اور اللہ (جل شانہ) نے تم کو زمین سے خاص طور سے پیدا کیا، پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا، اور (روز قیامت پھر اسی زمین سے) تم کو یکا یک نکال کھڑا کرے گا۔“

﴿۱۹﴾ آیت ہذا میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ کے نبی (ﷺ) اور آپ (ﷺ) کی ساری اُمت، جن کی طرف آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا، سب کے سب موت کا ذائقہ چکھنے والے ہیں اور پھر اس مرحلہ موت کو طے کرنے کے بعد وہ سب کے سب قیامت (یعنی جزاء و سزا) کے دن اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں اپنے مقدمات پیش کریں گے، اور اللہ اَحْكَمُ الْحَاكِمِین ان کے مابین، حق کے ساتھ فیصلہ فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کبھی بھی کافروں کو مسلمانوں کے خلاف کامیابی کا کوئی راستہ (یا موقعہ) نہیں دے گا۔“

﴿۲۰﴾ مولف کتاب (شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ) نے اس جملے میں یہ بیان کیا ہے کہ تمام لوگ جب مر جائیں گے، تو پھر وہ اٹھائے جائیں گے، اللہ عز وجل، ان کو، ان کی موت کے بعد، جزاء و سزا کے لئے زندہ کر کے اٹھائے گا اور یہی وہ رسولوں کو ان کی طرف دنیا میں بھیجنے کا حتمی نتیجہ و سبب ہے کہ انسان دنیا میں ان انبیاء و رسل علیہم السلام کی ہدایت کے مطابق اس روزِ محشر اور جزاء و سزا کے دن کی تیاری میں، عمل کرے، اس دن کی خاطر، جس کے احوال اور ہولنا کیوں کا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ سُن کر انسان کا ذل اللہ عز وجل کی جانب کھینچا چلا آتا ہے، اور اس دن کے خوف اور ہیبت سے اس پر لرزہ جاری ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا السَّمَاءُ مَنْفُطِرٌ بِهِ كَأَن وَعْدُهُ مَفْعُولٌ﴾ (الزلزلہ: ۱۷، ۱۸) ”اب اگر تم نے (اس رسول کا) انکار کر دیا، تو اس دن (کی سختی) سے کیونکر بچ سکو گے، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا جس (کی سختی) سے آسمان پھٹ جائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔“

نیز اس جملہ میں موت کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان کی طرف اشارہ ہے اور شیخ الاسلام

رحمہ اللہ! نے اس پر دو قرآنی آیات سے دلیل لی ہے۔

﴿۱۱﴾ ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ﴾ مطلب یہ ہے کہ اس زمین سے ہی ہم نے تم سب کو پیدا

کیا اور یہ اس وقت ہوا جب آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے۔

﴿۱۲﴾ ﴿وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ﴾ یعنی موت کے بعد ہم تم کو دفن کر کے اسی زمین کی طرف

لوٹائیں گے۔

﴿۱۳﴾ ﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخَرٰی﴾ یعنی روزِ قیامت (حساب و کتاب کے لئے)

ہم تمہیں دوبارہ اسی زمین سے نکال باہر کریں گے۔

﴿۱۴﴾ ﴿وَاللّٰهُ اَنْتَبٰتُكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ

اِخْرَاجًا﴾ یہ آیت کریمہ اپنے معنی و مفہوم میں مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿مِنْهَا

خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخَرٰی﴾ کے مطابق ہے۔ اور اس مفہوم

کی آیات، قرآن حکیم میں بہت زیادہ ہیں، نیز اللہ عزوجل نے اس حقیقت کو مزید ظاہر کیا ہے

اور آخرت کے دن (یعنی روزِ جزاء و سزا) کے ثبوت میں بار بار آیات کریمہ سے اس کا اعادہ

فرمایا ہے، تاکہ لوگ اس پر ایمان جازم لے آئیں، روزِ آخرت پر ایمان میں مزید بڑھ

جائیں، اور اس بڑے دن کی تیاری میں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کا توشہ مہیا کر لیں، جس

کے لئے ہم بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہ میں سراپا التجاء ہیں کہ وہ ہم کو آخرت کے لئے نیک

اعمال کرنے والوں اور سعادتمندی پانے والوں میں سے کر دے، آمین!

وَبَعْدَ النَّعْتِ مُحَاسَبُوْنَ وَمَجْزِيُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ، وَالذَّلِيْلُ قَوْلُهُ تَعَالٰی

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوْا وَاِيْمًا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی﴾ ﴿۱۵﴾

”اور دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد لوگوں سے حساب کتاب لیا جائے گا، اور ان کے اعمال

(حسنہ و سیئہ) کے مطابق انہیں جزاء و سزا دی جائے گی، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

”اور زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے، تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ

دے اور ان لوگوں کو اچھی جزاء سے نوازے، جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا تھا۔“ (البقرہ: ۲۸۱)

﴿۲۵﴾ آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ لوگ اپنی قبروں سے (روزِ قیامت) اٹھائے جانے کے بعد اپنے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دیئے جائیں گے، اگر اعمال اچھے ہوں گے تو ان کا بدلہ بھی اچھا ہوگا اور اگر اعمال بُرے ہوں گے تو ان برے اعمال کا بدلہ بھی بہت بُرا ہوگا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (الزلزال: ۷، ۸) ”چنانچہ جس شخص نے ذرہ بھرتی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ بھر بدی کی ہوگی وہ (بھی) اسے دیکھ لے گا۔“

اور سورۃ الانبیاء میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ﴾ (الانبیاء: ۳۷) ”اور ہم روزِ قیامت انصاف کے ترازو رکھیں گے اور کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہوگی، اور اگر کسی کا رائی کے دانہ برابر بھی عمل ہوگا تو وہ بھی سامنے لائیں گے اور حساب کرنے کو ہم کافی ہیں۔“

اور اسی طرح سورۃ الانعام میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد یوں ہوا: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (الانعام: ۱۶۰) ”جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی نیکی لے کر آئے گا تو اسے اس نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا اسے اتنی ہی سزا دی جائے گی، جتنی اس نے بُرائی کی تھی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

ایک نیکی کے بدلے (کم از کم) دس گنا زیادہ اجر سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر اس سے بھی کئی گنا زیادہ (جس کی کوئی حد نہیں) اجر و ثواب، اللہ عز و جل کی طرف سے بہت بڑا فضل اور اس پاک اور بلند و بالا ذات کا اپنے بندوں پر بہت ہی بڑے احسان کی واضح دلیل ہے اور اس کے اس فضل و کرم کی انتہاء یہ ہے کہ ایک تو وہ اپنے بندے کو نیک عمل کرنے کی توفیق سے نوازتا ہے، اور پھر وہ اس عمل کے بدلے اپنے بندے کو بے حد و حساب اجر و ثواب

سے بہرہ ور فرماتا چلا جاتا ہے، اور اس کے برعکس اگر عمل برا ہو (والعیاذ باللہ من ذلک) تو اس کا بدلہ بھی اس برے عمل جتنا ہوگا، انسان کو اس برے عمل سے بڑھ کر اس کی سزا نہیں دی جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (الانعام: ۱۶۰) ”اور جو شخص اللہ کے ہاں کوئی بُرائی لے کر آئے گا، اسے اتنی ہی سزا دی جائے گی جتنی اس نے بُرائی کی تھی، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

اور یہ بات اللہ رحیم و کریم کے اپنے بندوں پر کمال فضل و احسان میں سے ہے۔  
(سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ)

پھر شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: ﴿لِيُجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا﴾ ”تاکہ (اللہ تعالیٰ) بُرائی کرنے والوں کو ان کے عمل (کے مطابق ان) کا بدلہ دے، یہاں آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿لِيُجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِالسُّوْءِ﴾ ”تاکہ اللہ بُرائی کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بُرا بدلہ دے، بخلاف اپنے اس فرمان کے ﴿وَيُجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى﴾ اور ان لوگوں کو (اللہ تعالیٰ) ان کے نیک اعمال کے بدلے اچھی جزاء سے نوازے“ جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے۔“ (فرق واضح ہے خوب سمجھ لو!)

وَمَنْ كَذَّبَ بِالْبَعْثِ كَفَرَ وَالْذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَبَيْنِي وَبَيْنَ لَتُبْعَثُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾<sup>۵</sup>  
”اور جس نے (بعث بعد الموت) یعنی مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا تو وہ کافر ہو گیا، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ترجمہ: ”کافروں نے یہ بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے، ان سے کہہ دیجئے، نہیں میرے رب کی قسم! تم ضرور ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر یہ ضرور تمہیں بتایا جائے گا، کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے اور ایسا کرنا اللہ (جل مجدہ) کے لئے بہت آسان ہے۔“ (التغابن: ۷)

﴿۱﴾ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بھی مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا، تو وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کافر ہے، اور اس کی تائید اللہ جل جلالہ کے ان فرامین سے بھی ہوتی ہے:

﴿۱﴾ ﴿وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۖ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبُّنَا قَالَ فَلَوْ قُودُوا الْعَذَابِ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ (الانعام: ۲۹، ۳۰)

”اور یہ لوگ تو کہتے ہیں، کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور (مر جانے کے بعد) ہمیں اٹھایا نہیں جائے گا، کاش! آپ وہ وقت بھی دیکھیں، جب انہیں اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا کیا جائے گا، اللہ (تعالیٰ) ان سے پوچھے گا: ”بتاؤ کیا یہ دن حقیقت نہیں؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں ہمارے پروردگار کی قسم“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا پھر جو تم اس کا انکار کرتے تھے تو اب عذاب کا مزہ چکھو۔“

﴿۲﴾ ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۖ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ يَوْمَ الدِّينِ ۖ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۖ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۖ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۖ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمْ حُجُّوْهُ ۖ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۖ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ﴾ (المطففين: ۱۰-۱۷)

”اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ہلاکت ہے، جو روزِ جزاء کو جھٹلاتے ہیں، اور اسے ہر وہ شخص جھٹلاتا ہے، جو حد سے بڑھنے والا گناہ گار ہے اور جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے: کہ یہ تو پہلے لوگوں کی داستانیں ہیں، ہرگز یہ بات نہیں، بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا رنگ لگ گیا ہے، ہرگز نہیں، یقیناً ایسے لوگ! اس دن اپنے پروردگار (کے دیدار) سے محروم رکھے جائیں گے۔ پھر یقیناً وہ جہنم میں گرنے والے ہیں۔ پھر (انہیں) کہا جائے گا: یہی وہ چیز ہے، جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

﴿۳﴾ ﴿هَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا﴾ (الفرقان: ۱۱)

”در اصل یہ لوگ قیامت کو جھٹلا رہے ہیں اور جو قیامت کو جھٹلائے، ہم نے اس کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے۔“

﴿۴﴾ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَكُونُونَ مِنَ الرَّحِمَتِ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (العنکبوت: ۲۳)

”اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور انہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔“

اور اس موضوع کی وضاحت میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ نے، اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: ﴿زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (التغابن: ۷)

”(آخرت کا) انکار کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ قطعاً اٹھائے نہیں جائیں گے، آپؐ ان سے کہئے: کیوں نہیں، میرے رب کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر جو کچھ تم کرتے رہے، اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا اور یہ بات اللہ کے لئے آسان ہے۔“

اور بعث و نشور (یعنی مرکر دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب و کتاب کے لئے اکٹھے کئے جانے) کے منکرین کا درج ذیل دلائل و شواہد سے توڑ اور ان کی تسلی کی جاسکتی ہے:

۱۔ پہلی دلیل: کہ مرنے کے بعد زندہ ہو کر دوبارہ اٹھنے کا معاملہ اس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ اس کے ثبوت میں انبیاء و رسل علیہم السلام پر اتاری جانے والی جملہ آسمانی شریعتوں اور الہامی کتابوں میں تو اتر کے ساتھ آیات و نصوص ذکر ہوئی ہیں اور پھر اس عقیدے کو ہر پیغمبرؐ کی امت میں سے لوگوں نے قبول کیا ہے اور تم اے منکرین یوم بعث! کیونکر اس حقیقت کا انکار کرتے ہو، جبکہ تم کسی فلسفی اور مفکر کی طرف سے کبھی گئی ہر بات کو فوراً سچ مانتے ہوئے قبول کر لیتے ہو، خواہ یہ خبر اپنے وسائل اور ذرائع کے اعتبار سے کسی بھی طرح بعث و نشور کے بارے میں خبریں دینے والے ذرائع و وسائل سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، نہ خبر کو منتقل کرنے کے لحاظ سے اور نہ واقعاتی

شہادت (گواہی) کی رو سے !!؟

دوسری دلیل: یقیناً بعث (مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا) ایک ایسا معاملہ ہے، جس پر عقل بھی شاہد ہے، لہذا عقلی اعتبار سے اس کی درج ذیل وجوہ ہیں:

① کسی ایک کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مخلوق (پیدا کی گئی کوئی بھی چیز) عدم کے بعد وجود میں آتی ہے اور یہ کہ ہر مخلوق حادث یعنی اپنے وجود میں آنے سے قبل وہ کچھ نہ تھی، تو وہ ذات برحق، جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے، اس کو عدم سے وجود میں لایا ہے، جبکہ اس سے پہلے وہ کوئی چیز نہ تھی، اس بات پر زیادہ قادر ہے کہ ایک چیز کو وجود میں لانے کے بعد (جب وہ ختم ہو جائے) تو اسی کو دوبارہ وجود میں لے آئے۔ جیسا کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (الروم: ۲۷) ”اور وہی (اللہ) تو ہے، جو خلقت (کی پیدائش) کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا، اور یہ (دوسری بار کی پیدائش) اس پر زیادہ آسان ہے۔“

اور سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعَدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۴)

”جس طرح ہم نے تمہاری تخلیق (پیدائش) کی ابتداء کی تھی، اسی طرح، اس کا اعادہ کریں گے، یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے اور ہم اسے کر کے رہیں گے۔“

② کوئی شخص بھی آسمانوں اور زمینوں کی ضخامت کی بناء پر ان کی پیدائش کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کے انوکھے اور حیران کن عجائبات سے کسی کو انکار ہے، تو وہ بلند وبالا ذات، جس نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ لوگوں کو پیدا کرنے اور پھر انہیں مار کر دوبارہ زندہ کرنے پر زیادہ قدرت رکھتا ہے، اس کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرامین کافی ہوں گے:

﴿الْخَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ (عافر: ۵۷)

”آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا، انسانوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے۔“

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْ يَخْلُقْهُنَّ يُقْدِرُ﴾

عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى بَلَى إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴿﴾

”کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور انہیں پیدا کر کے تھک نہیں گیا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے، کیوں نہیں وہ

ذات تو ہر چیز پر قادر (مطلق) ہے۔“ (الاحقاف: ۳۳)

﴿أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾

بَلَى وَهُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴿﴾

(طہ: ۸۱، ۸۲)

”کیا وہ ذات، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا اس پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے، کیوں نہیں، وہی تو سب کچھ پیدا کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے، اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔“

۳۵ ہر عقلمند اور صاحب بصیرت شخص بنجر، مردہ اور جلی سڑی زمین کا مشاہدہ کرتا ہے، اور یہ بخوبی جانتا ہے کہ جب اس پر بارش برسی ہے تو وہ مردہ زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور موت کے بعد نباتات اور سبزہ اس کے لپٹن پر لپھانے لگتا ہے، تو اس مردہ زمین کو زندگی بخشنے پر قادر مطلق ذات، مردہ لوگوں کو زندگی بخشنے کے بعد انہیں دوبارہ اٹھانے پر بھی قدرت رکھتی ہے، اس کی تائید میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْتَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الْآلِيَ أَحْيَاهَا لَمُعْجِزَاتُ اللَّهِ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (فصلت: ۳۹)

”اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین سونی (بے آباد) پڑی ہوئی ہے، پھر ہم اس پر پانی برساتے ہیں، تو وہ حرکت میں آتی ہے اور پھول جاتی ہے، جس (اللہ) نے اس زمین کو زندہ کیا وہ یقیناً مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“



**تیسری دلیل:** کہ بعث (مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا) ایک ایسا معاملہ ہے، کہ جس کی حقیقت اور امکان پر حسی (یعنی شعوری) اور واقعاتی شواہد (کے دلائل) بھی موجود ہیں، جیسا کہ اس بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ہمیں مردوں کو زندہ کرنے کے بعض واقعات کی بابت خبر دی ہے اور اس ضمن میں صرف سورۃ البقرۃ ہی میں پانچ مختلف واقعات ذکر ہوئے ہیں، جن میں سے ایک واقعہ کے بیان میں یہ آیات مبارکہ ہیں: ﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ مَرَّةً عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَى جِمَاركَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوها لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (البقرۃ: ۲۵۹)

”یا (تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا) جو ایک بستی کے قریب سے گزرا اور وہ بستی اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، وہ کہنے لگا، اس بستی کی موت کے بعد دوبارہ اللہ اسے کیسے زندگی دے گا (اور آباد کرے گا؟) اس پر اللہ (تعالیٰ) نے اسے سو سال تک موت کی نیند سلا دیا، پھر اسے زندہ کر کے اس سے پوچھا: بھلا کتنی مدت تم یہاں پڑے رہے؟ وہ بولا بس یہی ایک دن یا اس کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں گا، اللہ (تعالیٰ) نے فرمایا: ”بات یوں نہیں، بلکہ تم یہاں سو سال پڑے رہے ہو، اچھا اب اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف تو دیکھو، یہ ابھی تک باسی نہیں ہوئیں اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو، (اس کا بچر تک بوسیدہ ہو چکا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ تجھے لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کی) ایک نشانی بنا دیں (کہ جو شخص سو برس پیشتر مر چکا تھا وہ دوبارہ زندہ ہو کر آ گیا) اور اب گدھے کی ہڈیوں کی طرف بھی دیکھو، کہ ہم کیسے انہیں جوڑتے، اٹھاتے اور اس پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، جب یہ سب باتیں واضح ہو گئیں تو وہ کہنے لگا: اب مجھے خوب معلوم ہو گیا، کہ اللہ (تعالیٰ) ہر چیز پر قادر (مطلق) ہے۔“

**چوتھی دلیل:** حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بعث (یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندگی) ہونے چاہئے تاکہ ہر نفس کو اس کے کئے کا صحیح اور پورا بدلہ مل سکے اور اگر ایسا نہ

ہوتا، تو اس دنیا میں لوگوں کی پیدائش ایک بے فائدہ اور بے کار کام ہو کر رہ جاتا، جس کی سرے سے کوئی قیمت ہی نہ ہوتی اور نہ ہی اتنی مخلوق کی پیدائش میں کوئی حکمت و مصلحت کا فرما ہوتی اور پھر ایسی زندگی کے ہوتے ہوئے انسان اور چوپائے وغیرہ میں فرق ہی مٹ جاتا، اللہ تعالیٰ اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ فَتَعَلَىٰ اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ﴾ (المؤمنون: ۱۱۵، ۱۱۶)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار ہی پیدا کر دیا اور تم ہمارے ہاں لوٹ کر نہ آؤ گے؟ پس اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند شان والا ہے، وہی حقیقی بادشاہ ہے، اس کے علاوہ کوئی اللہ (معبود برحق) نہیں، وہی عرش کریم کا مالک ہے۔“

اور سورہ طہ میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوا ہے:

﴿إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِيُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ﴾ (طہ: ۱۵)

”قیامت، یقیناً آنے والی ہے، میں اسے ظاہر کرنے ہی والا ہوں، تاکہ ہر شخص اپنی کوشش کا بدلہ پالے۔“

اور سورہ النحل میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَنفُسُكُمَا لِلَّهِ جَهَدٌ أَيْمَانُهُمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلَفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ۝ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (النحل: ۲۳۸-۲۴۰)

”اور یہ لوگ اللہ کے نام کی کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں: کہ اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا، اٹھائے گا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے، جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے، اور ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کھول دے جس کے بارے میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں، اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے (رہا اس کا امکان، تو)، ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوگا کہ اسے حکم دیں ہو جا، تو بس وہ ہو جاتی ہے۔“

اور سورہ النعمان میں اس مسئلہ کی وضاحت ان الفاظ میں ہوئی ہے:

﴿زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّيُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (النعمان: ۶)

”آخرت کا) انکار کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ قطعاً اٹھائے نہیں جائیں گے، آپ ان سے کہئے، کیونکہ نہیں، میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر جو کچھ تم کرتے رہے، اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا، اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے بہت آسان ہے۔“

تو جب یہ اور اس طرح کی دیگر واضح دلیلیں، بعث (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھائے جانے) کی حقیقت کا انکار کرنے والوں کے سامنے بیان کی جائیں اور وہ اس کے باوجود اپنے انکار پر مصر اور بعذر رہیں، تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا، کہ یہ لوگ حق اور اہل حق کے بارے میں متکبرین اور معاندین کا ٹولہ ہیں، اور ایسے ظالم لوگ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا انجام کار کیا ہولناک تباہی لے کر آتا ہے۔“

وَأَرْسَلَ اللَّهُ جَمِيعَ الرُّسُلِ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ، وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِيَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵)

”اور اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو جنت کی نعمتوں کی خوشخبری دینے اور (عذابِ جہنم) سے ڈرانے والے بنا کر بھیجا تھا، جس کی دلیل یہ فرمان الہی ہے: ترجمہ: ”یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کسی قسم کا کوئی عذر (وجہت) باقی نہ رہے۔“

□ ﴿۱﴾ مولف کتاب رحمہ اللہ! نے یہ واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں (ﷺ) کو مُبَشِّرِينَ (خوشخبری دینے والے) اور مُنْذِرِينَ (ڈرانے والے) بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ﴾ کہ یہ پیغمبر، اطاعت و

فرمانبرداری کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری دیتے ہیں اور اپنے مخالفین اور نافرمانوں کو آتش جہنم سے ڈراتے ہیں..... اور

رسولوں کو اس دنیا میں منصب رسالت دے کر بھیجنے میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں کارفرما ہیں اور ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ لوگوں پر حجت (دلیل) قائم کر دی جائے، یہاں تک کہ رسولوں (ﷺ) کو بھیجنے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر اور حجت باقی نہ رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَقَدْ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ ”تاکہ ان رسولوں (ﷺ) کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت (عذر یا دلیل) باقی نہ رہے۔“

اور منجملہ حکمتوں میں اللہ جل شانہ کا اپنے بندوں پر اپنی نعمت کا پورا کرنا بھی ہے، تو ایک انسانی عقل و بصیرت، فہم و فراست کے جس درجے تک بھی پہنچ جائے، اس کے لئے ان تمام خاص حقوق کی تفصیلات جاننا ناممکن ہے، جو اللہ تعالیٰ کے، اس کے بندوں پر عائد ہوتے ہیں، نہ اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ جل جلالہ کی تمام صفات کاملہ پر مطلع ہو سکے اور نہ ہی اللہ جل شانہ کے اسمائے حسنیٰ کا احاطہ کرنا اس کے بس کی بات ہے..... اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسولوں (ﷺ) کو مَبَشِّرِينَ (خوشخبری دینے والے) اور مُنْذِرِينَ (ڈرانے والے) بنا کر بھیجا ہے، اور ان کے ساتھ ہی سچائی پر مبنی الہامی کتب بھی نازل فرمادیں تاکہ لوگوں کے آپس میں اختلاف کی صورت میں وہ اس کتاب مبین (اور کتاب ہدایت) کے ذریعے ان کے درمیان فیصلہ کر سکیں۔“

اور سب سے بڑی ’دعوت‘ جس کی طرف، سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر سب سے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام نے لوگوں کو بلایا، وہ ’دعوت توحید‘ ہے، جیسا کہ اس بات کی تائید میں اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (احل: ۳۶)

”اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا (اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا) کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو، اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔“

اور سورۃ الانبیاء میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اِنَّهُ لَا اِلَهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء: ۲۵) ”اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا، اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، لہذا تم صرف میری ہی عبادت کرو۔“

وَأَوَّلُهُمْ نُوحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَآخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالِدَلِيلُ عَلَى أَنَّ أَوَّلَهُمْ نُوحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ، قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ (النساء: ۱۶۳) ”اور رسولوں میں سے سب سے پہلے رسول جناب نوح علیہ السلام اور سب سے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ علیہ السلام ہیں، اور آپ (ﷺ) خاتم النبیین ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پہلے رسول (نہ کہ پہلے نبی) ہونے کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اے پیغمبر (ﷺ) ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے، جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے نبیوں (ﷺ) کی طرف بھیجی تھی۔“

□ ﴿یہاں، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے یہ بات بیان کی ہے کہ سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام تھے اور اپنے بیان کی دلیل، آپؑ نے اللہ جل شانہ کے اس فرمان سے لی ہے: ﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ (النساء: ۱۶۳) ”(اے محمد ﷺ!) ہم نے آپؑ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے، جیسے نوح اور ان کے بعد آنے والے انبیاء (ﷺ) کی طرف کی تھی۔“

اور صحیح بخاری کی حدیث شفاعت میں یہ الفاظ ہیں: «إِنَّ النَّاسَ يَأْتُونَ إِلَى نُوحٍ فَيَقُولُونَ لَهُ أَنْتَ أَوَّلُ رَسُولٍ أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى أَهْلِ الْأَرْضِ» (۷۴) ”کہ روزِ محشر کو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس (شفاعت کے لئے) آئیں گے، اور آپؑ سے کہیں گے: آپ پہلے رسول ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔“..... تو ثابت

آپ پہلے رسول ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔“..... تو ثابت یہ ہوا کہ، حضرت نوح علیہ السلام سے قبل کوئی رسول نہیں تھا اور انہی نصوص کے ذریعے، ہم ان مورخین کی غلطی جان لیتے ہیں، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کے رسول تھے، بلکہ ظاہری بات یہ ہے کہ حضرت ادریسؑ تو بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی ہو گزرے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اور ان انبیاء و رسل علیہم السلام میں سے سب سے آخری نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (الاحزاب: ۴۰)

”محمد ﷺ تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

لہذا آپ (ﷺ) کے بعد اور کوئی نبی نہیں اور جس نے بھی آپ (ﷺ) کی نبوت و رسالت کے ہوتے ہوئے، نبی یا رسول ہونے کا دعویٰ کیا تو وہ فحش کافر، جھوٹا اور اسلام سے مرتد (کل جانے والا) ہے۔“ (فانعیاذ باللہ من ذلک)

وَكُلُّ أُمَّةٍ بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْهَا رَسُولًا ۖ مِّن نُّوحٍ إِلَىٰ مُحَمَّدٍ يَأْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ اللَّهِ تَعَالَىٰ وَخَدَهُ، وَيَنْهَاهُمْ عَنِ عِبَادَةِ الطَّاغُوتِ وَالذَّلِيلُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (نحل: ۳۶)

وافتترض اللہ تعالیٰ علی جمیع العباد الکفر بالطاغوت والایمان باللہ وخدہ، قال ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ! الطاغوت: ما تجاوز به العبد حدہ من معبود أو متبوع أو مطاع ۖ

”اور ہر امت کی جانب اللہ تعالیٰ نے، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک رسول بھیجے ہیں، جو اپنے امتیوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتے اور طاغوت کی عبادت سے منع کرتے آئے ہیں، جس کی دلیل حق تعالیٰ جل شانہ کا یہ ارشاد ہے: ترجمہ: ”اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا (اور اس کے ذریعے سب کو متنبہ بھی کر دیا) کہ (ایک) اللہ کی بندگی کرو،

اور 'طاغوت' کی بندگی سے بچو۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمام بندوں (جن و انس) پر طاغوت کا انکار و کفر اور اللہ جل شانہ پر ایمان لانا فرض قرار دیا ہے، امام ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ تعالیٰ: 'طاغوت' کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جس کسی بھی باطل معبود (یعنی جس غیر اللہ کی عبادت کی جائے) یا متبوع (یعنی جس کی ایسے امور میں پیروی کی جائے، جن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو) یا مطاع (یعنی جس کی حلال و حرام کے معاملات میں اس طرح اطاعت کی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے فرامین کی مخالفت لازم آئے) کی وجہ سے بندہ اپنی بندگی کی حدود (یعنی خالص عبادت الہی) سے تجاوز کر جائے تو وہی چیز 'طاغوت' کہلائے گی۔"

□ ﴿۲۶﴾ مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا، جو ان کو ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا اور شرک سے (ان کو) روکتا رہا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۳) "اور کوئی امت ایسی نہیں گزری، جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔"

اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ! نے اپنے اس قول کی تائید میں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ "اور تحقیق ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا (یہ حکم دے کر کہ وہ اپنی امت کے لوگوں سے کہے) صرف 'اللہ' کی بندگی کرو اور 'طاغوت' (کی بندگی) سے بچو۔"

□ ﴿۲۷﴾ اور یہ آیت کریمہ حقیقت میں کلمہ 'توحید' (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) کا معنی ہے (جو کہ نفی و اثبات پر مشتمل ہے)

□ ﴿۲۸﴾ اپنے اس بیان سے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ بندہ کی 'توحید' اس وقت تک صحیح اور مکمل نہیں ہوگی (یا اس وقت تک وہ پورا 'موحد' نہیں بنے گا) جب تک وہ اللہ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ کی بندگی نہ کرے اور 'طاغوت' سے مکمل طور پر نہ بچے۔ اور یہ چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کر دی ہے ..... اور 'الطَّاغُوت' کا کلمہ 'الطُّغْيَان' سے مشتق ہے اور 'الطُّغْيَان' سے مراد کسی کا، مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا ہے

اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾  
 ”جب پانی کا طوفان حد سے بڑھا، تو ہم نے ہی تمہیں کشتی میں سوار کر دیا تھا۔“ (الحاقة: ۱۱)  
 ☆..... آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب پانی مقررہ حد سے تجاوز کر گیا، تو اس وقت ہم نے تم کو  
 جَارِيَةٍ یعنی کشتی میں بٹھالیا۔“

اور شرعی اصطلاح میں طَاغُوت کی سب سے اچھی اور عمدہ تعریف امام ابن قیمؒ نے کی  
 ہے، جیسا کہ اس کا ذکر مولف کتاب رحمہ اللہ! نے بھی کیا ہے کہ ’طَاغُوت‘ ہر وہ باطل معبود  
 (جس غیر اللہ کی عبادت کی جائے) یا متبوع (جس کی، اللہ کی نافرمانی میں اتباع کی جائے)  
 یا مطاع (جس کی حلال و حرام کے امور میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرتے ہوئے اطاعت کی  
 جائے) ہے، جن کی وجہ سے بندہ اپنے حقیقی معبود کی بندگی سے تجاوز کر جائے۔“ اور امام  
 موصوفؒ کی طَاغُوت کی تعریف میں مَعْبُود، مَتَّبِع اور مُطَاع سے مراد وہ لوگ ہیں،  
 جو صالحین (یعنی نیکو کار اور پرہیزگار) نہ ہوں، اور جو خود نیک، متقی اور پرہیزگار ہوں وہ  
 ’طواغیت‘ کی صف میں شامل نہیں، خواہ ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی، گمراہ لوگ ان کی عبادت  
 کرتے ہوں یا ان کی، اللہ تعالیٰ کی معصیت اور مخالفت میں، اطاعت و اتباع بھی کی جاتی  
 ہو۔“ (وَالْعِبَادُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَلِكْ)..... لہذا ہر قسم کا بت، جس کی ”اللہ واحد“ کے علاوہ عبادت کی  
 جائے، وہ طَاغُوت ہے، وہ علمائے سوء جو اللہ کی مخلوق کو گمراہی اور کفر و شرک یا بدعات و  
 خرافات کی طرف دعوت دیتے ہوں، یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام اور حرام کردہ  
 چیز کو حلال قرار دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوں، وہ طَوَاغِیت ہیں، اسی طرح علماء  
 میں سے ان مفکرین اور دانشوروں کا گروہ، جو وقت کے حکمرانوں کو، دین اسلام کے مخالف،  
 باہر سے درآمد شدہ باطل نظام کی ظاہری چمک دمک سے متاثر کر کے انہیں ’شریعت طاہرہ‘ سے  
 برگشتہ کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، یہ سب طَوَاغِیت ہیں۔

☆ کیونکہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی (ان کے اپنے بارے میں مقرر کردہ) حدود سے تجاوز



کیا ہوتا ہے، اور ایک عالم (پڑھے لکھے) شخص کی حد یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے نبی ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی کرے، کیونکہ علماء حضرات انبیاء ﷺ کے حقیقی جانشین ہیں، جو ان کے بعد امت میں، علم و عمل، سیرت و اخلاق اور دعوت و تعلیم میں ان کے وارث بنتے ہیں، تو اگر یہ لوگ اپنی اس مقرر کردہ حد اور مقام سے تجاوز کر جائیں اور پھر جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ (وہ ترقی یافتہ اور جدت پسند بنتے ہوئے اور اپنے تئیں عصر حاضر کے مفکر اور دانشور ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے) ملک کے حکمرانوں اور امراء طبقہ کو مغربی تہذیب کے باطل اور پرفریب نظام کا چکمہ دے کر، شریعت اسلامیہ کے پاکیزہ اور فطری نظام حیات سے متفر کرنے کا غلیظ اور مہیب کردار ادا کرنے لگیں، تو وہ 'طواغیت' ہیں، اس لئے کہ 'شریعت طاہرہ' کی متابعت، جو ان پر فرض تھی، اس سے انہوں نے تجاوز اور انحراف کیا۔" (وَالْأَنْبِيَاءُ بِاللّٰهِ)

اور مؤلف رحمہ اللہ کا 'طاعوت' کی تعریف کے ضمن میں جو یہ قول (أو مطاع) ہے، تو اس سے آپؐ کی مراد ریاست کے وہ امراء ہیں، جن کی عوام الناس دو طریقوں سے اطاعت کرتے ہیں، ایک شرعاً، دوسرے قدراً۔ تو ایسے امراء کی 'شرعی' طریقے سے تب اطاعت کی جاتی ہے، جب وہ عامۃ الناس کو ایسے احکام صادر کریں، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت میں نہ ہوں۔ ایسے حالات میں ان پر طواغیت کی اصطلاح صادق نہیں آتی (یا بالفاظ دیگر وہ طواغیت نہیں ہیں)، بلکہ رعایا پر ان کی سمع (یعنی جو کچھ وہ کہیں اس کو سننا) اور طاعة (یعنی جو کچھ وہ حکم دیں اس کی پیروی کرنا) واجب ہے، اس لئے کہ اس مذکورہ صورت میں لوگوں کا حاکم وقت یا 'امیر ریاست' کا حکم ماننا، اللہ عزوجل کی اطاعت کرنا ہے، لہذا جب 'والی ریاست' یا 'حاکم وقت' کسی ایسی بات کا حکم دے، جس پر عمل کرنا واجب ہو، تو اس وقت ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ امیر کے اس حکم کی پیروی میں ہم اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کا قرب حاصل کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہمارا اس حکم کے سامنے

سر تسلیم خم کرنا، اللہ عزوجل کی بارگاہ میں قربت کا ذریعہ بن جاتا ہے، تو اس بناء پر ہمیں اس بات کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہئے..... اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان حاکموں کی بھی جو تم میں سے ہوں۔“

☆ اور امراء و حکام کی ’قدری‘ طریقے سے اطاعت اس وقت کی جاتی ہے، جب وہ اپنے عوام پر غلبہ کی پوری قوت اور طاقت رکھتے ہوں، تو ایسے حالات میں لوگ حاکم کی قوت اور طاقت کی بناء پر اس کا حکم مانتے ہیں، خواہ وہاں ایمانی جذبہ و حمیت کا فقدان ہو، اس لئے کہ امیر یا حاکم کی اطاعت تو جذبہ ایمانی کے بل بوتے پر ہوتی ہے اور یہی وہ منفعت بخش اطاعت ہے، جو بیک وقت حکام اور عامۃ الناس دونوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے اور سلطانی (یعنی غلبہ اور) رعب و دبدبے کی بناء پر اطاعت و پیروی کبھی کبھار ایسے حالات میں ہوتی ہے جب ملک و ریاست کا سربراہ اتنا مضبوط اور طاقتور ہو کہ لوگ اس سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہوں، اس لئے کہ وہ اپنے حکم کے مخالف شخص کو عبرتناک سزا سے دوچار کرتا ہے..... اور اسی بناء پر ہم کہتے ہیں: کہ لوگوں کے اس مسئلہ میں اپنے امراء و حکام کے ساتھ کئی ایک احوال ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلی حالت: کہ عوام الناس کا جذبہ ایمانی اور سلطانی (شاہی) رعب و دبدبہ دونوں طاقتور ہوں اور یہ حالات (رعایا اور حاکم دونوں کے لئے) مکمل ترین، مناسب ترین اور بہترین ہیں۔

۲۔ دوسری حالت: بلکہ عوام میں ایمانی جذبہ اور اسی طرح شاہی قوت و سطوت، دونوں کمزور ہوں، اور یہ صورت پہلی حالت کے بالکل برعکس، معاشرے اور عوام کے لئے انتہائی ناگفتہ بہ اور خطرناک حالات کا باعث ہے اور نہ صرف عوام کے لئے، بلکہ اس خطرے کی

لیٹ میں خود حکام بھی آجائیں گے، اس لئے کہ لوگوں میں ایمانی جذبہ اور غیرت و حمیت کم ہونے کے ساتھ ساتھ جب حکام کا رعب و دبدبہ اور قانونی شکنجہ بھی کمزور پڑ جائے گا، تو زمین پر فکری بگاڑ اور اخلاقی و عملی انحطاط شروع ہو جائے گا (اور یہ ایک سلطنت کی ناکامی کی بدترین صورت ہے)

❧ تیسری حالت: کہ لوگوں میں ایمانی جذبہ اور حمیت و غیرت کمزور ہو اور ادھر شاہی قوت و دبدبہ طاقتور اور سلطانی غلبہ انتہائی مضبوط ہو، تو یہ حالات کے اعتبار سے پہلی دو انتہائی صورتوں کے درمیان کا مرتبہ ہے، کیونکہ جب سلطانی غلبہ قوت اور طاقت میں ہوگا، تو ملک میں ظاہری حالات اُمت کے لئے سازگار اور اچھے ہوں گے اور اگر بادشاہ یا حاکم وقت کی قوت اور گرفت ڈھیلی اور ماند پڑ جائے گی، تو اس وقت اُمت میں اُفراتفری اور اس کے بُرے اعمال کے بارے میں نہ پوچھے کہ بگاڑ اور فساد کا کیا عالم ہوگا۔

❧ چوتھی حالت: کہ عوام کا ایمانی جذبہ و حمیت تو مضبوط اور طاقتور ہو، مگر سلطانی (شاہی) رعب اور دبدبہ کمزور اور ماند پڑ جائے، تو یہ صورت، تیسری حالت کے بالکل برعکس ہے، ان حالات میں عامۃ الناس کی عام زندگی، ریاست کے وضع کردہ قوانین اور قواعد و ضوابط سے ہٹ کر غیر منظم اور غیر مربوط ہوگی اور معاشرے میں امن و امان کے مسائل کھڑے ہو جائیں گے، جیسا کہ اوپر تیسری حالت میں بیان ہو چکا ہے، لیکن انسان اور اس کے پروردگار کے مابین تعلق مضبوط، اکمل اور زیادہ پائیدار ہوگا۔

وَالطَّوَاعِیْنَ ۝ کَثِیْرَةً وَّرُوْءُسُهُمْ ۝ خَمْسَةَ ۝ اِلٰیْلِیْسُ ۝ لَعَنَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی ، وَمَنْ عَبَدَ وَهُوَ رَاضٍ ۝ وَمَنْ دَعَا النَّاسَ اِلٰی عِبَادَةِ نَفْسِهِ ۝ وَمَنْ اَدْعٰی شَیْئًا مِنْ عِلْمِ الْغِیْبِ ۝ ”اور طاغوت کی تعداد بہت زیادہ ہے، مگر ان کے سربراہ آردہ پانچ ہیں: ① ابلیس لعین۔ ② ایسا شخص، جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے اور وہ اس فعل پر خود بھی راضی ہو۔ ③ جو شخص لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلاتا ہو۔ ④ جو شخص علم غیب کا دعویٰ کرتا ہو۔ ⑤ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعتِ طاہرہ کے خلاف فیصلہ کرتا ہو۔

□ اور کلمہ (اَطْلُوا غِيْثُ) ”طاغوت“ کی جمع ہے اور اس کی وضاحت قبل ازیں گزر چکی ہے۔

□ (خَمْسَةُ) یعنی طاغوت کے قائدین اور اسکے بڑے چیلے چانٹنے پانچ ہیں۔

□ (ابلیس) وہ شیطان، جو رائدہ زرگاہ اور مردود ملعون، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم و مایوس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي الْيَوْمِ الدِّينِ﴾ (ص: ۷۸) ”اور تجھ پر روزِ جزاء و سزا (یعنی قیامت) تک میری لعنت ہے۔“ اور یہ ابلیس (شیطان) فرشتوں کے ساتھ، ان کی صحبت میں رہ کر، انہی کے سے عمل کیا کرتا تھا اور جب (اللہ جل شانہ کی جانب سے) حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا، تو اس کا خبثِ باطن اور اللہ کے حکم سے انکار اور تکبر و غرور ظاہر ہو گیا، اس نے سجدہ سے انکار کیا، تکبر کیا اور اس طرح سے وہ کافروں میں سے ہو گیا، لہذا اپنے اس انکار اور تکبر کی وجہ سے وہ اللہ عز و جل کی رحمت سے دھتکار دیا گیا اور ملعون ٹھہرا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبْلٰسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ﴾ (البقرہ: ۳۴) ”اور (اے نبی وہ وقت یاد کرو!) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، تو سوائے ابلیس (ملعون) کے (سب نے) سجدہ کیا، اس (ابلیس ملعون) نے (سجدہ کرنے سے) انکار کیا، اور تکبر کیا اور وہ (سجدہ سے) انکار کرنے والوں میں سے تھا۔“

□ مطلب یہ ہے کہ اس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے اور وہ اس بات پر راضی بھی ہو کہ اس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے، تو ایسا شخص ”طواغیت“ کے ساتھیوں بلکہ قائدین میں سے ہے۔ (وَالْعِبَادُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ) ..... اور خواہ یہ شخص، اس کے بعد اپنی زندگی ہی میں پوجا جائے، یا مرنے کے بعد اس کی پوجا کی جائے، اور مرتے وقت وہ خود اس فعل پر راضی ہو۔“

□ یعنی جو شخص لوگوں کو اپنی بندگی کی طرف بلاتا ہو، اور خواہ لوگ اس کی دعوت کے

باوجود اس کی عبادت نہ کریں، تب بھی وہ طَوَاعِیَّت کے ساتھیوں اور قَائِدِین میں سے ہے، خواہ اس کی یہ دعوت قبول کی جائے یا نہ۔

﴿۱۰﴾ (الْغَيْب) جو چیز انسان سے مخفی اور پوشیدہ ہو اور اس کی دو قسمیں ہیں:

### ① واقعاتی غیب ② مستقبل کا غیب

① واقعاتی غیب کو 'نسبی غیب' بھی کہا جاتا ہے، جو کسی ایک شخص کو معلوم ہوتا ہے، تو دوسرے سے 'مجهول' یعنی ممکن ہے کہ ایک بات یا واقعے کا کسی کو علم ہو اور دوسرا شخص اسی بات یا واقعے سے ناواقف، نااہل اور جاہل ہو۔

② اور غیب 'مستقبل' کو 'حقیقی غیب' بھی کہتے ہیں، جو کہ اللہ واحد و قہار کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں۔ یا جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے اپنے پیغمبروں میں سے کسی ایک کو اس پر مطلع کر دیتا ہے، تو جو شخص 'علم غیب' کی اس قسم کا دعویٰ کرے، تو وہ بلا شک کافر ہے، اس لئے کہ وہ اللہ عز و جل اور اس کے رسول ﷺ کو (اپنے اس دعویٰ سے) جھٹلاتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ (النمل: ۶۵)" (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیے: کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو کوئی بھی نہیں جانتا اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب انہیں اٹھایا جائے گا۔"

اور جب اللہ عز و جل اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کے سرداران کو اعلانیہ طور پر خبر دے دیں کہ آسمانوں اور زمین کے غیب (پوشیدہ چیز) کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا، تو اس کے بعد جو شخص اس علم غیب کا دعویٰ کرے گا، تو اس نے حقیقت میں اس 'خبر' کے بارے میں اللہ عز و جل اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلایا ہے۔

اور یہاں ہم ان مدعیین علم غیب کو کہیں گے، یہ کیسے ممکن ہے کہ تم تو علم غیب رکھتے ہو، اور اللہ کے نبی ﷺ غیب نہیں جانتے؟! کیا تم زیادہ شرف و فضیلت رکھتے ہو یا اللہ کے رسول

(ﷺ)؟ تو اگر وہ جواب میں یہ کہیں: ”کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے زیادہ شرف و فضیلت والے ہیں، تو وہ اپنے اس دعویٰ ہی سے کافر ہو جائیں گے، اور اگر وہ یہ جواب دیں کہ وہ (اللہ کا رسول ﷺ) اشرف و افضل ہیں، تو پھر ہم یہ کہیں گے: ”اگر یہ بات ہے تو پھر آپ (ﷺ) کو علم غیب سے کیوں پس پردہ رکھا گیا ہے، جبکہ تم غیب جانتے ہو؟“!

اور اللہ عز و جل نے اپنی ذات کے متعلق یہ فرمایا ہے: ﴿عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا﴾ (الحج: ۲۷، ۲۸)

”وہ اللہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو آگاہ نہیں کرتا، سوائے ایسے رسول کے جسے وہ (کوئی غیب کی بات بتانا) پسند کرے، پھر وہ اس (وحی) کے آگے اور پیچھے محافظ (فرشتے) لگا دیتا ہے۔“

اور یہ دوسری آیت کریمہ بھی علم غیب کے مدعی (دعویٰ کرنے والے) کے کفر پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی قوم کے سرکردہ اور سربراہ و دروہ لوگوں کو اعلانیہ طور پر یہ بات کہہ دیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنَّا أَتَيْنَا إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْنَا﴾ (الانعام: ۵۰) ”(اے محمد ﷺ!) آپ ان سے کہئے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ ہی میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔“

وَمَنْ حَكَمَ بِغَيْرِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ ۖ

”اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت طاہرہ کے خلاف فیصلہ کرتا ہو۔“

□۷۷ اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت طاہرہ اور اس کے حکم کے مطابق فیصلہ ’توحید ربوبیت‘ کی قبیل سے ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نافذ اور جاری کرتا ہے، جس

کا اس جل شانہ کی ربوبیت، اس کی کمال بادشاہی اور کمال تصرف و اختیار، تقاضا کرتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پیشواؤں کا، جن کی، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت اور حکم سے ہٹ کر پیروی کی جاتی ہے، اُن کے پیروکاروں کے ہاں، ان کا نام ارباب (رب کی جمع) رکھا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (التوبہ: ۳۱)

”انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی، حالانکہ اُن کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

☆..... تو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا نام، جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے خلاف پیروی کئے جاتے ہیں، ’ارباب‘ (جو کہ رب کی جمع ہے) لیا ہے، حالانکہ ان کے پیروکاروں نے، ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مُشْرِعِین (یعنی شریعت کے اصول و احکام کو متعین اور ان کی وضاحت کرنے والے، جو کہ صرف اور صرف اللہ جل شانہ کا حق ہے) ٹھہرایا ہے۔ جبکہ اللہ نے ان کے متبعین (یعنی پیروکاروں) کو عِبَاد (یعنی اُن کی عبادت کرنے والے) کا نام دیا ہے، اس اعتبار سے کہ جو انہوں نے اُن کے سامنے انتہاء درجے کی عاجزی اور تواضع اختیار کرتے ہوئے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کی مخالفت، میں ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی ہے۔“

اور اسی بات کی وضاحت میں، حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: کہ ان مُتَّبِعِین (پیروکاروں) نے اپنے ان مُتَّبِعِین (پیشواؤں) کی عبادت تو نہیں کی؟ تو اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: «بَلْ إِنَّهُمْ حَرَّمُوا عَلَيْهِمُ الْحَلَالَ، وَأَحَلُّوا لَهُمُ الْحَرَامَ فَاتَّبَعُوهُمْ فَبَلَكَ عِبَادَتُهُمْ إِيَّاهُمْ» (۷۳) ”بلکہ ان لوگوں نے ان (اپنے پیروکاروں) پر (اللہ تعالیٰ کی) حلال کردہ چیزوں کو حرام ٹھہرایا، اور حرام کردہ چیزوں کو حلال

قرار دیا، تو ان پیروکاروں نے ان کی (اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں) اس شریعت سازی پر سر تسلیم خم کیا تو یہ ان کی اپنے (احبار و رہبان) یعنی مذہبی اور روحانی اماموں اور پیشواؤں کی بندگی کرنا ہے۔“

☆..... جب آپ نے یہ عقیدہ کی بات اچھی طرح سے سمجھ لی ہے، تو یہ جان لیجئے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ یا فتویٰ نہ دے اور اس فیصلے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی اور (طاغوت) کی طرف لے جانا چاہے، تو ایک تو ایسے شخص کے ایمان کی نفی کے بارے میں آیات کریمہ وارد ہوئی ہیں اور دوسرے اس کے کفر، ظلم اور فسق کے اثبات پر قرآن حکیم میں آیات ذکر ہوئی ہیں: (وَالْعِيََاذُ بِاللّٰهِ) پہلی قسم: اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کرنے یا فتویٰ دینے والے کے

ایمان کی نفی کے بارے میں سورۃ النساء کی یہ آیات کریمہ ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يَرِيْدُوْنَ اَنْ يَتَّخِذُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَكْفُرُوْا بِهٖ وَيَرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يَضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۚ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعٰلَوْا اِلَى مَا اُنْزِلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاٰهُمْ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۚ فَكَيْفَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا اِحْسٰنًا وَتَوْفِيْقًا ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعَظِّمْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ۚ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّٰبًا رَّحِيْمًا ۚ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يَحْكُمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (۶۵:۲۶۰)

”(اے نبی ﷺ!) آپ نے ان لوگوں کے حال پر غور کیا، جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے، اس پر بھی ایمان لائے ہیں اور اس پر بھی، جو آپ سے پہلے اتارا گیا تھا، مگر چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں یہ



حکم دیا گیا تھا، کہ وہ 'طاغوت' کے فیصلے تسلیم نہ کریں اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں گمراہ کر کے بہت دور تک لے جائے، اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ، جو اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے اور رسولؐ کی طرف آؤ، تو آپؐ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپؐ کے پاس آنے سے گریز کرتے ہیں، پھر اس وقت ان کا کیا حال ہوتا ہے، جب ان کے اپنے کرتوتوں کی بدولت ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے؟ وہ آپؐ کے پاس اللہ (تعالیٰ) کے نام کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی اور باہمی موافقت کے سوا کچھ نہ تھا، ایسے لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے، سو آپؐ ان سے لاعراض کیجئے اور نصیحت کیجئے، اور ایسی بات کہئے، جو ان کے دلوں میں اتر جائے، اور (انہیں بتلائیے کہ) ہم نے رسولؐ بھی بھیجا ہے، تو اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے، اور جب انہوں نے اپنے رب پر ظلم کر لیا تھا، تو اگر وہ اس وقت آپؐ (ﷺ) کے پاس آجاتے، اور اللہ (تعالیٰ) سے بخشش طلب کرتے اور رسولؐ بھی ان کے لئے (اللہ) سے بخشش طلب کرتا، تو یقیناً (وہ) اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے، (اے محمد ﷺ!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے تنازعات (باہمی جھگڑوں) میں آپؐ (ﷺ) کو حکم (فیصلہ کرنے والا) تسلیم نہ کر لیں، پھر آپؐ (ﷺ) جو فیصلہ کریں، اس کے متعلق اپنے دلوں میں ٹھن بھی محسوس نہ کریں اور اس فیصلہ پر پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔“

تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں ایمان کے ان دعویداروں کا..... جبکہ وہ حقیقت میں منافق ہیں۔ درج ذیل صفات کے ساتھ ذکر کیا ہے:

**پہلی صفت:** وہ چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے اور مقدمات نپٹانے کے لئے انہیں 'طاغوت' کی طرف لے جائیں اور ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ (ﷺ) کے حکم کی مخالفت کرے وہ 'طاغوت' ہی تو ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ (ﷺ) کے حکم کی مخالفت ہی اس ذات کے خلاف سرکشی، بغاوت اور اس کے حکم پر ظلم و زیادتی ہے، جس کے لئے ہی حکم ہے اور ہر حکم اور معاملہ اسی ذات کی طرف ہی لوٹنے والا ہے اور وہ اللہ معبودِ برحق ذات

ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿اَلَا لَهٗ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الاعراف: ۵۴) ”خبردار ہو! اُسی کی خلق ہے اور اُسی کا امر ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔“

❦ دوسری صفت: جب وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نازل کردہ شریعت اور فیصلے کی طرف بلائے جاتے ہیں، تو وہ اس طرف آنے سے گریز کرتے ہیں اور صاف پہلو تہی برتتے ہیں۔

❦ تیسری صفت: جب انہیں کوئی ایسی مصیبت آ پہنچے، جو ان کے اپنے ہاتھوں ہی کی شامت اعمال ہوتی ہے اور اس میں ان کے کرتوتوں کا بھانڈا پھوٹ جانا بھی شامل ہے، تو وہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آ کر اللہ کے نام کی (جھوٹی قسمیں) کھانا شروع کرتے ہیں، ”کہ وہ اس عمل کے درے صرف اور صرف اچھائی اور صلاح و فلاح کا ارادہ رکھتے تھے۔“ یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے آج کے دور میں کوئی اسلامی احکام کا انکار کر دے اور اسلام کے بالکل مخالف اور متضاد قوانین کے نفاذ کے بعد، انہی اسلام کے معارض و مخالف قوانین کے ساتھ یہ گمان اور دعویٰ کرتے ہوئے فیصلے کرے، کہ ان مروجہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنا ہی عصر حاضر کے حالات کا تقاضا اور معاشرے کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے۔

☆..... پھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ایمان کے (ان جھوٹے) مدعیین اور ان مذکورہ صفات سے متصف (منافقین) کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ وہ۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ ان کے دلوں کی باتوں سے بخوبی آگاہ ہے اور منہ سے، جو بولتے ہیں اس کے برخلاف، جو کچھ وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، اسے بھی وہ خوب جانتا ہے (کہ کہیں یہ لوگ دھوکے میں نہ رہیں)..... اور اپنے نبی (ﷺ) کو یہ حکم فرمایا: کہ ان لوگوں کو نصیحت کیجئے اور ان کے دلوں میں اتر جانے والی موثر بات ان سے کہئے..... پھر اللہ جل شانہ نے پیغمبروں (ﷺ) کو اس دنیا میں بھیجے کی یہ حکمت و مصلحت بیان فرمائی کہ وہی متبوعین (جن کی پیروی کی

جائے) ہستیاں ہیں، ان کے علاوہ لوگوں میں سے کوئی بھی واجب الطاعت نہیں کہ، جس کی اطاعت و اتباع کی جانی چاہئے، خواہ لوگوں میں کتنے ہی مضبوط افکار، بلند کردار اور فہم و فراست میں وسعت رکھنے والے امام اور پیشوا موجود ہوں۔“..... پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے لئے، اپنی اس ربوبیت کی قسم کھائی ہے، جو ربوبیت خاص ترین انواع میں سے ہے، اور رحمت عالم ﷺ کی رسالت کی سچائی اور صحت کو شامل ہے..... اللہ جل شانہ نے اپنی اس صفت ربوبیت کی انتہائی پختہ قسم کھائی (جس سے یہ بات عیاں ہوئی ہے) کہ تین امور پائے جانے کے سوا، کسی کا ایمان صحیح اور مکمل نہ ہوگا:

﴿پہلا: کہ ہر جھگڑے اور مقدمے کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں لے جایا جائے۔

﴿دوسرا: کہ آپ (ﷺ) کے دیئے ہوئے فیصلے پر شرح صدر ہو، اور اس بارے میں دلوں کے اندر معمولی تنگی یا خلش نہ رہے۔

﴿تیسرا: کہ جو حکم آپ (ﷺ) کی عدالت سے صادر ہو، اس کو دل و جان سے قبول کیا جائے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ اور انحراف کے اسے من و عن نافذ کر دیا جائے۔

﴿دوسری قسم: اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلے نہ کرنے والے دوسری قسم کے لوگوں کی مثالیں اللہ جل شانہ کے درج ذیل ارشادات میں ذکر ہوئی ہیں:

(۱) ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (المائدہ: ۴۴)

”اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں۔“

(ب)..... ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (المائدہ: ۴۵)

”اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں۔“

(ج) ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (المائدہ: ۴۷)

”اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی فاسق ہیں۔“

اور یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان آیات میں مذکور تینوں اوصاف ایک ہی موصوف

(شخص) پر چسپاں ہوتے ہیں؟ مطلب یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہ کافر بھی ہے، ظالم بھی ہے اور فاسق بھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو ظلم و فسق کے اوصاف سے بھی موصوف ٹھہرایا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (البقرة: ۲۵۴) ”اور کافر لوگ وہی ظالم ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ﴾ (التوبہ: ۸۴)

”بے شک انہوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے، اور وہ اس حال میں مرے ہیں کہ وہ فاسق تھے۔“

تو اللہ تعالیٰ کے ان فرامین کی رُو سے ہر کافر، ظالم اور فاسق بھی ہوتا ہے..... یا پھر یہ تینوں اوصاف الگ الگ ان موصوفین (اشخاص) پر، ان کے اللہ جل شانہ کے نازل کردہ حکم سے پہلو تہی برتنے اور اس سے اعراض و انحراف کے حساب سے ان پر چسپاں ہوں گے اور یہی مفہوم میرے نزدیک صحت کے زیادہ قریب ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ) ..... لہذا

ہم ان آیات کریمہ کے مفہوم کی وضاحت میں کہیں گے کہ جو شخص تو اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت کو معمولی سمجھتے ہوئے یا اسے حقیر جانتے ہوئے یا یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ اس کے علاوہ دیگر مروجہ قوانین و دساتیر زیادہ مناسب اور درست ہیں اور اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ فائدہ مند بھی ہیں، اس کے خلاف فیصلہ دے، تو وہ شخص کافر ہے، جس کا کفر اس کو ملت اسلامیہ سے نکال باہر کرے گا اور ایسے ہی لوگوں میں سے وہ (جو اپنے تئیں عہد جدید کے مفکرین، دانشور اور ترقی پسند) بھی ہیں، جو لوگوں کی خاطر شریعت اسلامیہ کی تشریعات و تعلیمات کے صریح منافی قوانین وضع کرتے اور خود ساختہ تشریعات کو فروغ دیتے ہیں، تاکہ یہ ایک مستقل ملکی دستور و آئین کی شکل اختیار کر سکیں اور عامۃ الناس کے لئے ان کے مطابق زندگی گزارنا آسان اور ممکن ہو سکے اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ شریعت طاہرہ کے صریح مخالف ان تشریعات (اور آئینی شقوں) کو یہ اعتقاد رکھتے ہوئے محض اس لئے وضع کرتے ہیں، کہ یہ

مخلوق کے حق میں زیادہ باعث صلاح و فلاح اور منفعت بخش ہیں۔

☆..... اور یہ بات عقلی ضرورت اور انسان کے جبلی اور فطری تقاضوں کے اعتبار سے بھی معلوم شدہ ہے کہ وہ ایک راستے کو چھوڑ کر اس کے مخالف کسی بھی دوسرے راستے کو اس وقت تک نہیں پکڑتا، جب تک وہ یہ اچھی طرح سے نہ سمجھ لے کہ جس راستے کو اس نے اختیار کیا ہے وہ اس پہلے راستے کی نسبت، جس کو اس نے ترک کیا ہے، زیادہ بہتر بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔ (لہذا ایسا اعتقاد رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف فیصلے کرنا اور یہ گمان رکھنا کہ یہ جدید اور اختراعی نظام، شریعت اسلامی کے لائے ہوئے نظام سے زیادہ پائیدار، بہتر اور منفعت بخش ہے، تو ایسا اعتقاد اور گمان رکھنے والا شخص بلا شک و شبہ کافر ہے۔) (الغیاض باللہ)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت طاہرہ کے مطابق فیصلہ نہ کرے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام کو کم تر اور حقیر بھی نہ سمجھتا ہو اور نہ یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ان کے علاوہ دیگر نظام و احکام ان شرعی و سماوی احکام سے زیادہ بہتر اور پائیدار ہیں، تو ایسا شخص کافر تو نہیں، ظالم ہے، اور ظلم کے بھی کئی ایک مراتب ہیں، لہذا اس شخص کے ظلم کا درجہ اس محکوم بہ (جس چیز کے ذریعے حکم لگایا گیا ہو) اور وسائل حکم (کہ حکم لگانے کے لئے کون سے وسائل اور ذرائع اختیار کئے گئے ہیں) کے مطابق متعین کیا جائے گا (کہ اس نے فیصلہ کیسا دیا ہے اور فیصلہ دینے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا ہے اور کس چیز سے رہنمائی لی ہے؟)

اور وہ شخص، جس نے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کیا ہو، نہ اس کو معمولی گردانتے ہوئے، نہ ہی حقیر اور کم تر سمجھتے ہوئے اور نہ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ اس کے مقابلے میں دیگر وضعی و اختراعی احکام زیادہ درست اور مخلوق کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں، بلکہ اس نے یہ فیصلہ محض کسی ظالم و جابر حاکم وغیرہ کے دباؤ میں آ کر یا پھر کسی دنیوی فائدے (رشوت وغیرہ) کے حصول کے لئے دیا ہو، تو ایسا شخص بھی کافر نہیں، فاسق (اللہ تعالیٰ کی

اطاعت سے نکل جانے والا) ہے اور 'ظلم' کی طرح 'فسق' کے بھی درجات ہیں اور یہ شخص 'فسق' کے کون سے درجہ پر ہے؟ تو اس کا تعین اس معاملے کی جانچ پرکھ سے ہوگا کہ اس نے کیا فیصلہ دیا اور یہ فیصلہ کرنے کے لئے اس نے کون سے ذرائع و وسائل اختیار کئے؟

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ رَحْمَہُ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں جو اپنے احبار (مذہبی پیشواؤں) اور رہبان (روحانی رہنماؤں) کو اللہ تعالیٰ کے سوا ارباب پکڑ لیتے ہیں، دو قسم کے حکم لگائے ہیں:

ان میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں: جو یہ اچھی طرح جان لیں کہ ان کے مذہبی پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو بدل کر رکھ دیا ہے اور اس تبدیلی کا علم رکھنے کے باوجود وہ اپنے ان مشائخ کی پیروی میں اندھے ہو کر اور یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے، ان کی اتباع کرتے ہیں..... تو یہ کفر ہے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے 'شُرک' قرار دیا ہے۔ (والعیان باللہ من ذلک)

اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں: جو اپنے مذہبی پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں کے حرام کو حلال کرنے اور حلال کو حرام قرار دینے پر ایمان و اعتقاد تو رکھتے ہیں۔ "یہ عبارت اسی طرح سے ہی شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے منقول ہے۔" مگر اُن کی یہ اطاعت اللہ تعالیٰ کی معصیت میں ایسے ہی ہے، جیسے عام حالات میں ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا یہ اعتقاد رکھتے ہوئے مرتکب ہوتا ہے کہ اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہے، تو ایسے لوگوں کا حکم اپنے جیسے گناہ گاروں کا سا حکم ہے۔

☆..... اور یہاں عام تشریحی مسائل اور اُس معین (خاص) مسئلہ میں فرق ہے، جس میں قاضی (جج وغیرہ) اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے، کیونکہ وہ مسائل جو 'عام تشریحی' مسائل کہلاتے ہیں وہ گذشتہ تقسیم کی ذیل میں قطعاً نہیں آتے، یہ صرف پہلی قسم

کے حکم کے تحت آتے ہیں (جن کا حکم کفر کا ہے)۔ (وَالْفِعَالُ بِاللَّهِ!) اس لئے کہ ان عام تشریحی مسائل میں اسلامی احکام کے مخالف فیصلہ دینے والا، (اپنی شریعت سازی میں) صرف اسلام کی مخالفت نہیں کرتا، بلکہ وہ ان فیصلوں کو شرعی حیثیت، یہ عقیدہ رکھتے ہوئے دیتا ہے کہ یہ اسلام (یعنی اللہ کی طرف سے نازل کردہ احکامات) کی نسبت زیادہ باعث صلاح و فلاح اور بندوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں، جیسا کہ قبل ازیں اس بات کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

☆..... اور یہ مسئلہ (اس سے میری مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف فیصلہ دینے اور ایسا فیصلہ دینے والے شخص کے بارے میں شرعی حکم کا مسئلہ ہے) ان بڑے مسائل میں سے ایک ہے، جن کے بارے میں موجودہ دور کے حکام اور ملکوں کے سربراہان کڑے امتحان سے گزر رہے ہیں، تو ایسی صورت حال میں ایک حقیقت پسند اور زیرک شخص پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ان پر ایسا حکم لگانے میں کبھی جلدی نہ کرے، جس حکم کے وہ حقیقت میں مستحق نہ ہوں، یہاں تک کہ اس پر حق بات واضح ہو جائے، اس لئے کہ یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعاء کرتے ہیں کہ وہ اہل اسلام کے حق میں ان کے تمام حکام اور سربراہان کی اصلاح فرمادے!۔ آمین

☆..... اسی طرح اُس شخص پر، جسے اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت سے نوازا ہے، یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان حکام کے سامنے اصل مسئلہ کھول کر بیان کرے، تاکہ ان پر (ان کے رب کے حضور اور پھر رعایا کے ہاں) حجت قائم ہو اور اس طرح سے اصل اور صحیح راستہ ان کے لئے وا ہو جائے اور ان کے لئے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں کوئی راہ فرار بھی باقی نہ رہے، پھر اس حق کی وضاحت کے بعد، جو ہلاکت اور تباہی کے کھڈ میں گرنا چاہتا ہو، وہ کسی دلیل پر (عَلَى وَجْهِ الْبَصِيرَةِ) ہلاک ہو اور جو سعادت مندی کی زندگی گزارنے کے لئے زندہ رہنا چاہے، تو وہ بھی کسی دلیل پر پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ زندگی گزارے، لہذا وہ صاحب علم (داعی)، حق کے بیان میں کسی 'کسر نفسی' کا شکار نہ ہو، اور نہ اس بارے میں وہ

کسی سے ڈر محسوس کرے، اس لئے کہ عزت و وقار (سارے کا سارا) اللہ جل شانہ کے لئے، اور پھر اس کے رسول ﷺ کے لئے اور پھر تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔“

وَالدَّلِيلُ ۝ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۝ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ ۝ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى ۝﴾ (البقرة: ۲۵۶) وَهَذَا مَعْنَى لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَفِي الْحَدِيثِ: (۴) «رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ ۝ وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ ۝ وَذُرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ» ۝

”اور اس بات کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ”دین کے معاملہ میں کوئی زور و برستی نہیں ہے، کیونکہ ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے، تو (اب) جو شخص طاعوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (تعالیٰ) سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“ اور یہی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں) کا صحیح معنی و مفہوم ہے۔ اور حدیث شریف میں رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گمراہی ہے: ”اس دین کی اصل (بنیاد) اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے، اور اس کا اعلیٰ ترین مرتبہ و مقام اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہے۔“

□ ۝ مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے اور طاعوت سے انکار کے وجوب پر بڑی واضح دلیل اللہ جل مجدہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۝﴾

□ ۝ یعنی دین کے روز روشن کی طرح واضح ہونے اور اس کے ظاہر و باہر (روشن) دلائل کی موجودگی کی بناء پر اب اس کو منوانے اور قبول کروانے میں کسی پر کوئی جبر اور زبردستی نہیں، اسی لئے اللہ جل جلالہ نے بعد میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ”کہ ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔“

تو جب ہدایت اور حق بات، سرکشی اور گمراہی سے واضح ہو چکی، تو اب ہر تند رست اور توانا (یعنی زیرک اور عقلمند) شخص پر لازم ہے کہ وہ سرکشی و گمراہی کے بجائے ہدایت اور سچائی کا دامن پکڑے۔“



﴿۳۱﴾ آیت کریمہ میں، اللہ جل شانہ نے ”اللہ تعالیٰ پر ایمان سے قبل، طاعت سے کفر کے ساتھ آغاز فرمایا ہے۔ اس لئے قاعدہ ہے کہ کسی چیز کے وجود کے اثبات سے پہلے اس کے موانع کا تدبیر باب، اس ثابت کی جانے والی چیز کے کمال کی دلیل ہے۔ اور اسی بناء پر یہ بھی کہا جاتا ہے: ”التَّخْلِيَةُ قَبْلَ التَّحْلِيَةِ“ کہ برتن میں کوئی چیز ڈالنے سے پہلے برتن کو خالی کرنا ضروری ہے۔“

﴿۳۲﴾ آیت مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے پورے طور پر ایک مضبوط چیز کو تھام لیا، اور آیت میں ﴿الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى﴾ سے مراد دین اسلام ہے۔ آپ ذرا آیت کریمہ کے ان الفاظ پر غور کیجئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿فَقَدْ اسْتَمْسَكَ﴾ اور یہ نہیں فرمایا: ﴿فَقَدْ تَمَسَكَ﴾ کیونکہ لفظ (الْاِسْتِمْسَاكُ) معنی کی ادائیگی کے اعتبار سے (الْتَمَسَكَ) کی نسبت زیادہ قوت رکھتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ انسان بسا اوقات کسی چیز کے ساتھ (تَمَسَكَ) تو رکھتا ہے، (اسْتِمْسَاكُ) نہیں، (اور جو اسْتِمْسَاكُ) رکھتا ہے، وہ (تَمَسَكَ) ضرور رکھے گا۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ)

﴿۳۳﴾ شیخ الاسلام امام محمد بن عبد الوہابؒ نے اس مذکورہ حدیث شریف سے اس بات پر دلیل لینی چاہی ہے کہ ہر چیز کی ایک چوٹی (سر اور اصل) ہوتی ہے، اور دین کی اصل چیز، جسے حضرت محمد ﷺ لائے ہیں وہ اسلام ہے۔

﴿۳۴﴾ عَمُودَةُ الصَّلَاةِ: اور اس دین کا ستون نماز ہے، اس لئے کہ دین، اسے قائم کئے بغیر خود قائم نہیں رہ سکتا اور اسی بناء پر راجح قول کے مطابق نماز کا تارک ’کافر‘ ہے، اور بے نماز کا ’اسلام‘ باقی نہیں رہتا۔

﴿۳۵﴾ وَذَرُوهُ سَنَامِهِ ..... الخ یعنی دین اسلام کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین مرتبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہے، اور یہ اس لئے کہ جب انسان اپنے آپ کی اصلاح کر لیتا ہے تو وہ دوسرے کی اصلاح کا بیڑہ (ذمہ) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد (غایت درجے کی محنت و کوشش)

کے ذریعے اٹھاتا ہے، تاکہ وہ اقامت دین کا فریضہ ادا کر سکے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی دھرتی پر اللہ تعالیٰ کا نام سر بلند ہو جائے۔ تو جو شخص کفار سے محض اس غرض سے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ (اور اس کا دین) سر بلند ہو تو وہ حقیقت میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے، نیز اس نے اپنے اس مبارک عمل کی وجہ سے، اسلام کا اعلیٰ، بلند ترین مجاہد اور سپوت ہونے کا اعزاز بھی پالیا، اس لئے کہ کفر پر اسلام کی عظمت و سطوت اور برتری اسی عظیم مجاہد کے سبب ہوئی۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ ﴿  
 ”اور ہر بات کی حقیقت اللہ خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور سلام ہوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اور آپ کی آل پر (پورے خاندان پر جو آپ پر ایمان لائے) اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر۔“

□ ﴿ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ! نے اپنے اس رسالہ کا اختتام حقیقی علم کو اللہ جل شانہ کی طرف لوٹاتے ہوئے اور اس کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر درود و سلام بھیجتے ہوئے کیا ہے، اور اسی بابرکت اختتام کے ساتھ یہ مفید علمی کاوش ”الْأَصُولُ الثَّلَاثَةُ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهَا“ کہ دین کے تین اصول اور ان سے متعلقہ مسائل“ پایہ تکمیل کو پہنچی، ہم اللہ عز و جل کی بارگاہ میں سراپا ملتی ہیں کہ وہ اس رسالہ کے مؤلف رَحِمَہُ اللہ! کو بہتر اجر و ثواب سے نوازے، اور ہمیں بھی اس وافر اجر و ثواب سے بڑا حصہ مرحمت فرمائے! اور ہمیں اور مؤلف رحمہ اللہ کو اپنے عزت کے گھر (جنت الفردوس) میں ایک جگہ جمع فرمائے، بے شک وہ بڑا صاحبِ جود و سخا اور کریم ذات ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَصَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّم

عَلٰی نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

## حوالہ جات

(۱) امام سیوطیؒ نے اس حدیث کو، کتاب 'المجامع الصغیر' کے جلد ۴، صفحہ ۱۴۷ پر 'الرباوی' کی طرف منسوب کیا ہے اور خطیب بغدادیؒ نے 'المجامع' کے جلد ۲، صفحہ ۶۹ پر اسے نکالا ہے، نیز یہ حدیث بہت سے طرق (آسانید) اور متعدد الفاظ سے نکالی گئی ہے، اور جب ہمارے استاذ محترم علامہ محمد الہمیین رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس حدیث کی (حقیقت اور اصل کی) بابت پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب میں فرمایا، "اس حدیث کی صحت کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے، جن میں سے بعض اہل علم جیسے امام نووی رحمہ اللہ ہیں، ان کو صحیح اور قابل احتجاج جانا ہے، جبکہ اہل علم میں سے دیگر نے اسے 'ضعیف' قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس حدیث کو علمائے کرام رحمہم اللہ نے اسے قبول کیا ہے، اور اسے اپنی کتابوں (کے خاص طور پر آغاز) میں رقم کیا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے، کہ اس حدیث کی کوئی اصل ہے) یہاں، ہمارے استاذ کرم رحمہ اللہ کی کتاب (العلم) کا اختتام ہوا، اللہ جل شانہ، اس کی نشر و اشاعت آسان فرمائے، آمین!

(۲) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب دعاء النبی ﷺ إلى السلام والنوبة..... "صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب: فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۳) صحیح مسلم: کتاب العلم، باب: مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً

(۴) صحیح مسلم کتاب الإمارة، باب: فضل إعانة الغازی فی سبیل اللہ بمرکوب وغیرہ

(۵) صحیح بخاری، کتاب استتابة المرتدين والمعاندين..... "صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب: غزوة أحد

(۶) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ طور کے تحت۔

(۷) صحیح بخاری، کتاب القدر..... صحیح مسلم، کتاب القدر

(۸) صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب: الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ

(۹) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' کے، کتاب العلم اور باب مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ

كَرَاهِيَةً أَنْ لَا يَفْهَمُوا میں اور امام مسلمؒ نے اپنی 'صحیح' کے کتاب الایمان اور باب: مَنْ مَاتَ لَا

يُشْرِكُ بِاللَّهِ دَخَلَ الْجَنَّةِ میں اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(۱۰) اسے امام بخاریؒ نے کتاب التوحید، باب: يَأْتِيهَا الرُّسُولُ يَلْعَنُ..... الاية اور امام مسلمؒ نے کتاب الایمان،

باب: كون الشرك أفتح الذنوب میں روایت کیا ہے۔

(۱۱) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الایمان، باب: من مات لا يشرك بالله شيئا دخل الجنة میں روایت کیا ہے۔

(۱۲) اسے امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں، سورة البقرہ کی اس آیت ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا...﴾ کے تحت ذکر کیا ہے۔

(۱۳) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الایمان، باب بیان ارکان الایمان والا سلام میں نکالا ہے۔

(۱۴) حدیث جبریلؑ کی تخریج قبل ازیں گزر چکی ہے، مزید دیکھیے: ہمارے فضیلۃ الشیخ رحمہ اللہ کی شرح الحدیث فی مجموع الفتاویٰ والرسائل، جلد ۳، صفحہ ۱۳۵۔

(۱۵) امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو کتاب الدعوات، باب فضل الدعاء میں نکالا ہے اور کہا ہے کہ اس طریق سے یہ حدیث غریب ہے۔ (عام محدثین کے نزدیک یہ حدیث 'ضعیف' ہے۔ (واللہ اعلم) مترجم (۱۶) اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں نکالا ہے، دیکھیے ج ۱، ص ۲۹۳..... اور ابویسٰیٰ ترمذیؒ نے اپنی جامع ترمذی میں ج ۴، ص ۵۷۵۔

(۱۷) اس حدیث کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

(۱۸) اسے امام مسلمؒ نے اپنی 'صحیح' میں کتاب الذکر والدعاء اور باب التعوذ من سوء القضاء ودرك الشقاء وغیرہ میں نکالا ہے۔

(۱۹) اسے امام احمدؒ نے اپنی 'المسند' میں (ج ۲ ص ۲۵) اور امام نسائیؒ نے (ج ۸ ص ۶۷۷) پر اپنی 'سنن' میں نکالا ہے۔

(۲۰) اسے امام احمدؒ نے اپنی 'المسند' میں (ج ۴ ص ۲۱۷) پر نکالا ہے اور 'سنن ابی داؤد' حدیث نمبر ۳۸۹۱ اور 'سنن ابن ماجہ' حدیث نمبر ۲۵۲۲

(۲۱) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الصلاة اور باب: ما يقال في الركوع والسجود میں نکالا ہے۔

(۲۲) اسے امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام اور باب: الله تعالى کے اس فرمان: ﴿أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا﴾ میں نکالا ہے۔

(۲۳) اسے امام بخاریؒ نے 'کتاب الفتن'، باب: تكون الفتنة القاعد فيها..... الخ اور امام مسلمؒ نے

کتاب الفتن، باب نزول الفتن کما وقع القطر میں نکالا ہے۔

(۲۴) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الحدود، باب: قطع السارق الشریف وغیرہ میں روایت کیا ہے۔

(۲۵) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الفتن، باب: الخسف بالجیش الذی یوم البیت میں نکالا ہے۔

(۲۶) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الجہاد، باب: الامداد بالملئکة فی غزوة بدر میں نکالا ہے۔

(۲۷) اس حدیث کو امام مسلمؒ نے کتاب الاضاحی، باب: تحریم الذبیح لغير الله تعالىٰ ولعن فاعله میں نکالا ہے۔

(۲۸) امام بخاریؒ نے اس کو کتاب الأدب، باب: من کان یومن بالله والیوم الآخر فلا یوذ جارہ اور امام مسلمؒ نے کتاب اللقطة، باب: الضیافة میں نکالا ہے۔

(۲۹) امام بخاریؒ نے اس کو کتاب البیوع، باب: ما جاء فی قوله تعالىٰ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ﴾ اور امام مسلمؒ نے کتاب النکاح، باب: الصداق وجواز کونه تعلیم القرآن..... الخ میں نکالا ہے۔

(۳۰) اسے امام بخاریؒ نے کتاب القدر، باب: إلقاء العبد النذر إلى القدر میں اور امام مسلمؒ نے کتاب النذر، باب: النهی عن النذر..... الخ میں نکالا ہے۔

(۳۱) اسے امام بخاریؒ نے کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فيما لا یملک وفي معصية، میں روایت کیا ہے۔

(۳۲) اس حدیث کی تخریج قبل ازیں گزر چکی ہے۔

(۳۳) اسے امام بخاریؒ نے کتاب الایمان، باب: قول النبی (بنی الاسلام علی خمس ..... الخ) میں اور امام مسلمؒ نے کتاب الایمان، باب: بیان أركان الإسلام..... الخ، میں روایت کیا ہے۔

(۳۴) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے کتاب الصوم، باب: من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم، میں نکالا ہے۔

(۳۵) اسے امام ترمذیؒ نے کتاب الایمان، باب: ما جاء فیمن ترك الصلاة، میں نکالا ہے۔

(۳۶) اس حدیث کی تخریج قبل ازیں گزر چکی ہے۔

(۳۷) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے کتاب الجنائز، باب: إذا أسلم الصبی... الخ اور امام مسلمؒ نے

کتاب القدر، باب: مامن مولود یولد الا... الخ میں نکالا ہے۔

(۳۸) امام بخاری نے کتاب التفسیر، سورة الطور ج ۴ ص ۱۸۳۹ پر نکالا ہے۔

(۳۹) اسے امام بخاری نے کتاب الجمعة، باب: رفع الیدین فی الدعاء، میں اور امام مسلم نے

کتاب الاستسقاء، باب: الدعاء فی الاستسقاء میں نکالا ہے۔

(۴۰) اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائكة میں اور امام مسلم نے:

کتاب الإیمان، باب: الإسرائاء برسول الله ﷺ میں نکالا ہے۔

(۴۱) صحیح بخاری کتاب بدء الخلق، حدیث نمبر ۳۲۳۲، ۳۲۳۳

(۴۲) اس حدیث کی تخریج قبل ازیں گزر چکی ہے۔

(۴۳) اسے امام بخاری نے: کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائكة میں اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں،

کتاب البر والصلة اور باب: إذا أحب الله عبدا حبه إلی عبادہ میں نکالا ہے۔

(۴۴) اسے امام بخاری نے کتاب الجمعة، باب: الاستماع إلی الخطبة میں اور امام مسلم نے کتاب

الجمعة اور باب: فصل التهجير يوم الجمعة میں نکالا ہے۔

(۴۵) اسے امام بخاری نے کتاب التوحید، باب: کلام الله مع الانبياء يوم القيامة، میں، اور امام

مسلم نے کتاب الإیمان، باب: أذن أهل الجنة منزلاً، میں نکالا ہے۔

(۴۶) اسے امام بخاری نے کتاب القبلة، باب: التوجه نحو القبلة حيث كان میں، اور امام مسلم نے

کتاب المساجد، باب: السهو فی الصلاة والسجود له، میں نکالا ہے۔

(۴۷) اسے امام بخاری نے کتاب الرقاق، باب: كيف المحشر میں، اور امام مسلم نے کتاب الجنة،

باب: الدنيا وبيان المحشر يوم القيامة میں نکالا ہے۔

(۴۸) اسے امام بخاری نے کتاب المظالم، باب: قوله تعالى: ﴿أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾

میں، اور امام مسلم نے کتاب التوبة، باب: قبول توبة القاتل... الخ میں نکالا ہے۔

(۴۹) اسے امام بخاری نے کتاب الرقاق، باب: من هم بحسنة أو سيئة میں، اور امام مسلم نے کتاب

الإیمان، باب: الإسرائاء بالنبي إلی السموات میں نکالا ہے۔

(۵۰) اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب: عرض مقعد

الميت من الجنة أو النار عليه میں روایت کیا ہے۔

(۵۱) اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں ج ۴، ص ۲۸۷ پر، امام ابو داؤدؒ نے کتاب السنۃ، باب: المسألة فی عذاب القبر، میں، ہیثمی نے مجمع الزوائد ج ۳ ص ۵۰، ۴۹ اور البیہقیؒ نے الحلیۃ ج ۸، ص ۱۰ پر، اور ابن ابی شیبہؒ نے المصنف میں ج ۳، ص ۳۷ پر، اور لا جرئیؒ نے الشریعۃ میں ص ۳۲۷ پر، اور ہیثمی کہتے ہیں: کہ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے اور اس کے رواۃ صحیح کے راوی ہیں۔

(۵۲) ص ۱۰۳ پر ملاحظہ کیجئے۔

(۵۳) اسے امام بخاریؒ نے کتاب الوضوء، باب: من الكبائر أن لا یستبرأ من بولہ اور اسے امام مسلمؒ نے کتاب الطہارۃ، باب: الدلیل علی نجاسة البول ووجوب الاسبراء منه میں روایت کیا ہے۔

(۵۴) اسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح مسلم میں کتاب القدر، باب: ذکر حجاج آدم وموسیٰ علیہما السلام میں روایت کیا ہے۔

(۵۵) سورۃ البیل نیز اسے امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں روایت کیا ہے۔

(۵۶) اسے امام مسلمؒ نے کتاب القدر، باب: کیفیۃ خلق آدمی میں روایت کیا ہے۔

(۵۷) اسے امام مسلمؒ نے، کتاب الزہد والرفاق، باب: المؤمن امرہ کلہ خیر میں روایت کیا ہے۔

(۵۸) اسے امام بخاریؒ نے کتاب الجہاد، باب: فضل من حمل متاع صاحبہ اور امام مسلمؒ نے کتاب الزکاة، باب: بیان أن اسم الصدقة يقع فی کل نوع من المعروف میں نکالا ہے۔

(۵۹) اس روایت کو امام مسلمؒ نے کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام میں روایت کیا ہے اور غالباً اس کی شرح پہلے گزر چکی ہے۔ مجموع الفتاویٰ والرسائل ۱۳۳۳ میں بھی ہم نے اس کی شرح کی ہے۔

(۶۰) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے، کتاب بدء الخلق، باب: ذکر الملائکہ، میں اور امام مسلمؒ نے کتاب الایمان، باب: الإسراء برسول اللہ ﷺ وفرض الصلوات میں نکالا ہے۔

(۶۱) اس حدیث کو امام بخاریؒ نے کتاب فضائل الصحابة، باب: مناقب المهاجرين وفضلهم میں اور امام مسلمؒ نے کتاب فضائل الصحابة، باب: فضائل أبی بکر الصديق میں نکالا ہے۔

(۶۲) اس حدیث کو امام ابو داؤدؒ نے کتاب الجہاد، باب: فی الهجرة هل انقطعت میں اور امام احمدؒ

نے المسند ج ۱ ص ۱۹۲، میں اور امام الدارمی نے سنن الدارمی کتاب السیر، باب: أن الهجرة لا تنقطع میں اور امام البیہقی نے مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۵۰ میں نکالا ہے اور کہا ہے: کہ امام ابوداؤد اور امام نسائی نے حضرت معاویہؓ کی حدیث کا کچھ حصہ روایت کیا ہے، اور امام احمد اور الطبرانی نے الأوسط اور الصغیر میں، اس حدیث کو ابن السعدی کے علاوہ، طریق سے روایت کیا ہے، اور اس حدیث کے سلسلے میں امام احمدؒ کے راوی ثقہ ہیں۔“

(۶۳) اسے امام بخاریؒ نے کتاب الأدب، باب: علامة حب الله عز وجل، میں، اور امام مسلمؒ نے کتاب الصلوة اور باب: المرء مع من أحب میں روایت کیا ہے۔

(۶۴) اس کو امام بخاریؒ نے کتاب الأنبياء، باب: ما ذكر عن بني إسرائيل میں روایت کیا ہے۔

(۶۵) صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوة الأحزاب

(۶۶) اس حدیث کو امام ابوداؤد نے کتاب الجہاد، باب: الاقامة بأرض المشركين میں روایت کیا ہے۔

(۶۷) اس حدیث کو امام ابوداؤد نے کتاب الجہاد، باب: النهي عن قتل من اعتصم بالسجود میں، اور امام ترمذیؒ نے کتاب السیر، باب: ما جاء في كراهية المقام بين أظهر المشركين میں نکالا ہے۔

(۶۸) اسے امام بخاریؒ نے، کتاب المساجد، باب: الخوخة والممر في المسجد میں نکالا ہے۔

(۶۹) اسے بھی امام بخاریؒ نے کتاب المغازی، باب: مرض النبي ﷺ ووفاته میں نکالا ہے۔

(۷۰) اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند ج ۵ ص ۱۲۳، پر نکالا ہے۔

(۷۱) اسے امام مسلمؒ نے کتاب الطہارۃ، باب: الاستطابة میں نکالا ہے۔

(۷۲) اسے امام بخاریؒ نے کتاب التوحید، باب: كلام الله مع الأنبياء يوم القيامة میں اور امام

مسلمؒ نے کتاب الإیمان، باب: أدنى أهل الجنة منزلة میں اسے روایت کیا ہے۔

(۷۳) اسے امام ابوہنبلہ ترمذیؒ نے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے، دیکھئے کتاب التفسیر، سورة التوبة

ج ۵ ص ۲۶۲

(۷۴) مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۱، جامع ترمذی ج ۵ ص ۱۳، نمبر ۲۶۱۶، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۳۹۴، نمبر ۳۹۷۳